

حیاتِ عثمانی

رئیس شاہ

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہؒ کے ازبانیانِ پاکستان کی حیاتِ طیبہ جس میں آپ کے حالاتِ زندگی اور علمی اور عملی کارناموں پر ازپیدائش تا وفات مفصل بحث کی گئی ہے اور روشنی ڈالی گئی ہے جو اہل علم کے لئے سامانِ بصیرت اور بصارت ہے۔

تالیف

پروفیسر محمد نواز حسن شیر کوٹی

مکتبہ نوری دارالعلوم کراچی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حیاتِ عثمانی

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ فرمائیے از زبانِ پاکستان
کی حیاتِ طیبہ جس میں آپ کے حالاتِ زندگی اور علمی و عمل
کارناموں پر از پیدائش تا وفات، مفصل بحث کی گئی ہے
اور روشنی ڈالی گئی ہے جو اہل علم کے لئے سامانِ بصیرت و بصارت ہے

تألیف
پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی

ناشر
مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۲

حیات عثمانی

سوانح حیات حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی

تصنیف: پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی

کتابت: حسین احمد نجیب

ترتیب: مولانا اشفاق احمد قاسمی گیاروی

طباعت: مشہور آفٹ پریس کراچی

طبع: اول شوال الحرم ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت:

بمشر

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۲

بہتمام:

فَارُوقُ لِقَاءِ سَمِیْعِی

فاضل دیوبند - ایم اے (عربی)

میلے کے پتے

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۲

ادارہ اسلامیات، ۱۹، انارکلی لاہور

دارالامانت، مولوی مسافر خانہ کراچی ۱۲

ادارۃ المعارف، ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی ۱۲

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳	خاندان	۱۷	پیش لفظ مولانا محمد تقی عثمانی
"	شجرہ نسب	۲۰	پیش لفظ
۳۵	شجرہ زیریں	۲۱	مکتوبات عثمانی بنام انوار عثمانی
۳۷	مفتی عزیر الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ	"	خطبات عثمانی
۴۱	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب	۲۲	حیات عثمانی
"	سابقہ مہتمم دارالعلوم (دیوبند)	۲۳	تجلیات پر تبصرے
۴۲	علامہ کی پیدائش	"	فخر العلماء مولانا عبدالماجد دریا آبادی
۴۴	تاریخ دیوبند	۲۴	کا تبصرہ
"	محل وقوع	"	ماہر القادری کا تجلیات پر تبصرہ
۴۶	طرز آبادی	"	مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تجلیات
"	دیوبند کو کس نے اور کب آباد کیا؟	۲۵	کے متعلق رائے
۵۵	عہد تعلیم	"	مولانا عہد الدین صاحب کی تجلیات
"	بسم اللہ	"	پر خامہ فرسائی
۵۶	دارالعلوم میں داخلہ	۲۹	حیات عثمانی
"	نقشہ تعلیم سال بسال علامہ عثمانی	"	پیدائش اور نام نامی
"	والہ محو	"	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۵	دارالتفسیر	۵۸	آغاز تعلیم عربی
"	دور جدید	۵۹	نقشہ تعلیم عربی از ۱۳۱۸ھ تا ۱۳۳۵ھ ۶۱۴-۸
۸۶	باب الظاہر	۶۰	تجربہ علوم و فنون
"	دار القرآن	۶۱	ہم سبقوں کی کلاس میں سب سے اول
۸۷	علامہ عثمانی کی شادی خانہ آبادی	"	عہد طالب علمی میں سلسلہ درس و تدریس
۸۸	بے اولادی	۶۲	دن بیت گئے
۹۰	مولانا محمد سحیح صاحب	۶۸	برسر مطلب
"	تعمیر مکان جدید	۶۹	استاذہ
۹۱	سلسلہ درس و تدریس	۷۱	شیخ الحدیث ۱۸۵۳ھ سے ۱۹۳۱ء تک
"	سلسلہ تدریس ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم	۷۲	حکیم محمد حسن صاحب
"	دیوبندی	۷۳	مولانا محمد حسین صاحب شیرکوٹی
"	مولانا محمد ابراہیم بلیادی استاذ	۷۴	مولانا غلام رسول صاحب
"	معقول و منقول کی آمد	۷۶	مولانا سید رفیع الحسن صاحب دیوبند
۹۲	مدرسہ فتح پوری دہلی کی صدارت ۱۳۳۶ھ	۷۷	مولانا حافظ محمد صاحب
"	علامہ سید دارالعلوم دیوبند میں	۷۸	تعارف دارالعلوم
۹۳	۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۱ء	۷۹	علامہ کی مادر علمی دارالعلوم دیوبند
"	دارالعلوم کی فضا	۸۰	دارالعلوم کی روز افزوں ترقی
۹۴	والہی پر	"	سنگ بنیاد
۹۷	جامع علوم و فنون	۸۲	مسجد دارالعلوم
۹۹	جمعۃ الانصار ۲۷ رمضان ۱۳۴۷ھ	۸۳	دارالحدیث

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۵	مولانا عبید اللہ کا نظریہ جملہ تبلیغ		جمعیت الانصار میں حضرت عثمانی کی
۱۳۷	علامہ تقریر شیخ الہند	۱۰۳	شاذار خدمات
۱۴۱	محکمہ	۱۰۴	دیوبند میں آمد
"	جمعیت الانصار کے ثمرات	۱۰۵	شعبہ تکمیل التعليم کا افتتاح
۱۴۲	آدم برسر مطلب	"	موتمر الانصار مراد آباد
۱۴۳	دارالعلوم کی خدمات جلیلہ	۱۰۷	کراچی میں علامہ عثمانی کا آریوں سے مناظرہ
۱۴۴	دارالحدیث دارالعلوم دیوبند ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء	۱۰۸	موتمر الانصار میرٹھ
"	دارالحدیث دیوبند پر حضور پرورد کی توجہ	۱۱۱	جمعیت الانصار کا علمی جلسہ شملہ میں
	بنیاد دارالحدیث دیوبند ۲۰	۱۱۳	شملہ میں جمعیت الانصار کا ایک اور جلسہ
	ربیع الاول ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۲ء بیت	۱۱۵	جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان پیڑھا
۱۴۷	مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ	"	مولانا سندھی کی کہانی خود انکی زبانی
	دارالحدیث کے لئے علامہ عثمانی کا	۱۱۷	ریشی خطوط کی سازش یا تحریک
"	سفر خوجہ	۱۱۸	رولٹ ایکٹ کا تجزیہ
۱۴۹	تعمیر دارالطلبہ	۱۱۹	شیخ الہند کی اسکیم
	مضمون حضرت الاستاذ مولانا	۱۲۰	جمعیت الانصار کا انجام
	شیر احمد عثمانی صاحب مدرس	۱۲۱	مسلمانوں کا جمعیت الانصار سے تعلق
۱۵۵	دارالعلوم دیوبند	۱۲۷	تجزیہ بیان از مولف انوار الحسن
۱۵۶	تعمیر دارالطلبہ جدید	۱۳۰	دارالعلوم دیوبند کا ذکر پارلیمنٹ میں
۱۵۷	وکیل دارالعلوم دیوبند	۱۳۳	اختلاف نظریات
۱۶۰	معترض مولانا ابوالکلام آزاد	۱۳۵	علامہ عثمانی اور مولانا سندھی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۲	الشہاب	۱۶۳	دوسرے اعتراض کا جواب از علامہ عثمانی
۱۸۳	تفسیر عثمانی	۱۶۷	تیسرے اعتراض کا جواب
"	فتح الملہم	۱۶۸	امرجہارم
"	لطائف الحدیث اور معارف القرآن	۱۷۱	محکمہ
۱۸۴	القاسم کی قلمی خدمات		دارالعلوم کی مالی اہانت اور علامہ عثمانی
"	دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں	۱۷۳	سفر ڈھاکہ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ
"	القاسم کے پرچے		ڈھاکہ میں نواب سلیم الشہ کے یہاں علامہ
۱۸۵	الحاصل	۱۷۵	شیر احمد عثمانی کی تقریر
"	مدرسہ عربیہ فتحپوری دہلی	۱۷۷	دارالعلوم کا دائرۃ المعارف
"	انتخواہ	۱۷۸	علامہ عثمانی کی کلکتہ میں نصاب تعلیم پر تقریر
۱۸۶	بلا انتخواہ	۱۷۹	دفاع اسلام
۱۸۷	علامہ عثمانی بلا انتخواہ بحیثیت صدر مہتمم	۱۸۰	میدان تحریر میں
"	شرح مسلم کے مشاغل	"	تصنیفات اور رسالے
۱۸۸	مکان وزمین دیکر حج بیت اللہ کیا	۱۸۱	مضامین اور مقالے
۱۸۹	حج سے واپسی	"	تقریریں اور خطبے
"	ظاہر و باطن کی یکسانیت اور اخلاق حمیدہ	"	جائزہ
۱۹۰	بزرگوں کا ادب	"	تصنیفات
"	اظہار جذبات	"	الاسلام
۱۹۲	قلبی استغناء اور کیفیت ناز	۱۸۲	العقل والنقل
۱۹۳	حیثم دید حالات	"	اعجاز العسکران

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱۲	۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک	۱۹۴	علامہ کے دوست مولانا عواد الدین انصاری
۲۱۳	تحریک خلافت کا ہند میں ۱۹۲۸ء		حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، اور
	میں خاتمہ	"	مولانا عبدالسمیع صاحب
۲۱۴	ہندو مسلم اتحاد، شرمی کے باعث خاتمہ	۱۹۶	عوض دکاندار کی فیر سنی
۲۱۵	جمعیتہ العلماء میں علامہ عثمانی کی خدمات	۱۹۸	حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب
"	عدم تعاون کا فتویٰ	"	مولانا سید تقی حسن صاحب چاندپوری
"	حجاز میں موتمر اسلامی	۲۰۱	علامہ عثمانی اور سیاسیات
	علامہ عثمانی جمعیت کے اجلاس سوم	۲۰۲	بلال احمد اور عثمانی
۲۱۷	میں اور سبٹی کے کن کی حیثیت میں	۲۰۳	شیخ الہند کی مالٹا سے واپسی اور علامہ
	حضرت عثمانی جمعیت کے چوتھے سالانہ		عثمانی کا ان کی محبت میں سیاسی دولہ
۲۱۹	اجلاس گیا میں	"	تحریک خلافت اور فتویٰ ترک موالات
	علامہ عثمانی مجلس منتظمہ کے اجلاس	"	شیخ الہند مولانا محمود حسن کی نظر میں علامہ
"	منعقدہ دہلی میں		عثمانی کے فتویٰ کی پسندیدگی
	علامہ شبیر احمد جمعیتہ العلماء کے پانچویں	۲۰۷	جمعیتہ العلماء ہند ۱۹۱۹ء
۲۲۰	سالانہ اجلاس بمقام کوئٹہ ڈا میں		شیخ الہند کا علامہ عثمانی پر علمی اور
"	ایک اور مجلس منتظمہ کے اجلاس دہلی میں	۲۰۸	تحریری و تقریری اعتماد
	علامہ مجلس منتظمہ کے اجلاس بمقام	۲۰۹	افتتاح جامعہ ملیہ
۲۲۱	مراد آباد میں	۲۱۰	مشاہدات راقم الحروف
	حضرت عثمانی اجلاس مجلس عامہ جمعیتہ	۲۱۱	مولانا مدنی کی گرفتاری رد عمل
۲۲۲	برمکان حکیم اجل خاں دہلی میں	۲۱۲	جمعیتہ العلماء ہند دہلی کی مجلس علم کے کن علامہ عثمانی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۲	خطابت جمعہ	۲۲۲	علامہ کا تذکرہ سالانہ اجلاس ہجرت
	جمعہ کے بعد مستم مولانا حبیب الرحمن		جمعیت منعقدہ کلکتہ میں
	کی کوٹھی میں اجتماع اور علامہ عثمانی		علامہ عثمانی کی یا مجلس مرکزی جمعیت
۲۳۵	کی تقریر	۲۲۳	علامہ ہند منعقدہ دہلی میں
	شیخ الہند کے مکان پر ہر ہفتہ بعد		آٹھواں سالانہ اجلاس جمعیت علمائے
"	نماز جمعہ درس قرآن	۲۲۴	ہند اور علامہ عثمانی
"	علامہ عثمانی سے ایک ہند جوگی کا خطاب	۲۲۸	سچہ دار العلوم کی طرف
۲۳۶	سفر حجاز	"	تصفیہ عقائد و مسائل
"	موترمک میں شرکت	"	خطبہ جمعہ عربی میں
۲۳۸	علامہ کی ڈائری	"	ایک اور اہم مسئلہ ! کیا حق بات
	حجاز کے لئے مئی ۱۹۲۷ء میں دلیونہد	۲۲۹	ایک ہی ہوتی ہے ؟
۲۳۹	سے دہلی	۲۳۰	آیت موم پر محققانہ تفسیر
"	۱۲ مئی ۱۹۲۷ء کو بمبئی میں عظیم الشان جلسہ	"	دارالعلوم میں معزز مہمانوں کی آمد
۲۴۰	حجاز کو روانگی اور ورود	۲۳۱	مولانا مدنی کی کراچی سے رٹائی
"	آغاز موترا اور علامہ کی تقریریں	۲۳۲	مولانا شیردانی اور حضرت عثمانی
	امیر ابن سعود سے ملاقات اور علاقہ	"	مرشدین کی دارالعلوم میں آمد اور
۲۴۱	کی پہلی تقریر	"	تقریر، علامہ کی جوابی تقریر
"	حق گوئی و مہیا کی	"	جمعیتہ الطالبہ اور علامہ عثمانی
	علامہ کا، عقیقہ کی طرف سوتی گئی پر گریہ		مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی علامہ
۲۴۳	اور سید سلیمان کی طرف سے تحسین	۲۴۳	کی زیر تربیت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۶	غریب خلع پر چائے پارٹی	۲۳۳	سلطان اور مولانا کفایت اللہ صاحب
۲۶۷	تبلیغی کارنامے		کی تقریر
۲۶۸	مقامات تقریر		علامہ عثمانی کی شاہ کے سامنے ایک
	انجمن خدام الدین لاہور میں علامہ		اور تقریر
۲۶۹	عثمانی کی تقریر	۲۳۵	نجدی جنلی میں
	حیدر آباد کن میں علامہ عثمانی کی	۲۳۶	علامہ عثمانی کا عینا کا نہ اظہار خیال
۲۷۰	تقریریں	۲۳۷	مجادلہ پر اظہار خیال
	علامہ عثمانی کی حق گوئیہ میر آبادی تقریر		قاضی القضاۃ علیہد کی ایک مجلس میں
۲۷۱	درستہ البنات جالندھر میں علامہ		علامہ کی موٹگافیاں
	عثمانی کی تقریر	۲۵۰	جائزہ
۲۷۱	خیر المدارس جالندھر میں علامہ کی تقریر	۲۵۹	مولوی دیدار علی کی سنگدلانہ فتویٰ بازی
	علامہ عثمانی کی ڈھاکے میں نواب	۲۶۰	تقریر کا جائزہ
۲۷۲	سلیم اللہ کے یہاں ایک حکیمانہ تقریر		درنیہ منورہ
	علامہ عثمانی کی قادیانیوں کے خلاف مساعی	۲۶۱	علامہ کی حجاز سے ہند کو روانگی
۲۷۳	قادیانیت کے استیصال میں پنجاب		والہی پر جو سامان ساتھ تھا
۲۷۳	اور سرحد کا دورہ		مراجعت ہند
	انجمن ضیاء الاسلام کراچی کے ماتحت		علامہ عثمانی کا دیوبند میں زبردست
	آرلوں اور علامہ عثمانی کا مناظرہ	۲۶۲	استقبال
۲۷۴	آگرہ کے نواح میں شرمی اور سنگھٹن	۲۶۳	شیر کوٹ میں آمد
۲۷۴	شرمی تحریک کا پس منظر	۲۶۴	خیر مقدم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸۵	تفسیر فارسی از شاہ عبدالعزیز صاحب	۲۷۵	ملکانوں کو آریوں نے کس طرح بہکایا
"	ترجمہ اردو از شاہ عبدالقادر	۲۷۶	علامہ پھر پوری
"	شاہ رفیع الدین	"	تفصیل مدارس اگرہ
۲۸۶	پہلا موازنہ	"	تفصیل ضلع میں پوری وریشہ
"	سرسید کی تفسیر	۲۷۷	دوبارہ قبول اسلام
"	علامہ عثمانی کی تفسیر	"	ہندوؤں کا مسلمان ہونا
۲۸۸	تنقید	"	مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا دورہ اور
۲۹۰	دوسرا موازنہ	"	۲۷ مئی ۱۹۲۲ء کو اگرہ میں زیر دست تقریر
۲۹۱	آیات مذکورہ کے متعلق سرسید کی تفسیر	"	جمعۃ العلماء لاہور کے جلسے میں علامہ
"	علامہ عثمانی کی تفسیر	۲۷۸	عثمانی کی محرکہ الآراء تقریر
۲۹۵	ادبی تنقید	۲۷۹	سلسلہ ہائے تقاریر خوجہ بلنہ شہر اور بڑھانہ
۲۹۶	سرسید کی تفسیر پر معنوی تنقید	"	۱۳۲۹ھ میں علامہ عثمانی کی دوسری تقریر
۲۹۷	علامہ عثمانی پر ادبی تنقید	۲۸۱	بلنہ شہر میں
"	معنوی تنقید	۲۸۲	علامہ عثمانی اور تبلیغ عام کا حق
۲۹۸	تیسرا موازنہ	"	فیض عثمانی کی ہمیشہ فراوانی
"	سرسید	"	آسمان علم و فضل پر آفتاب عثمانی کی
"	علامہ عثمانی	"	ضیاء باریاں
۲۹۹	سرسید پر ادبی تنقید	۲۸۳	مقام علم
"	معنویت	۲۸۵	قرآن کریم کے اردو اور فارسی میں ترجمے
۳۰۰	مولانا ندیم احمد اور مولانا شبیر احمد عثمانی	"	ترجمہ فارسی از شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳۷	از علامہ شبلی	۳۰۵	پہلا موازنہ
۳۳۸	از علامہ عثمانی	۳۰۶	ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی کی تفسیر
۳۳۹	ترجمہ عبارت امام غزالیؒ از علامہ شبلی	"	علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر
۳۴۰	از علامہ عثمانی	۳۱۰	دوسرا موازنہ
۳۴۲	ابوالکلام اور علامہ عثمانی	"	ڈاکٹر نذیر احمد
۳۴۵	دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء	"	علامہ شبیر احمد
۳۴۶	مولانا ابوالکلام آزادؒ	۳۱۳	تنقید
"	شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ	۳۱۴	معنوی توازن
۳۵۶	علامہ عثمانی	۳۱۵	تیسرا موازنہ
۳۵۸	مولانا ابوالکلام ، علامہ عثمانی	۳۱۶	تفسیر نذیری
۳۶۰	مولانا ابوالکلام	"	تفسیر شبیری
"	تبصرہ	۳۱۹	ادبیت
"	ادبی تنقید	"	معنویت
"	معنویت	۳۲۱	علامہ شبلی اور علامہ عثمانی
۳۶۱	علامہ عثمانی	۳۲۳	وجود باری تعالیٰ
۳۶۲	مولانا ابوالکلام ، علامہ عثمانی	۳۲۶	علامہ شبلی - علامہ عثمانی
۳۶۶	غیب کا شہود بنادینے والا	"	مسئلہ توحید
۳۶۸	مشاہدات ریاض	۳۲۷	علامہ شبلی ، علامہ عثمانی
"	علامہ شبیر احمد صاحب اور مسئلہ تقدیر	۳۲۸	اثبات نبوت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم
"	پر معرکہ الآراء تقریریں	"	علامہ شبلی ، علامہ عثمانی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۸۱	قینوں کی ممبری کی تجویز مسترد	۳۶۹	بغداد اور دمشق کے طریقہ تعلیم اور وجود
۳۸۲	دلوں میں گرہیں پڑ گئیں	۳۶۹	جدید طریق تعلیم میں فرق پر تقریریں
	ناقد ری انجائے روزگار	۵	فصاحت و بلاغت قرآن پر تقریر
	شعبان ۱۳۲۲ھ	۳۷۰	مقام دارالعلوم اور دیگر مدارس
۳۸۳	شعبان ۱۳۲۵ھ تک		علامہ عثمانی کی دارالعلوم میں وفد مجاہد
	شعبان ۱۳۲۵ھ کو شاہ صاحب	۳۷۱	ازہر کی آمد پر عربی میں تقریر
۳۸۴	کی مسجد دارالعلوم میں تقریر		لانگے خاں کے باغ میں ملتان شہر
	شعبان ۱۳۲۵ھ کو شاہ صاحب	"	میں تقریر
"	کی مسجد میں دوسری تقریر		علامہ کی صدارت میں تحفہ اصلاح اللسان
"	فتنہ باغ آسارام پنڈت ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ	"	کا قیام ۱۳۲۶ھ
۳۸۵	دارالعلوم دیوبند میں اسٹرائٹنگ	۳۷۲	علامہ اپنے زمانے کے غزالی اور رازی تھے
۳۸۸	شوال ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء	۳۷۳	مشاہدات راقم الحروف
۳۹۰	ڈیجیٹل کورواگی شوال ۱۳۲۶ھ کے بعد		دارالعلوم دیوبند میں علامہ شبیر احمد
"	تقدیر ریائی کا تدبیر انسانی پر غلبہ	۳۷۵	عثمانی کی طرف سے بعض اصلاحات کا مشورہ
"	حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی آمد		مجلس شوریٰ کے اجلاس ۱۳۲۵ھ میں
"	الحاصل	"	علامہ عثمانی کی اصلاحات کی پیشکش
	علامہ عثمانی حیدر آباد دکن میں	۳۷۹	تفصیلات مذکورہ پراجہ ملی نظر
	علامہ عثمانی کی نظام دکن سے ایک		مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس
۳۹۵	خاص ملاقات	۳۸۰	۲۵ شوال ۱۳۲۵ھ ۲۸ اپریل ۱۹۲۷ء
"	حیدر آباد دکن کا دوسرا سفر ۱۳۲۶ھ ۱۹۴۸ء	"	مجلس شوریٰ کا جلسہ تہانہ بھون میں

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۹۶	خط حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی	۳۹۶	علامہ عثمانی سے کراچی میں میری ملاقات
۴۰۹	جواب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی	۳۹۷	اصلاح فتنہ شیعہ کوئی صاحبان
۴۱۵	تخصیر	۳۹۷	مدرسہ نظامیہ حیدر آباد دکن کی فہرست
۴۱۵	حضرت شیخ الاسلام مدنی	۳۹۸	دارالعلوم دیوبند اور نظام دکن کی امداد
۴۱۶	علامہ عثمانی	۳۹۹	علامہ شبیر احمد عثمانی کی تقریر
۴۲۰	علامہ عثمانی بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۳۵۳ھ تا ۱۳۶۲ھ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۲ء	۴۰۰	بھارت کا حیدر آباد پر حملہ اور علامہ عثمانی کا اضطراب
۴۲۲	دارالعلوم دیوبند میں علامہ عثمانی کا پُر تپاک اور پُر جوش خیر مقدم	۴۰۱	ڈاھیل میں ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۵۳ھ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۵ء
۴۲۳	دارالعلوم دیوبند میں نزولِ رحمت برکت	۴۰۲	جامعہ ڈاھیل کا تاریخی پس منظر
۴۲۴	جذباتِ عاقل	۴۰۳	ڈاھیل میں جائے قیام اور اخراجات
۴۲۶	حضرت مولانا مدنی اور شیرینی	۴۰۴	حضرت شاہ صاحب کا انتقال ۱۳۵۲ھ
۴۲۷	طلبہ کی طرف سے استقبال	۴۰۵	سلسلہ تقاریر
۴۲۸	طلبہ کے استقبال میں علامہ عثمانی کی تقریر	۴۰۶	تفسیر قرآن و شرحِ مُسلم
۴۲۹	۱۳۶۱ھ میں ڈاھیل سے بلا استقلال	۴۰۷	علامہ عثمانی کی یاد دیوبند میں
۴۳۰	دیوبند میں	۴۰۸	پھر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مہتمم
۴۳۱	شعبہ تنظیم و ترقی ۱۳۵۵ھ تا ۱۹۳۹ء	۴۰۹	خواجہ فیروز الدین کوہر تھلوی کا بیان
۴۳۲	اعلیٰ مقاصد	۴۱۰	حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا بیان
۴۳۳	انشائیں سے دارالعلوم کو اجازت ملے	۴۱۱	سرگوشیاں
۴۳۴	تنظیمِ انبیا کرام دارالعلوم دیوبند ۱۳۵۸ھ تا ۱۹۳۹ء	۴۱۲	مکتوبہ گرامشیخ الاسلام مولانا حسین احمد

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا سیاسی تصور	۴۳۱	اردو زبان کی ترقی اور علامہ عثمانی
۴۵۰	اور مسلم لیگ سے اختلاف	۴۳۲	مولانا عثمانی کی اہم تجویز
	دارالعلوم دیوبند کے خلاف پروپیگنڈا	۴۳۳	دارالعلوم میں وفود کی آمد اور عثمانی
"	اور علامہ عثمانی کا دفاع	۴۳۳	وفد بدراس
۴۵۱	حق و صداقت کی راہ		علامہ عثمانی کے عہدہ صدارت کے تحت
"	مولانا عثمانی صاحب کا مکتوب گرامی	"	دارالعلوم کی سیاسی فضا
	دارالعلوم دیوبند اور مولانا حسین احمد	"	جائزہ
۴۵۵	مکتوب علامہ عثمانی بنام مدیر طلوع اسلام	۴۳۵	علامہ عثمانی کی پالیسی دارالعلوم میں
۴۵۷	ایک شبہ اداس کا ازالہ	۴۳۷	تبصرہ
۴۵۸	علامہ کا دیوبند میں مستقل قیام	۴۳۹	دوہ خلافت اور جدو کا انگریزوں میں فرق
"	خدا خیر کرے		حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا
۴۶۰	دارالعلوم میں درس قرآن	"	عثمانی کا تعاون
"	علامہ عثمانی کے نام ایک گمنام خط		حضرت مولانا تھانویؒ کا سرپرستی
	حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی گرفتاری	۴۴۱	دارالعلوم سے استعفاء
۴۶۱	۱۳۹۱ھ ۱۹۷۲ء	۴۴۲	مکتوب عثمانی بنام حضرت تھانویؒ
	دارالعلوم میں گرفتاری کا رد عمل اور	۴۴۳	مکتوب تھانویؒ بحوالہ علامہ عثمانیؒ
۴۶۳	علامہ عثمانی کی تقریر	۴۴۶	تبصرہ
۴۶۴	دارالعلوم میں جلسہ علامہ عثمانی کی صدارت	۴۴۷	دارالعلوم دیوبند اور کانگریس
"	سول نافرمانی اور اس کے دیگر مسائل	۴۴۸	دارالعلوم دیوبند کا سیاسی مسک

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۸۲	مسلم لیگ میں شرکت سیاست	۴۶۷	طلبہ کا اخراج
"	عثمانی کا چوتھا دور	۴۶۸	صدر مہتمم کا فیصلہ اور رد عمل
"	مسلم لیگ		علامہ عثمانی کا صدارت اہتمام سے منتظر
۴۸۳	جمعیتہ العلمائے اسلام کلکتہ کا شاندار اجلاس اور علامہ عثمانی کا پیغام اکتوبر ۱۹۳۵ء	۴۶۹	ادارہ دارالعلوم سے خود علیحدگی کے اسباب
۴۸۵	دو قومی نظریہ	۴۷۳	آل انجمن شوری دارالعلوم دیوبند
"	مسلم لیگ میں شریعت اور سیاست کی		علامہ کی عالی ظرفی
"	کی رو سے تائید		کانگریس سے مولانا عثمانی کی نفرت
۴۸۶	پاکستان کے حصول کی ضرورت	"	دارالعلوم سے جدائی کا باعث بنی
	ہندوستان کے طول و عرض میں پیغام		اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے
۴۸۷	کا اثر	۴۷۴	شعبان ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم سے جدائی
۴۸۹	مسلم لیگ کو دوڑ دینا چاہئے		پھر جامعہ ڈابھیل کی صدارت
۴۹۰	علامہ عثمانی کے بیانات کا ملکہ میں اثر		ربیع الاول ۱۳۶۲ھ جنوری ۱۹۴۲ء سے
۴۹۱	لیگی اور کانگریسی مسلمانوں کا قارو لا	۴۷۵	شعبان ۱۳۶۳ھ تک ڈابھیل میں
	کل جمعیتہ العلمائے اسلام ہند کی صدارت	۴۷۶	علامہ کو وجہ مفاصل کا مرض
۴۹۳	کاسہرا علامہ عثمانی کے سر		میر عثمان علی خان نظام حیدر آباد دکن کی
۴۹۵	جمعیتہ علماء اسلام کی تحریک	۴۷۸	مولانا عثمانی کو ملازمت پر لینے کی خواہش
	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی علامہ		راقم الحروف کا دیوبند میں ورود اور علامہ
۴۹۷	شیر احمد صاحب عثمانی کو مبارکباد	۴۷۹	عثمانی سے ملاقات
"	مسلم لیگ کے میدان علامہ کا زبردست قدم	۴۸۱	مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کا حامی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۱۷	جمعیت علمائے ہند سے	۴۹۸	مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں
"	جمعیت احرار سے	۴۹۹	لیاقت علی خان کا ایک عظیم انتخابی محرکہ
۵۲۱	مجددی تلوار	۵۰۴	مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ کی صدارت
	متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ اور تعمیر	۵۰۵	میرٹھ مسلم لیگ کانفرنس کا مقصد
۵۲۲	پاکستان کیلئے علامہ کی دیگر کوششیں	۵۰۶	تلفیق پابندی احکام اسلام
	پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے متعلق	۵۰۸	علامہ میدان عمل میں
	ضلع اعظم گڑھ میں علامہ کی غلطہ انگیز	"	میرٹھ کانفرنس کا اثر
"	تقریر اور پیشین گوئی	"	صوبہ پنجاب جمعیت علمائے اسلام کانفرنس کی صدارت
۵۲۳	علامہ کی صدارتی تقریر بی بی ماچ ۱۹۳۷ء	۵۰۹	ایک اعتراض اور اس کا جواب
۵۲۴	اردو پانک دہلی میں علامہ کی تقریر اپریل ۱۹۳۷ء	۵۱۰	مسئلہ اقلیت اور اس کا جواب
"	کامینہ مشن کی اپریل ۱۹۳۷ء میں آمد	۵۱۱	تجزیہ
"	علامہ شہیر احمد عثمانی کا وفد کو تار		ہندوستان کی حکومت سے کوئی بھلائی
۵۲۵	کانپور کانفرنس کی صدارت	"	کی توقع بے سود ہے۔
"	۲۹ اگست ۱۹۳۹ء کے بعد	۵۱۲	پاکستان پر ہندوستانی مسلمانوں کا حق
	ترتیب حیات عثمانی کا ایک اور	"	مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان
۵۲۶	دور بروز منگل	"	علامہ عثمانی کا جواب
	دہلی کنونشن ۱۹۳۶ء میں علامہ	۵۱۳	تجزیہ
"	عثمانی کی شرکت	۵۱۵	خطبہ لاہور کے بقایا مضامین
۵۲۹	وفات پر تعزیت	۵۱۶	فوجی طاقت
		"	صنعت و تجارت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَاةِ الَّذِينَ اصْطَفَى
شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ اُن بزرگوں
میں سے ہیں جن کی نظیریں ہر دور میں گنی جینی ہو کرتی ہیں۔ ان کے علمی تحقیقی کارنامے
اور ان کی عملی جدوجہد پوری امت مسلمہ کے لئے بالعموم، اور مسلمانانِ برصغیر کے لئے
بالخصوص، ہماری تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بیک وقت
وسیع و عمیق علم، شگفتہ اور سیال قلم، دلنشین خطابت اور ملتِ مسلمہ کے اجتماعی
مسائل میں معتدل اور مدبرانہ فکر سے نوازا تھا، اور اُن کے یہ تمام ملکات
دین کی صحیح خدمت اور امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لئے اس طرح استعمال ہوئے
کہ آج ہم سب کی گردنیں ان کے احسانات سے جھکی ہوئی ہیں۔

تحرکِ پاکستان میں حضرت علامہ عثمانیؒ نے جو سرگرم حصہ لیا، اور جس
کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آزاد مسلم مملکت سے نوازا، اس کے حالات
ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہیں، لیکن اُن کی وفات کے بعد ہم نے انہیں فراموش
کر دیا، وہ ہماری قدرنا شناسی کی بدترین مثال ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگ مولانا انوار الحسن صاحب شیرکوٹی رحمۃ اللہ علیہ
کے درجات بلند فرمائے کہ انہوں نے ناقدری کے اس ماحول میں حضرت
علامہ عثمانیؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر انکی
خدمات کو اجاگر کرنے کا فرض کفایہ بڑی محنت، عرق ریزی اور دلباہانہ محبت

کے ساتھ انجام دیا۔ انہوں نے پہلے ”تجلیات عثمانی“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ کر اس میں حضرت علامہؒ کی علمی خدمات کا مبسوط تعارف کرایا، اور اُن کی تحقیقات پر مفصل تبصرہ کیا۔ پھر انوار عثمانیؒ کے نام سے حضرت علامہؒ کے نادر علمی اور سیاسی مکاتیب اور اُن کے اہم خطبات کا ایک مجموعہ تیار فرمایا۔ یہ دونوں کتابیں مصنفؒ کی حیات ہی میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

اس کے بعد مولانا شیر کوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علامہؒ کی مفصل سوانح حیات ”حیات عثمانی“ کے نام سے لکھنی شروع کی، اور اس میں بڑی نادر معلومات جمع فرمائیں۔ اُن کی اس زیر تالیف کتاب کے کچھ حصے ”البلارغ“ میں بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن ہماری شامت اعمال سے ابھی یہ کتاب مکمل نہیں ہو پائی تھی کہ مولانا انوار الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پیارے ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

انوار الحسن

اُن کی وفات کے بعد میں نے فیصل آباد میں اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر البصائر محسن صاحب بات کی کہ ان کا یہ مسودہ نشہ تکمیل ہونے کے باوجود اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ اس پر فراہم کردہ معلومات کا کسی اور جگہ دستیاب ہونا مشکل ہے۔ میری رائے یہ تھی کہ اس کتاب کو اسی حالت میں شائع کرنا مناسب، بلکہ ضروری ہے، چنانچہ انہوں نے یہ مسودہ ازراہ کرم مکتبہ سوانح العلوم کو عنایت فرما دیا۔ اور اب مکتبہ دارالعلوم اس کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اگرچہ یہ کتاب اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ اس میں حضرت مولاناؒ کی زندگی کے آخری تین سالوں کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن ۱۹۴۶ء تک کے جو حالات مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائے ہیں، وہ بجائے خود بڑے اہم اور مفید ہیں۔ بلکہ حضرت علامہؒ کی سوانح میں اسی دور کے حالات کی جستجو زیادہ مشکل تھی، اب آخری تین سالوں کے حالات کی تکمیل کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ لہذا اُمید ہے کہ

انشاء اللہ یہ کتاب اپنی موجودہ صورت میں بھی نہایت مفید اور آئندہ ہماری تاریخ کے طالب علموں اور محققین کے لئے بہترین رہنما ثابت ہوگی، اور اس سے صرف حضرت علامہ عثمانیؒ کے حالات زندگی معلوم ہوں گے، بلکہ قیام پاکستان سے پہلے مسلمانوں کی بہت سی ایسی تنظیموں اور تحریکات کے بارے میں مستند معلومات بھی حاصل ہو سکیں گی جن کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔

اس وقت اس احساس سے دل مغموم ہے کہ فاضل مصنفؒ کی یہ کتاب اُن کی حیات میں شائع نہ ہو سکی۔ تاہم یہ انشاء اللہ اُن کے لئے ذخیرہ آخرت اور صدقہ جاریہ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ا۔ صاحبِ سوارح کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائیں، اور ہمیں اُن کے فیوض سے مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔ آمین۔

میں جناب مولانا اشفاق احمد صاحب نام کی گواہی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب اور تصحیح کے لئے اپنی قابل قدر کوشش سے اس کتاب کو لائقِ اشاعت بنایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔
وما توفیقی الا باللہ !

محمد نسفی عثمانی
۱۳۷۷ء
خادم طلبہ دارالعلوم کراچی
دارالعلوم کراچی ۱۳۷۷ء
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ النبی الکریم .

پیش لفظ

میں اس خدائے کریم کا بے حد و بے حساب شکر گزار ہوں کہ اس نے حیات عثمانی " سوانح حیات علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف کی توفیق عطا فرمائی اور حق تو یہ ہے کہ اگر وہ جذبہ تسوید و تحریر اور عزم تالیف و تصنیف عطا نہ فرمائے تو اس کے بغیر کوئی بھی کام منظر عام اور منصفہ شہود پر جلوہ گر نہیں ہو سکتا۔ شیخ الاسلام علامہ عثمانی کے یوں تو کہتے ہی لائق و قابل اور عالم و فاضل صاحب قلم شاگرد گزریے اور اب بھی بقید حیات ہیں لیکن راقم الحروف کے دل میں جو ان کا ایک درد رکھ دیا ہے وہ مجھے یہ لکھنے پر مجبور کر رہا ہے کہ قدرت نے یہ قرعہ تسوید میرے نام پر ڈالا تھا جس کو راقم الحروف کا قلم بار امانت کا امین بن کر صفحات قرطاس پر امانت کو ادا کر رہا ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے علامہ عثمانی کی علمی سوانح تجلیات عثمانی ۱۹۵۷ء | سات سو بارہ صفحات پر "تجلیات عثمانی"

کے نام سے میرے قلم سے دسمبر ۱۹۵۷ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی اور اس کی طباعت کا بار منشی عبدالرحمن صاحب مدیر ادارہ نشر المعارف چھلیک ملتان نے اٹھایا۔ یہ کتاب دراصل علامہ کی علمی سوانح ہے جس میں موصوف کے علوم و فنون تفسیر و حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ، علم کلام، اردو، فارسی اور عربی ادب، تقریر و تحریر اور سیاسیات پر مفصل اور مبسوط بحثیں

کی گئی ہیں۔ گویا اگرچہ یہ کتاب پہلے چھپی ہے لیکن اس کو حیات عثمانی جلد اول کے بعد تجلیات عثمانی جلد دوم قرار دیجئے گا تو مناسب ہوگا۔

مکتوبات عثمانی بنام انوار عثمانی ۱۹۶۶ء | کام جو اس راقم الحروف سے

قدرت نے یادہ علامہ کے علمی، فقہی، سیاسی اور نجی مکتوبات کے مجموعہ کی ترتیب تھی۔ جس کو انوار عثمانی مکتوبات علامہ شبیر احمد عثمانی کے نام سے محرم الاحرام ۱۳۸۶ھ یعنی مئی ۱۹۶۶ء تک مرتب کیا گیا اور ۱۹۶۶ء میں ہی جناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی کی سعی مسلسل کے باعث مکتبہ اسلامیہ مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی نے چھپوا کر شائع کیا جو دو سو سا سی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

خطبات عثمانی مارچ ۱۹۶۲ء | مکتوبات عثمانی کے بعد ”خطبات عثمانی“ کی ترتیب پر خیال کیا چنانچہ

ایک سال کی شبانہ روز مساعی سے یہ کام بھی لکھ ۱۹۶۰ء میں مکمل ہوا اور مارچ ۱۹۶۲ء میں پنجاب کے مشہور پبلشر نذر ستر کے ادارے نے اس کو طبع کرا ڈالا۔ دراصل ان خطبات کی طبع کا سہرا شیخ شفیق احمد مالک ادارہ کے سر ہے جو ایک درد مند اور قومی جذبات سے لبریز دل کے مالک ہیں۔ یہ مجموعہ شیخ الاسلام کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ترک موالات، مسلم لیگ، نظریہ پاکستان، استصواب صوبہ سرحد، مکالمۃ الصدرین، پیغام کلکتہ، خطبہ مسلم لیگ، میرٹھ کانفرنس، خطبہ صدارت جمعیتہ العلمائے لاہور، خطبہ صدارت ڈھاکہ، قرارداد مقاصد، خطبہ عید الفطر کراچی، نیز علامہ کے فتوؤں، پیغامات، ارشادات، پاکستان پر معترضین کے جوابات اور خطوط پر مشتمل ہے جس میں اہل پاکستان

کے لئے موجودہ دور میں زندگی جاوید کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ نظریہ پاکستان سے متعلق شیخ الاسلام کے ان خطبوں اور تقریروں، مکالموں اور پیغامات کا یہ مجموعہ ایک جامع مگر مختصر انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں پاکستان کے اطرادِ جوانب، نشیب و فراز اور اس کے منافع اور مضار پر سیر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

راقم الحروف نے ان خطبات کے علاوہ اپنی طرف ہندوپاک کی سوسالہ سیاست، مسلم لیگ اور کانگریس کی آویزش اور کشمکش، پاکستان کے عالم شہود میں آنے، قتل عام ہونے نیز پاکستان میں اسلامی آئین اور دستور سازی، ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ، سقوط مشرقی پاکستان، مشرقی پاکستان میں قتل و خونریزی، آتش زنی اور لوٹ مار، صدر یحییٰ کے زوال اور استعفیٰ نیز مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی مسندِ صدارت پر جلوہ گری، شیخ مجیب الرحمن کی رہائی (اور لندن) روس، دہلی ہوتے ہوئے ڈھاکہ کو روانگی تک کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دئے ہیں۔ بالخصوص دستور سازی پر تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ”خطبات عثمانی“ کا مجموعہ الحمد للہ تاریخ و سیاست کا ایک بہترین مرقع بن گیا ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

”تجلیات عثمانی“ ”مکتوبات عثمانی“ | حیات عثمانی ۱۹۷۲ء ۱۳۹۲ھ اور ”خطبات عثمانی“ کے بعد حیات

عثمانی کی کتابت تیزی سے ہو رہی ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس سال کے آخر میں یا ۱۹۷۳ء کے آغاز میں یہ کتاب بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ہدیہ ناظرین ہوگی۔ اس کتاب کو ”تجلیات عثمانی“ کی پہلی جلد سمجھنا چاہئے کہ اس میں شیخ الاسلام حضرت عثمانی کی پوری زندگی یعنی پیدائش سے وفات تک کے حالات کہیں پوری تفصیل اور کہیں اجمال سے لکھے گئے ہیں۔ اجمال صرف اس جگہ ہے جس کی

تفصیل ” تجلیات “ میں پیش کی جا چکی ہے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر تجلیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

بعض مضامین یا تقریریں یا حالات ان چاروں کتابوں میں مکرر بھی آئے ہیں جن کا تکرار ضرورت سے خالی نہ تھا۔ مثلاً مومتمر مکہ کی فقہی اور علمی و ادبی مجلس تجلیات میں فقر کے ماتحت آنی ضروری تھیں۔ نیز خطبات عثمانی میں بھی ان تقریر کا خطبات کے ضمن آنا لازمی تھا کہ وہ خطبے یا تقریریں ہی تو ہیں جو مومتمر مکہ میں کی گئیں۔ اس لئے بعض مضامین و تقاریر کے مکرر لانے پر معذرت خواہ ہوں۔

بہر حال شیخ الاسلام کی شخصیت پر ان چار متنوع الموضوعات پر جو کچھ کام ناہیر کے ہاتھوں ہوا اس میں راقم الحروف نے علامہ کا کچھ حق ادا کیا ہے اور ان کی ذات پر یہ کام میرے جگر پایے اور دل پایے ہیں جو میں نے شائقین کے لئے پیش کرتے ہیں۔

لحے دہم از دل گذر دہر کہ پیشم

من قاش فروش دل صد پارہ نوشم

اگر غور سے دیکھا جائے تو شیخ الاسلام پاکستان کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ اگر قائد اعظم اور حضرت علامہ اقبال نے پاکستان کا نقشہ بنایا تو اس نقشے میں علامہ عثمانی نے شریعت کا رنگ بھرا ہے۔ اس لئے ان کی زندگی پر ان کتابوں کا سرمایہ پاکستانی قوم اور ملک پاکستان کے لئے ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے ضرورت ہے کہ قائد اعظم، علامہ اقبال اور شیخ الاسلام پر اہل علم نے جو کام کیا ہے اس کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کا جزو بنایا جائے۔

الغرض شیخ الاسلام پر یہ چاروں کتابیں میرے لئے بھی سرمایہ سعادت ہیں اور مسلمانوں کے لئے بھی بالخصوص پاکستان والوں کے لئے۔

تجلیات پر تبصرے | سب سے پہلے کتاب جب ” تجلیات “ شائع ہوئی

تبعہ زد کے لئے اخبارات اور رسائل کے مدیر صاحبان اور اہل قلم کی نظروں کے سامنے آئی تو جناب مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے صدق میں تحریر فرمایا:

فخر العلماء مولانا عبد الماجد دریا آبادی کا تبصرہ :

”آپ کی مدت سے منتظر و مشتاق تھیں کہ علامہ کا مفصل تذکرہ قلمبند کرنے کی سعادت ان کے کسی شاگرد کے حصے میں آئی ہے۔ مقام شکر و مسرت ہے کہ بالآخر یہ سعادت لائل پور اسلامیہ کالج کے ایک استاذ انوار الحسن صاحب شیرکوٹی کے حصے میں آئی اور انہوں نے ایک جامع مرقع علامہ کی پبلک زندگی کا سات سو صفحات میں پیش کر دیا جس کے اندر ان کے علمی، دینی، سیاسی، تدریسی، تصنیفی سبب زندگیوں کے پہلو آ گئے۔ اور شروع کے دو چار صفحات میں بہت ہی اختصار سے ان کی ذاتی زندگی کے سوانح بھی۔ معاصر شخصیتوں اور معاصر تحریکوں کا بھی ذکر آجانا ناگزیر تھا اور اس طرح کتاب ادھر پچیس تیس سال کے اسلامی ہند کی ایک سرسری سی تاریخ بھی ہو گئی ہے۔

یقین ہے کہ مولانا کے ماننے والے ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں میں کتاب کو اچھا لیں گے“ (صدق جدید نکھوتم، نومبر ۱۹۵۸ء)

ناہر القادری صاحب کا تجلیات پر تبصرہ

ناہر اویس و ناقد مولانا ماہر القادری نے اپنے ”فنا ران“ رسالے میں مفصل تبصرہ کیا جس کا بعض حصہ یہ ہے :-

”جناب پروفیسر انوار الحسن انور (شیرکوٹی) نے علامہ عثمانی مرحوم کے علم تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، فلسفہ، منطق، مناظرہ، تقریر، اردو

فارسی، عربی، ادب اور سیاسیات پر بڑی تحقیقات کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔
کتاب کی رنگارنگی اور تنوع کا یہ عالم ہے کہ سات سو سے اوپر ذیلی عنوانات
پر یہ مہسوط تصنیف مشتمل ہے۔

پروفیسر انوار الحسن صاحب نے علامہ عثمانی کی تصانیف کو کھنگال
ڈالا ہے۔ اس بحرِ مواج کے وہ کامیاب شناسا در ہیں۔ انہوں نے اس دریائے
ایک ایک صدف کو جانچا اور اس ”اکیڈمی“ کے ایک ایک صنف کو پڑھا
ہے۔ ”علوم عثمانی“ کے شاید اس دور میں وہ سب سے بڑے محقق اور اسکالر
ہیں۔ (فاران مئی ۱۹۵۸ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تجلیات کے متعلق رائے:

”حضرت (مولانا شبیر احمد) مرحوم کے کمالات علمیہ و ادبیہ کا یہ تذکرہ
(تجلیات عثمانی) سات سو صفحات کی ضخیم کتاب میں تمام ہوا ہے جو بے
شبہ معلومات آفریں بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ اس کے مطالعہ سے
معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے حضرت مرحوم کی تمام چھوٹی بڑی تصانیف
اور مقالات اور تقاریر و خطبات کے فراہم کرنے اور ان کا بالاستیعاب
مطالعہ کرنے اور پھر اپنے خیالات و افکار کو مرتب کرنے میں بڑی محنت و
کادش کی ہے۔ فحشاء اللہ عنا احسن الجناء۔ زبان و بیان شگفتہ،
مؤثر اور دلنشین ہے۔“ (برہان جولائی ۱۹۵۹ء)

حضرت مولانا عطاء الدین صاحب شیرکوٹی رفیقِ خلص علامہ عثمانی کی تجلیات پر خفاہ سائے

”تجلیات عثمانی سچھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جس چیز کے دیکھنے

کی تمنا تھی پوری ہوئی۔ جس محنت اور عرق ریزی سے سیکڑوں کتابوں، رسالوں اور اخبارات سے آپ نے مواد حاصل کیا درحقیقت آپ کے عشق استاد کا پتہ دے رہا ہے۔ آپ نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی میسرخاص کرم فرما دوست کے جس وصف اور کمال پر تصوف کیا اس کا حق ادا کر دیا۔ اس وصف کی پوری تحقیق اور اس کے دلائل و براہین بے پڑھنے والے کو اس صفت میں یا اس علم میں پوری رہنمائی کر دی ہے۔ آپ کے مضامین سطحی نہیں محققانہ ہیں۔ ہر چیز بنیاد و ذہن میں اتار دی ہے پڑھنے والا اس کی کسی بحث کو پڑھتا ہے تو اس میں پوری رہنمائی ہوتی چلی جاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ مضامین وہی ”من جانب الشانقار“ اور حضرت مولانا عثمانی کی زندہ کرامت ہیں۔ آپ نے علامہ کے کمالات کو ہی دائمی بقاء کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنے لئے بھی بقائے دوام کی یادگار بنایا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلجھا ہوا دماغ عطا فرمایا اور قلم میں قوت عطا کی۔

مضمون میں آؤر ذہنیں آئندہ۔ نا محمد اللہ علی احسانہ؟

(مکتوب مولانا عابد الدین رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۸ء)

اگر تجلیات پر تمام تبصروں کو اور ان خطوط کو جو حوصلہ افزائی اور تحسین میں موصول ہوئے یہاں درج کیا جائے تو ایک اچھا خاصہ رسالہ بن سکتا ہے اس لئے تمام کو جگہ دینا مشکل ہے۔ البتہ ایک مکتوب کا کچھ حصہ پیش کرنے کو دل ضرور چاہتا ہے جو مولانا شبیر احمد صاحب مدرس مدرسہ عربیہ قاسم العلوم فیروالی ضلع بہاولنگر نے ارسال فرمایا ہے، لکھتے ہیں:-

”یہ پڑھ کر کہ آپ نے ”سوانح عثمانی“ کی تالیف سے فراغت پائی ہے“

انتہائی مسرت حاصل ہوئی۔ نیز آپ نے جو مشاہیر علمائے دیوبند کے سوانح

لکھنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس سے بھی مجھے بے انتہا ہمت حاصل ہوئی۔
اس کارنامے پر ساری پاکستان میں مجھ سے زیادہ خوش ہونے والا آپ کو کم
ملے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے علمائے دیوبند سے انتہائی عقیدت اور محبت
ہے۔ چونکہ آپ علمائے دیوبند کے سوانح لکھ رہے ہیں اس لئے مجھے آپ سے
سچی عقیدت ہو گئی ہے۔ خصوصاً آپ کی تصنیف ”تجلیات عثمانی“ کا مطالعہ
کرتے ہوئے ایک ایک لفظ سے اس عقیدت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم و قلم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے آپ انہیں خوب
اجاگر کریں۔ آپ کی تحریر میں جو سلاست، فصاحت، بلاغت، شگفتگی،
پختگی زور اور روانی پائی جاتی ہے وہ میں نے بہت کم اہل قلم حضرات
کی تحریروں میں دیکھی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے قلم سے ملک و ملت
کو خوب سیراب کریں۔“ (مکتوب مؤرخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ)

میں ان سب تبصرہ نگاروں اور محبتیں کا شکر گزار ہوں بہر حال اب تک میرے
قلم سے بفضل ایزدی حسب ذیل کتابیں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں :

”تجلیات عثمانی“، انوار قاسمی جلد اول (سوانح بانی دارالعلوم دیوبند) حیات
امداد (سوانح سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) روح رمضان (روزوں
پر جامع اور مبسوط کتاب) سیرت بغیر اعظم، انوار الشہادت تذکرہ شہید کربلا، انوار
عثمانی (یعنی مکتوبات علامہ عثمانی) خطبات عثمانی (حضرت مولانا عثمانی کے سیاسی
خطبات، بیانات، فتووں، پیغامات، مکالمات اور تقریروں کا مجموعہ) ان کے
علاوہ حیات عثمانی، انوار قاسمی جلد دوم، قاسم العلوم فارسی مکتوبات حضرت
مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بعنوان انوار النجوم بھی طبع ہو چکے ہیں۔ البتہ عربی
کے ایک زبردست ادیب مولانا ذوالفقار علی صاحب والد بزرگوار حضرت شیخ الہند

کے سوانح زندگی اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوب
صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے حالات زندگی پر دونوں کتابیں مسودوں کی شکل میں تیار
رکھی ہیں۔ یہ دونوں دیکھئے کب چھپتی ہیں اور کب طبع ہوتی ہیں۔
مردے از غیب بروں آید و کایے بکند
بہر حال حیات عثمانی قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضر ہے۔ صرف دعا
خیر کا طالب ہوں اور اغلاط سے تسامح کا متمنی۔ والسلام
یہ بھی اک زندگی کا کام ہوا
جس سے الوار تیرا نام ہوا

محمد انوار الحسن پروفیسر شیرکوٹی

تحریر دیا چہ مورخہ ۱۷ رجب ۱۳۹۲ھ

بروز پیر ۲۸ اگست ۱۹۷۲ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

حیاتِ عثمانی

پیدائش اور | آپ کی ولادت ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۹ء کو بجنور
نام نامی میں ہوئی جہاں آپ کے والد محترم ان دنوں میں ڈپٹی انسپکٹر
تعلیمات کے عہدے پر سرفراز تھے۔ علامہ نے اپنی تصانیف، مضامین اور
خطوط میں اپنے نام اور نسب کا شبیر احمد عثمانی کے الفاظ سے جا بجا ذکر کیا
ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا نام نامی شبیر احمد ہے اور حضرت
عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آپ کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ لیکن آپ کی
معرکہ آراء تصنیف فتح الملہم شرح مسلم کے ٹائٹل اور آپ کی تفسیر یا فوائد
قرآنی کے اختتام پر اپنے قلم سے تحریر کئے ہوئے الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے
کہ دراصل آپ کے والد محترم نے آپ کا نام فضل اللہ رکھا تھا۔ چنانچہ
فوائد قرآن کریم کے آخر میں لکھتے ہیں :-

”العبد الفقیر فضل اللہ المدعو بہ شبیر احمد

لہ عبد فقیر فضل اللہ المدعو بہ شبیر احمد ابن مولانا فضل الرحمن عثمانی۔ اور میرے والد
نے میرا نام فضل اللہ رکھا تھا اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے :- یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے
عطا کرے اگرچہ دشمن حاسد کو ناگوار گذرے۔ (مصنف)

ابن مولانا فضل الرحمن العثماني . قد كان الى
سمائي فضل الله وكان ينشد

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

ولو كبره الاعداء من كل حاسد

اور اسی طرح کی عبارت فتح الملہم کے ٹائٹل پر ہے لکھتے ہیں :-

فتح الملہم للعبد الفقير الخاطيء الجاني فضل الله

المدعوبه شبير احمد الديوبندي العثماني .

ان عبارتوں سے یہ حقیقت باطل واضح ہو گئی کہ آپ کا اصل نام

فضل اللہ ہے جو آپ کے پدر بزرگوار نے رکھا تھا لیکن شبیر احمد کے نام سے

آپ لوگوں کی زبان پر آتے رہے حتیٰ کہ بہت زیادہ مشہور اور رائج ہو کہ خود بھی

اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرتے تھے ۔ نیز ادنیٰ غور سے باخبر انسان

کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کے والد نے بعض صاحبزادوں کا نام عمر بن الرحمن

جیب الرحمن ، مطلوب الرحمن ، خلیل الرحمن رکھا اور دوسری البیہ کے

لڑکوں میں بعض کا فضل الرحمن کی مناسبت سے فضل حق اور آپ کا فضل اللہ

تجویز فرمایا ۔ لیکن شبیر احمد کے نام سے کس نے پکارا پر وہ گمنامی میں ہے میرا

قیاس ہے کہ چونکہ آپ بروز عشرہ محرم پیدا ہوئے اس لئے حضرت امام

حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یوم شہادت کے باعث ان کے لقب یعنی شبیر

کے نام سے مشہور ہو گئے ۔

لہ فتح الملہم عید فقیر خطا کار گناہگار فضل اللہ المدعوبہ شبیر احمد عثمانی

دیوبندی کی مصنفہ شرح ہے ۔

مذکورہ بالا فوائدِ شہرِ آن اور فتحِ الملہم کی خود نوشتہ تحریریں سوا آپ کے والد کا نام فضل الرحمن اور سلسلہ نسب عثمانی اور وطن کا دیوبند ہونا بھی ثابت ہو گیا۔

والد محترم ضروری اور مناسب ہے کہ قدر سے یہاں آپ کے والد محترم سے بھی تعارف کرایا جائے جو اپنے ہم عمروں اور اہل خانہ میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی تعلیم کے ابتدائی منزلیں تو اپنے وطن دیوبند میں طے ہوتیں لیکن بعد ازاں وہ دہلی کالج میں داخل ہوئے اور مولانا مسلوک علی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا جہاں سے ملک کے مشاہیر آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ آپ بھی اسی کالج کے سنیافتہ تھے۔ فارسی ادب میں خصوصیت سے مہارت رکھتے تھے بلکہ زبردست شاعر تھے حضرت استاذ مولانا سید اصغر حسین صاحب سابق استاذ ابوداؤد و معلم اعلیٰ دارالعلوم دیوبند نے اپنی کتاب "حیات شیخ الہند" میں ان کو خاقانی ہند سے یاد کیا ہے۔ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کے مرثیے اور تاریخ وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

”حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب مفتی مدرسہ (دارالعلوم) اور مولانا حبیب الرحمن صاحب مظہم (رحمہم اللہ) کے والد ماجد خاقانی ہند مولانا فضل الرحمن صاحب قدیم رکن مدرسہ نے ایک دل گداز طویل مرثیہ نظم فرمایا۔ (حیات شیخ الہند ص ۱۷۱)۔

خاندانی شرافت اور علمی لیاقت کے باعث حکومت ہند نے آپ کو ڈپٹی مدارس کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا چنانچہ یوپی کے مختلف اضلاع بالخصوص

ضلع سجنور میں ڈپٹی انسپکٹر محکمہ تعلیم رہے اور پھر پنشن لیکر فارغ ہوئے۔ ملازمت سے فارغ ہو کر علمی شغل سے خالی نہ رہے بلکہ جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمہ دارالعلوم کی تحریک میں مصروف تھے اس وقت آپ ان کے معاون کی حیثیت سے آگے بڑھے اور مدرسہ عالیہ کی بنیادی تعمیر میں پیش پیش رہے۔ علامہ شبیر احمد مرحوم اپنے ایک مکتوب بنام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ میں جو میرے پاس موجود ہے تحریر فرماتے ہیں :-

”دارالعلوم بہر حال سب مسلمانوں کی متاع ہے۔ جنہوں نے دجھا حرف وہاں رہ کر پڑھے ہیں ان کا عزیز ترین مرتبی ہے۔ اکابر رحمہم اللہ کی امانت ہے۔ ان بزرگوں کا لگایا ہوا پودا ہے جن میں ایک نام میرے والد مرحوم کا تھا“

مولانا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم ولایتی بندہ ۱۳۲۳ھ کی روداد میں ان کی وفات حسرت آیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”علم ادب میں خاص ملکہ تھا۔ فارسی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ نظم و شعر عربی و فارسی نہایت پاکیزہ و متین ہوتی تھی۔ تاریخ گوئی میں اس زمانے میں یا ملکہ دیکھا نہیں گیا۔ آپ کی نظم و شعر کا عمدہ مجموعہ مرتب موجود ہے“

آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۲۵ھ تک بیالیس سال دارالعلوم کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات انجام دیں اور عمر کے آخری لمحوں تک مدرسہ کے رکن رہے تا آنکہ ۳ رجب الدی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۵ جون ۱۹۰۷ء کو بروز ہفتہ بوقت ظہر انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرے

خیال میں والعلوم کے صدقہ جاریہ کے سلسلے میں جن لوگوں کو بے انتہا ثواب سے روزِ جزا نوازا جائے گا ان میں مولانا فضل الرحمن صاحب بھی ہوں گے۔

علامہ شبیر احمد کا سلسلہ نسب حضرت عثمان غنی خلیفہ سوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ دیوبند کی آبادی میں ساداً

خاندان

اور صدیقی و عثمانی خاندان کے صحیح النسب اصحاب اپنی امتیازی شان کے ساتھ بکثرت موجود ہیں۔ اس قصبہ میں خاندان عثمانی کی بنیاد کب پڑی اس کے متعلق تاریخ دیوبند کے مصنف مولانا سید محبوب رضوی وہاں کے بزرگوں کے حالات لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:-

”پانچویں بزرگ خواجہ ابوالوفار عثمانی ہیں..... خواجہ صاحب،

شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی ابن عم دجچاناد جہاٹی ہیں۔ حضرت

کبیر الاولیاء پانی پتی کا زمانہ وفات ۶۹۵ھ ہے۔ اس سے قیاس ہوتا

ہے کہ شیخ ابوالوفاد دیوبند میں آٹھویں صدی ہجری کے کسی حصے میں سکونت

پذیر ہوئے تھے۔ محلہ محل میں ان کا مزار ہے۔ شیخ ابوالوفاد کی اولاد میں

اللہ نے بڑی برکت دی۔ دیوبند کے تمام عثمانی شیوخ ان کی ہی اولاد

میں ہیں..... شیخ عبدالرحمن اکبر جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی چھٹی پشت

میں ہیں حسب روایت اقتباس الانوار مدنیہ منورہ سے ترک وطن

کر کے گازرون علاقہ ماوراء النہر میں سکونت پذیر ہوئے ان کی

تیرھویں پشت میں شیخ ابوالوفاد دیوبند آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔“

(تاریخ دیوبند ص ۲۸-۲۹)

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ علامہ شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

شجرۂ نسب

جاملتا ہے۔ یہاں ہم آپ کے سامنے وہ شجرہ پیش کرتے ہیں جو علامہؒ کے خاندان میں محفوظ چلا آتا ہے اور جو مجھے آپ کے برادر اصغر مولوی سعید احمد صاحب عثمانی نے اپنے قلم سے لکھ کر دیا ہے جو آج کل دارالعلوم دیوبند کے دفتر میں ملازم ہیں۔ شجرہ یہ ہے :

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی بن مولانا فضل الرحمن بن مراد بخش بن غلام محمد
بن غلام نبی بن لطف اللہ بن محمد عاشق بن شیخ فرید عثمانی بن ابومحمد بن محمد
حافظ بن شیخ مولانا محمد بن خواجہ عبدالملک بن عبدالعزیز بن عبدالحکیم
بن سعید بن شیخ احمد بن خواجہ فضل اللہ بن خواجہ ابوالوفاء بن عبید اللہ
بن حسین بن عبدالرزاق بن عبدالحکیم بن حسن بن عبداللہ عرف فیاض الدین
بن یعقوب عرف معز الدین بن عیسیٰ بن اسمعیل بن محمد بن ابابکر بن علی بن
عثمان بن عبداللہ حرمانی ابن عبدالرحمن گارزونی بن عبدالعزیز ثالث
بن خالد بن ولید بن عبدالعزیز ثانی بن شہاب الدین المعروف عبدالرحمن
اکبر بن عبداللہ انسانی بن عبدالعزیز بن عبداللہ اکبر بن عسکر بن
امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

مذکورہ بالا شجرے کی ترتیب سے معلوم ہوا کہ علامہ عثمانی حضرت عثمان
رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تینتالیسویں پشت میں واقع ہیں۔ اس شجرے کا اختتام
خلیفہ ثالث پر ان افراد کے لئے اور بالخصوص علامہ کے لئے باعث فخر ہے کہ ان
لی رگوں میں حضرت عثمانؓ کے خون کی آمیزش ہے۔ علامہ اپنے خطبہ ترک موالا
میں جو آپ نے جمعیتہ العلماء ہند دہلی کے عظیم الشان اجلاس منعقدہ ۱۹۲۰ء
۲۱ و ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء زیر صدارت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ میں پڑھا تھا ایک
جگہ اپنے سلسلہ نسب پر فخر یا فرط ہجرت و مسرت میں علماء اور شہرکائے حلبہ

کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی بولنا نہیں چاہتا جو میرے جدِ بزرگوار
خلیفہ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے منبر پر فرمایا
تھا کہ :

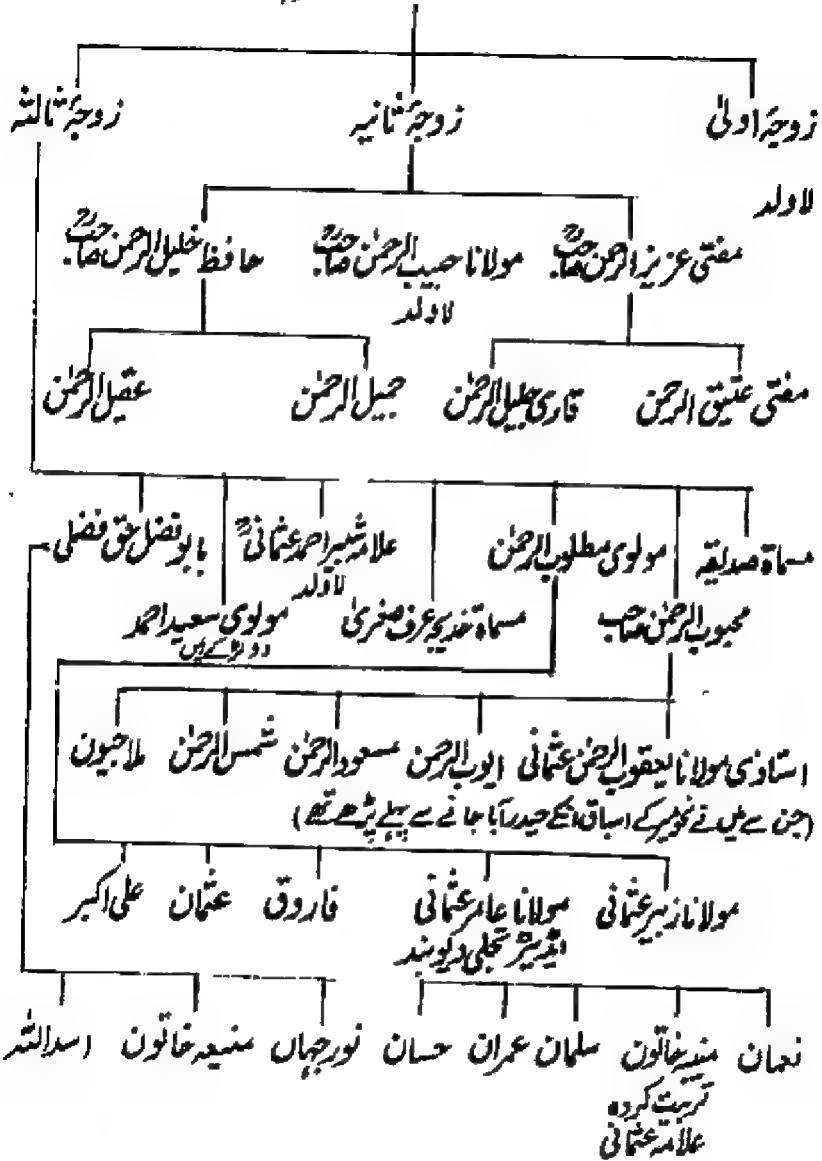
<p>”اے لوگو! یقیناً تم کو بہت زیادہ کلام کرنے والے پیشوا سے بڑھ کر بہت زیادہ کام کرنے والے پیشوا کی ضرورت ہے“</p>	<p>أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا كُنْتُ إِلَى إِمَامٍ نَعَالَ أَخُو حُمَيْنَكُمُ إِلَى إِمَامٍ قَوَّالٍ .</p>
-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

(خطبہ ترک سوالات ص ۲۲ د ۳)

”میرے جدِ بزرگوار خلیفہ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین“ کے الفاظ
سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت علامہ کی رُوح میں حضرت عثمان رضی اللہ
تعالیٰ عنہ سے سلسلہ نسب کے تصور نے اہتر از پیدا کر دیا ہے۔ بہر حال
خوش نصیب ہی وہ اشخاص جن کی رگوں میں شریعت اور پاکیزہ خون دوڑتا ہو
ہم نے علامہ عثمانی کا بالائی شجرہ تو پیش کر دیا مگر آپ کے
شجرہ زیریں | بھائیوں، بہنوں اور برادرزادگان کے متعلق بھی معلوم
نہیں کرنا مناسب ہے۔ اس سلسلے میں علامہ عثمانی کے بھائی بابو فضل حق صاحب
عثمانی کی تحریر سے بقیہ نیچے کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے :

(شجرہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مولانا فضل الرحمن صاحب رحم



قابل فخر برادر اور
برادر زادے

علامہ کے والد محترم کتنے خوش نصیب انسان تھے کہ ان کی اولاد میں کئی ہستیاں نہ صرف فخر خاندان تھیں بلکہ ان کو اگر فخر اسلام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسی مقتدر ہستیوں میں فخر الفقہاء جناب استاذ محترم مفتی عزیز الرحمن صاحب، فخر العلماء جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب اور خود علامہ شبیر احمد عثمانی آسمان علم و فضل کے آفتاب اور ماہتاب تھے۔ اور بھتیحوں کے متعلق پوچھتے تو ان میں مولوی محبوب الرحمن کے صاحبزادہ مولانا یعقوب الرحمن عثمانی مرحوم اور مفتی عزیز الرحمن صاحب کے صاحبزادہ مفتی عتیق الرحمن صاحب کلمہ نہایت فہمیدہ، سنجیدہ اور صاحبان علم و فضل سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ برادر زادوں میں مولانا عامر عثمانی اور زبیر عثمانی ماہنامہ رسالہ تجلّی دیوبند کے مدیر اور ایڈیٹر ہونے کی حیثیت میں جھک رہے ہیں۔

علامہ کے بھائیوں کے سلسلے میں صرف اتنا لکھ دینا کہ وہ فخر خاندان تھے میرے خیال میں نا انصافی اور گستاخی ہے اس لئے حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب اور مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمہما اللہ کا ذکر خیر مختصر طور پر کرنا بصیرت سے خالی نہ ہوگا۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

انہایت ہی عابد و زاہد، متقی اور پرہیزگار تھے۔ علم فقر میں زبردست بصیرت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں رہ کر علم حدیث اور فقر میں مہارت حاصل کی۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب جو اپنے زمانے کے دلی صفت انسان تھے ان سے حضرت مفتی صاحب بیت تھے تا آنکہ ان کے خلیفہ اعظم بنے۔

مفتی صاحب اگرچہ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کے عہدے پر بھی مامور تھے لیکن آپ کے اصل فرائض منصبی میں فتویٰ نویسی کی خدمات کا انجام دینا تھا۔ جہاں آپ نے ہزاروں طلبہ کو حدیث و تفسیر کی تعلیم دی وہاں دارالعلوم کے دوران ملازمت میں تقریباً اٹھارہ ہزار فتوے لکھے۔ ہستم صاحبان کی عدم موجودگی میں اہتمام کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ دارالعلوم کے خزانے کی ایک چابی آپ کے پاس ہوتی تھی جو آپ کی دیانت اور امانت پر واضح اور روشن دلیل تھی۔ نہایت سیدھے سادے، سولے بھانے، خاموشی پسند، مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ تم نے فرشتے کو دیکھا ہے تو میں اس کا جواب صرف اتنا ہی دوں گا کہ دیکھا ہے۔ اور اگر کوئی مجھ سے اس فرشتے کی شکل و صورت، وضع قطع، سیرت و عادت اور نام کے متعلق سوال کرے تو میں کہوں گا کہ اس فرشتے کا نام عزیز الرحمن ہے۔ سفید باشرع ریش مبارک، نورانی چہرہ، چھوٹا قد، سر پر نیٹھے، بغل میں کرتا، مغلیٰ پاجامہ، کرتے پر صدری، صدری میں جیبی گھڑی، آنکھوں پر عینک، ہاتھ میں بیدیا لکھڑی کی چھڑی، گھر سے دارالعلوم اور مدرسے سے گھر تشریف لاتے اور لے جاتے نظریں اکثر آیا کرتے۔ راقم الحروف نے ان سے جلالین شریف اور طاوی دو کتابیں پڑھیں اس لئے میں اپنے لئے ان کی شاگردی کو باعث فخر و سعادت یقین کرتا ہوں۔ اور دل کی بات تو یہ ہے کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور اساتذہ کی جوتیوں کے صدقے میں جو کچھ ملا وہ کہیں سے نہ مل سکا۔ جو علوم و فنون کی تحقیقات وہاں سننے میں آتیں وہ کہیں بھی نہ سنی جاسکیں۔ وہیں کے دریائے علم سے جو پانی پیا اس نے کہیں اور کی پیاس باقی نہ چھوڑی، ہر شعبہ علم میں وہاں کی حاصل کی ہوئی چمک کے سامنے

ساری شہین بھی بھی اور بھی بھی نظر آئیں۔

دارالعلوم کے دوران تعلیم میں مجھے جن اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا ان میں بتدریج مولوی محمد علی صاحب حیدر آبادی، مولوی یعقوب الرحمن صاحب عثمانی، مولوی افتخار علی صاحب برادرزادہ مولانا اعجاز علی صاحب بھائی جی بھائی سعید صاحب گنگوہی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجرینہ، مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا نبیہ حسن صاحبہ ماہر نحو، مولانا احمد شیر صاحب ہزاروی، مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، مولانا محمد ادریس صاحب سگر ڈھوی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا گل محمد خان صاحب، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا عبدالسمیع صاحب، مولانا اعجاز علی صاحب، حکیم محمد حسن صاحب برادر اصغر شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، مولانا رسول خان صاحب، مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید محمد نور شاہ صاحب اور حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب جیسے علم و فضل کے دریائے ناپیدائے کنار تھے جن کے دیکھنے سے آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہونا فطری تقاضا تھا۔

دارالعلوم سے فارغ ہوا تو پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل کی طرف رخ کیا اور اسے پاس کرنے کے بعد لاہور کے ٹرننگ کالج میں جا داخل ہوا۔ وہاں صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم۔ اے، مولوی ظفر اقبال صاحب ایم۔ اے، پروفیسر محمد منیر صاحب ایم۔ اے لیکچرر تاریخ، لالہ سوہن لال جغرافیہ، وغیرہم کی شاگردی حاصل ہوئی۔ پھر منشی فاضل، ادیب فاضل

سے فراغت حاصل کی اور بعد ازاں میٹرک ، ایف ۔ اے اور بی ۔ اے کے امتحانات دیتا ہوا ایم ۔ اے کی کلاس کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور کی ایم ۔ اے کلاس میں پروفیسر مقبول احمد صاحب فارسی پروفیسر ، پروفیسر معراج الدین صاحب پروفیسر سعید صاحب ، پروفیسر محی الدین صاحب ، پروفیسر آفتاب احمد ، پروفیسر اشتاق احمد ، صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ، ڈاکٹر صادق اور خواجہ منظور صاحب علیگ سے بھی فیضیاب ہونے کا شرف حاصل ہوا ۔ لیکن ہر گلے رارنگ و بوسے دیگر است ۔ عالم معنی اور عالم رنگ و بود و نون میں زندگی کے سانس لئے مگر علمائے دیوبند کی صحبتوں میں جو حقیقی لطف آیا وہ اور کہیں نظر نہ آیا ۔ وہاں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلسیں گرم رہتی تھیں اور یہاں شکستہ ، ورڈس ورتہ ، گوشتے کولرج ، بائرن کے چرچے تھے ۔ وہاں دین اور مذہب کی بحثیں تھیں مگر یہاں دنیا اور جاہ و منصب کے افسانے تھے ۔ وہاں نماز کے لئے بیچگانہ صف بستگی تھی اور یہاں ڈراموں اور گانوں کے پروگرام تھے ۔ وہاں عقیقت و خلوص کے پھول کھلتے تھے یہاں بے باکی ، شوخی اور آزادی کی کلیاں چلتی تھیں ۔

ہماری آنکھوں نے بھی تماشہ عجب عجب انتخاب دیکھا

برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

مگر جو کچھ لطف زندگی دیوبند میں دیکھا وہ اور کہیں نہ پایا اور نہ دیکھا ۔

درحقیقت بقول حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ہمارے اکابر کی تحقیقات کا توازن متقدمین سے کیا جاتے تو یہ حضرات کسی سے کم نہ تھے ۔

بات کہاں سے کہاں جانکلی ۔ تذکرہ تو حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب

نور اللہ مرقدہ کا تھا کہ دیکھنے میں فرشتہ تھے اور صورت میں انسان ، فقہ اور تقویٰ کی جیتی جاگتی تصویر تھے ۔ آخر دنیا جہاں انقلاب کروٹیں بدلتا رہتا ہے وہاں آپ

کی زندگی میں بھی انقلاب آیا اور قدرت کو آپ سے اب کسی اور سر زمین میں کام لینا تھا اس لئے ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سملک) ضلع سورت کی ملازمت اختیار فرمائی اور آخر ، ارجادی الاخریٰ ۱۳۲۷ھ کو دیوبند میں وفات پائی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہم اللہ کے قریب دفن ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم

نحیف اکبرم ، متوسط قد ، سر پر پنچھے ، لمبا کرتا ، مغلی پاجامہ ، بوقت ضرورت چھکلیا اچکن ، گندمی رنگ ، چلتے پھرتے اور فراغت کے عالم میں ہاتھ میں تسبیح اور زبان پر ذکر الہی ، چہرے سے رعب ٹپکتا تھا۔ غذا بہت قلیل مگر جائے بکثرت پیتے تھے۔ مہان نوازی میں عربوں سے دو چار قدم آگے۔ تنخواہ کا اکثر حصہ مہمانوں اور احباب و اعزاء پر خرچ کر دیتے تھے۔

آپ کی تمام تر تعلیم دیوبند میں ہوئی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن امیر الٹا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گلوہی رحمہما اللہ کے فیض یافتہ تھے۔ عرصہ تک گنگوہ خدمت میں رہے۔ ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم بنائے گئے۔ اپنی خداداد قوت انتظامیہ سے دارالعلوم کو چار چاند لگا دئے۔ اگرچہ اس وقت مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب فرزند رشید حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ دارالعلوم کی ترقی کا سہرا آپ کے سر تھا۔

فہم و فراست ، علم و فضیلت ، دانائی اور سیاست میں بلند شخصیت کے مالک تھے۔ اساتذہ اور طلبہ کے دلوں پر آپ کی جلالت و عظمت کا سکھ

بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی زندگی دارالعلوم کی خدمات کے لئے شبانہ روز وقف کر رکھی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اوقات مدرسہ کے علاوہ اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے بلکہ دارالعلوم کو اپنا گھر سمجھ کر اس کی بہبودی اور ترقی میں شب و روز نہمکت ہوئے۔ علم ادب میں پوری مہارت اور بصیرت رکھتے تھے۔ عربی نثر و نظم پر بے تکلف قدرت تھی۔ آپ کا مشہور عربی قصیدہ ”لامیۃ العجزۃ الثمین سواشاً“ پر مشتمل آپ کی عربی زبان دانی پر روشن دلیل ہے۔ اردو نثر میں موتی پر دتے تھے۔ اردو کے بھی بہترین انشا نگار تھے۔ ان کی معرکہ آرا تصنیف ”دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا“ تاریخ، علم اور ادبیت کا بہترین شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمات اسلامیہ کے دو نمبر اپنی نوعیت مضمون میں قابل قدر رسالے ہیں۔

سیاست ملکی میں بھی ان کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ جمعیتہ علماء ہند دہلی کے مقتدر اور صاحب اثر ممبر تھے۔ آپ نے جمعیتہ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ گیارہ ۱۹۲۲ء میں زبردست خطبہٴ صدارت پیش کیا جس کو سن علماء اور قوم کے لیڈر عیش و عشرت کراٹھے۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۰ء تک پانیس سال دارالعلوم کی خدمات انجام دے کر ۲۷ رجب ۱۳۴۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۹ء میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

علامہ کی پیدائش گزشتہ صفحات میں حضرت علامہ عثمانی کے نام ناجی خاندان، والد مرحوم اور بھائیوں وغیرہم کے حالات پر ہم نے مناسب اور حسب ضرورت روشنی ڈالی ہے۔ اب پھر صاحب سوانح کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

آپ کا اگرچہ آبائی وطن دیوبند تھا لیکن پیدائش خاص سجنور میں

۱۰۔ محرم الحرام ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۸۵ء کو ہوئی۔ بجنور پو۔ پی کا مشہور ضلع ہے جس کے ایک بڑے قصبے یعنی شیرکوٹ میں اس راقم الحروف کی بھی آبائی مسکات ہیں اور یہی میری جائے پیدائش ہے لیکن کسے معلوم تھا کہ ۱۹۴۷ء کے زبردست انقلاب میں یہ وطن بے وطنی میں بدل جائے گا اور وہ وقت آجائے گا کہ اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترسا کریں گی اور دل سڑ پا کرے گا۔

ہاں تو علامہ عثمانی کے والد محترم ضلع بجنور میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر تھے، اسی دوران قیام میں علامہ یہاں پیدا ہوئے۔ اور یہ بات انہوں نے مسلم لیگ کے ایک شاندار جلسے میں بجنور میں تقریر کرتے ہوئے بھی فرمائی تھی۔ خود دیوبند جو آپ کا آبائی وطن ہے ہند اور بیرون ہند میں اتنی شہرت رکھتا ہے کہ تعارف کا محتاج نہیں لیکن تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے اس پر مزید روشنی ڈالنا سوانح نگاری کے فرائض کی ایک اہم کڑی ہے اور اس لئے بھی کہ یہ آبادی مسلمانان ہند و پاکستان اور دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کا دینی اور مرکزی مقام ہے جن سے تمام کی مذہبی روایات وابستہ ہیں۔ لہذا اس سلسلے میں آپ کے سامنے دیوبند کی تاریخی حیثیت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

تاریخ دیوبند

ہم دیوبند کی تاریخ کے لئے "تاریخ دیوبند" مصنف مولانا سید محبوب رضوی دیوبندیؒ سے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے جو دیوبند کے باشندے اور دارالعلوم کے فرزند ہیں پوری تحقیق اور تجسس کے ساتھ یہ کتاب تحریر کی ہے۔ لیکن ہم نے اس میں ترتیب بدل کر اتنا تصرف کر دیا ہے کہ پہلے دیوبند کی جغرافیائی حیثیت کو پیش کیا ہے اور بعد ازاں تاریخی پوزیشن کو، جو حسب ذیل ہے۔ مصنف تاریخ دیوبند لکھتے ہیں :-

”محل وقوع“ دیوبند شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقہ طول البلد

پر دہلی سے ۹۱ میل شمال کی جانب ضلع سہارنپور میں ایسٹرن پنجاب ریلوے پر واقع ہے۔ دیوبند کے شمال میں سہارنپور، جنوب میں مظفر گڑھ مشرق میں بجنور اور مغرب میں کمرناں ہے۔ اس کے مشرق میں دریائے گنگا بہتا ہے اور مغرب میں دریائے جمنا۔ دیوبند ان دونوں مشہور دریاؤں کے وسط میں واقع ہے۔ شیر شاہ سوری کی وہ شاہراہ اعظم جو کلکتہ سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے دیوبند سے گزرتی ہے۔ یہ وہی شاہی سڑک ہے جس کی تعریف خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے مسدس کے اس بند میں کی ہے ص ۵

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفا ۱ دوطرفہ ہواور درختوں کا سایا
نشاں جا بجا پھل و فرخ کے برپا ۲ سرراہ کنوئیں اور سرائیں مہیا!

واقعہ یہ ہے کہ شیر شاہ کا یہ تعمیری کارنامہ اپنے زمانے کے لحاظ سے بالکل
عظیم المثال ہے۔ یہ سڑک چار مہینے کی مسافت پر پھیلی ہوئی ہے۔ سات
سات کوس کے فاصلہ پر پختہ سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ مسافروں کو آرام پہنچانے
کے لئے ہندو اور مسلمان لوگ رکھے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف
میوہ دار درخت لگوائے تھے۔ جن کے پھل مسافروں کے کام آتے تھے۔
راستہ کے اندازہ کے لئے ہر کوس پر مینار بنا ہوا تھا۔ سڑک پر جا بجا
مسجدیں اور کنوئیں بنے ہوئے تھے۔ مسجدوں میں سرکاری امام اور مؤذن
مقرر تھے۔ غرضیکہ اس زمانے کے لحاظ سے مسافروں کو سفر میں جن چیزوں
کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ان سب کا انتظام حکومت کی طرف سے مفت
کیا جاتا تھا۔

دیوبند میں بھی اس قسم کی سرائے کے آثار اور نشانات سڑک سے متصل
موجود ہیں۔ مظفرنگر اور سہارنپور کے درمیان کا ٹکڑا اب تک پختہ نہیں
تھا۔ اب چند سالوں سے اس سڑک کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ ابتدائی کام
مکمل ہو چکا ہے صرف سیمنٹ بچھانا باقی ہے۔ امید ہے کہ غنقریب ہی یہ
کام بھی پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ اس سڑک کے علاوہ نارنہ دیسٹرن
ریلوے کی وہ مین لائن بھی دیوبند سے گذرتی ہے جو دہلی سے سہارنپور
ہوتی ہوئی پشاور تک جاتی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اب یہ ایسٹرن پنجاب
ریلوے کے نام سے موسوم کر دی گئی ہے اور پشاور کی بجائے اب اترسر
تک جاتی ہے۔ یہ ریلوے لائن ۱۲۸۵ء میں تعمیر ہوئی اور یکم جنوری
۱۸۹۱ء سے اس پر ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔

۱۔ اب یہ سڑک پختہ ہو گئی ہے ۱۱ اشفاق احمد قاسمی

طرز آبادی

دیوبند کی آبادی کا طرز بھی قابل ذکر ہے جس کی نظیر بہت کم دوسری جگہ ملے گی۔ جہاں کی آبادی

کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ ایک جانب مسلمان آباد ہیں اور دوسری جانب ہندو۔ درمیان میں شمالاً جنوباً ایک بازار ہے جو بمنزلہ حد فاصل کے ہے۔ بازار کی جانب مغرب مسلمان آباد ہیں اور مشرق کی جانب ہندو۔ اور پھر مسلمان اور ہندوؤں میں ہر قوم علیحدہ علیحدہ اور ایک جگہ آباد ہے۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ اور نقل و تبدیل سے اب یہ حالت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ تاہم یہ ترتیب ابھی تک ظاہر اور محسوس ہوتی ہے۔ قوموں اور محلوں کی یہ ترتیب تقسیم سلطان شہاب الدین غوری کے عہد کی بتلائی جاتی ہے۔ (تاریخ سہارنپور ص ۱۶۱)

موجودہ آبادی ۳۶ محلوں پر مشتمل ہے ستمبر ۱۹۳۶ء کے راشننگ سسٹم کے اعداد و شمار کے مطابق مکانوں کی تعداد ۵۲۰۶ ہے۔

دیوبند کو کس نے آباد کیا | دیوبند کو کس نے آباد کیا اور کس نے آباد کیا؟ اس کا فیصلہ

گن جواب دینا بہت مشکل ہے۔ قدامت کے باعث اب تک اس کے زمانہ تعمیر کا ٹھیک ٹھیک تعین نہیں کیا جاسکا ہے کسی نے ایک ہزار برس کی آبادی بیان کی ہے، اور کسی نے سمیت بکرماجیت سے پہلے کی جس کو دو ہزار سال سے زائد گزر چکے ہیں۔

ایک روایت میں طوفانِ نوح کے قریب ترین زمانے میں آباد ہوا بتلایا جاتا ہے۔ تاہم پرانی عمارتوں اور کتبوں سے اس قدر یقین معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد حکومت کے بہت پہلے سے آباد ہے۔ دو آہ

کا علاقہ تاریخ کے قدیم ترین زمانہ سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔

موجودہ آبادی سے مشرق کی جانب تقریباً دو میل کے فاصلہ پر پختہ عمارتوں اور غیر مسلم عبادت گاہوں کے بکثرت نشانات ملتے ہیں۔ پرنے لوگوں کا بیان ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار سال قبل دیوبند کی قدیم آبادی یہی تھی میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلہ میں تجسس و تحقیق اور چھان بین سے کام کیا جائے اور یہاں کے کھنڈروں کی لائیٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا جائے تو یقیناً کچھ نہ کچھ انکشافات ہو سکتے ہیں۔

دیوبند سے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بدھ مت کے عروج کے آخری زمانے میں جبکہ برہمن اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے خفیہ جدوجہد کر رہے تھے تو یہ مقام بھی ان کے خفیہ انقلابی مرکزوں میں سے تھا۔

بہر حال اس کا افسوس ہے کہ دیوبند کی قدامت کے لحاظ سے اس کے حالات کا پتہ لگانے کے ذرائع مجھے دستیاب نہیں ہو سکے اس لئے جو معلومات حاصل ہو سکے وہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

مولانا فصیح الدین صاحب اپنے جغرافیہ ضلع سہارنپور میں دیوبند کی آبادی کے متعلق لکھتے ہیں :-

”آبادی نہایت پرانی بہت بکراہیت سے پہلے کی ہے۔“
تاریخ سہارنپور کا مصنف بھی زمانہ آبادی کا ٹھیک تعین نہیں کر سکا اس نے لکھا ہے کہ :-

”یہ قصبہ قدیم ہے تخمیناً ایک ہزار برس کی آبادی بیان کرتے

ہیں ایک قلعہ بھی اس میں تھا کہ اب اس پر عمارت سابق کا
 انکشاف نہیں ہے۔ اب مثل ایک کھنڈر ہے۔ سرکار انگریزی
 نے مقام تحصیل اس پر بنایا ہے۔ اس قلعہ کے دروازے
 پر ایک مسجد بہ عمارت نختہ کہنہ تعمیر موجود ہے اور پیش دروازہ
 اس کے چھر پر یہ عبارت اس کے سن و تاریخ کی کندہ ہے۔
 ۱۶۱۹ء ۶۱۲ھ سلطان سکندر بن بہلول شاہ — (۱۶۲۶ء)

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبند کو طوفان نوح کے بعد کی
 ابتدائی بستیوں میں شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے ذیل کے ادبیات انداز میں
 اس کی قدامت کا ذکر کیا ہے :

فکورة قديمة ، قصبہ	یہ ایک قدیم آبادی ہے بہت
عظيمة ومدینة کریمہ	بڑا قصبہ اور عظیم الشان شہر ہے
وبلدۃ فخمۃ کاٹھا اول	معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے
عمران ، عَمْرَ بعد	بعد کی ابتدائی بستیوں میں سے
الطوفان ، ذات المعامد	ہے ، اس کی عمارت اور مساجد
الوسیعة والمساجد	نہایت وسیع اور بلند واقع ہوئی
السفیحة ومعالم المشہورۃ	ہیں ، آثار قدیمہ اور مزارات
والمقابر المخروقة ، و	اولیاء اللہ سے بھرا ہوا ہے ۔
الأتار المحمودة والایضا	اس کے آثار محمودہ اور حالات
المسعودۃ وابنیۃ مہومۃ	مبارکہ مشہور ہیں اس میں نختہ
وامکنۃ مخرمۃ ۔	اور مستحکم عمارتیں ہیں ۔
(الهدیۃ السنیۃ منہ)	

ہندی زبان کے ”ہندو سنسکرت کا ایک کیندر“ کے مصنف نے لکھا ہے کہ :

”دیوبند کا ذکر مارکنڈے پُران میں ملتا ہے جس سے دیوبند کی قدامت ثابت ہے نیز یہ بھی مشہور ہے کہ کوروں پانڈوں کے عہد حکومت میں دیوبند آباد تھا“

(ہندو سنسکرت کا ایک کیندر ص ۲ شائع کردہ

نرائن چند سستی)

شہر سے باہر جنوب کی جانب ایک محلہ سرائے پیر زادگان ہے ۔ اس محلہ کے ایک کنویں میں سنسکرت رسم الخط کا ایک کتبہ اینٹوں پر لکھا ہوا ہے ۔ اس کتبہ کو پڑھنے کی بے حد کوشش کی گئی مگر اینٹوں کے گھس جانے کی وجہ سے حروف صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے ۔ صرف نیچے کی کچھ کسی قد رسن کا پتہ چلتا ہے ۔ غالباً ۱۱۹ھ بحیرہ ہجرت ہے ۔ سو سال سے کچھ زائد ہوئے کہ تعمیر مکان کے سلسلہ میں ایک بہت پرانے بند کنویں سے ایک سنگین کتبہ برآمد ہوا تھا ۔ جس کو سکندر اعظم کے زمانہ کا بتایا جاتا ہے ۔ اس کتبہ پر برآمدگی کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے قبضہ کر لیا معلوم نہیں کہ اب کہاں ہے ۔ اگر یہ کتبہ ہاتھ آتا تو شاید مزید انکشاف ہو سکتا تھا ۔

یہاں ایک قلعہ بھی راجگان ہستنا پور کے زمانہ کا بیان کیا جاتا ہے سلطان سکندر شاہ کے عہد میں حسن خان صوبہ واس نے قدیم عمارت کو مسما کر اگر از سر نو پختہ اینٹوں کا تعمیر کرایا تھا ۔ حسن خان کے نام کی نسبت سے قلعہ کا مقام اب تک حسن گڑھ کہلاتا ہے ۔

اس قلعہ کے متعلق آئین اکبری میں ہے کہ :

”دیوبند قلعہ از خشت پنجتہ دارد“ (آئین اکبری جلد دوم ص ۱۴۲)

قلعہ اور اس کی عمارتوں کا اب کوئی نشان نہیں ملتا صرف ایک اونچا مقام ہے جس پر زیادہ تر سرکاری عمارتیں تحصیل، عدالت منصفی، دفتر رجسٹری، ڈاک خانہ، اسکول بنے ہوئے ہیں۔ اس قلعہ کے ایک کنویں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں دیوؤں کو قید کیا گیا تھا۔

قدیم آبادی میں یہ خصوصیت عام طور پر پائی جاتی ہے کہ ان کی آبادی ہموار سطح پر نہیں ہے۔ کہیں نشیب ہے کہیں فراز۔ اس کا سبب ماہرین آثار قدیمہ (Archaeology) کے نزدیک یہ ہے کہ حوادث زمانہ زمانہ سے جب کوئی آبادی نیست و نابود ہوتی ہے تو زمین پر اپنا ارتقاعی نشان ضرور چھوڑتی ہے۔ بعد کے لوگ اسی جگہ آباد ہونے کی خواہش کے ماتحت اس پر دوبارہ تعمیر کرتے ہیں اور جب یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہتا ہے اور آبادیاں بگڑتی اور بنتی رہتی ہیں۔ تو سطح میں ناہمواری اور نشیب و فراز کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک یہ نہیں ہوتا کہ جو ابتدائی آبادی ہو اس وقت وہ جگہ ناہموار ہو بلکہ ارتقاعی امر ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے ہزاروں سال کی گردش درکار ہوتی ہے۔

اس اصول کے مطابق دیوبند کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی آبادی میں بکثرت نشیب و فراز نمایاں نظر آتے ہیں اور بعض تو یہ تفاوت پچاس فٹ تک پہنچ جاتا ہے۔

وجہ تسمیہ

دیوبند کی وجہ تسمیہ میں ذیل کی متعدد اور مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں :

۱۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوبند کو پہلے ”دیوی بلاس“ کہتے تھے۔ کیونکہ یہاں پر سندری دیوی کا ایک مندر معروف ہے ”دیوی کنڈ“ اور ایک جنگل موسوم ”بلاس“ واقع تھے۔

۲۔ پنڈت نند کشور نے ضلع سہارنپور کی تاریخ میں دیوبند کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ :

”وجہ تسمیہ قصہ میں بہت سی روایات زبان زد سائین قصہ کے ہیں مگر قرن قباس وجہ تسمیہ کا یہ معلوم ہوا کہ پہلے اس موقع پر جنگل لقی ودق تھا۔ ایک مکان معروف ”دیوی کنڈ“ اور دوسرا جنگل ”بلاس“ اس موقع پر واقع تھے ان دونوں مکانوں کے سبب سے بنام نہاد دیوبند مشہور ہوا پہلے اس مقام کو ”دی بن“ کہتے تھے۔ کثرت استعمال

سے دیوبند ہو گیا۔ (تاریخ سہارنپور مطبوعہ ۱۸۶۸ء ص ۲۷ (۱۶۰)

۳۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ”سلیمان پٹنہ“ نے اس کے قلعہ میں دیوؤں کو بند کیا ہے اس واسطے دیوبند نام ہے۔ اس واسطے ہندی میں ”دیو“ بمعنی دیوتا اور ”بن“ معنی ”جنگل“ ہے۔

(تاریخ سہارنپور صفحہ ۲۷ و ۱۶۰)

۴۔ بعض لوگ ایران کی تاریخ کے حوالہ سے ایک اور سبب تسمیہ

بیان کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

” ایران کے آریہ نسل کے باشندوں کی زبان میں لفظ دیو کا اطلاق وحشی اور جنگلی جانوروں پر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہی لفظ ہندوستان میں آکر بعد کو ”مہادیو“ بن گیا۔“

پھر ہندوستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ :

” ان ہی آریہ نسلوں نے ہندوستان آکر یہاں کے اہلی باشندوں کو کھلے میدانوں اور آبادیوں سے بڑبڑشیر نکال گنجان جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑوں میں مار بھگایا۔“

پس چونکہ دیوبند میں جنگلات کی کثرت تھی قرین قیاس ہے کہ نووارد آریوں نے وحشی اقوام کو جنگل میں بند کر دیا ہو۔

۵۔ ایک روایت (جس کا پہلے ذکر آچکا ہے) یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں دیوبند کے باشندوں کی فریاد پر آپ کے عمال نے یہاں آکر ایذا دہندہ دیوؤں کو قید کر دیا اور دیوؤں کا یہ تقید آگے چل کر سبب تسمیہ بن گیا۔ چنانچہ اسی روایت کی بناء پر ایک بند کنویں کو دوبارہ کھودنے کے وقت ایک مہیب صورت دیو کا نکلنا بھی عوام الناس کے زبان زد ہے۔“

(مقدمہ حیات شیخ الہند مصنف مولانا صفر حسین صاحب)

تاریخی اور حقیقی طور ان میں سے ہر ایک روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا البتہ روایات کے اختلاف سے تین ناموں کا یقین ہوتا ہے۔ ”دیوی بلاس“، ”دیوٹی بن“، ”دیویند“ اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں یہ مقام کس نام سے ملتا ہے۔

جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے اس میں مؤخر الذکر دو نام مروج ہیں۔ تاریخ سے بھی انہی دو ناموں کا ثبوت ملتا ہے مگر وہ بھی بہت زیادہ قدیم نہیں۔ میرے اجداد میں سے بعض بزرگوں کے نام جہانگیر اور شاہجہاں نے جاگیریں عطا کی ہیں ان میں دیوبند ہی تحریر ہے۔ آئین اکبری جو عہد اکبر کی تصنیف ہے اس میں بھی دیوبند ہی لکھا گیا ہے۔

(ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد دوم مطبوعہ نوکشتورستان ۱۲۱۲ و ۱۲۱۳ء)

کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں زیچ الف یگی کا ایک مخطوط ہے اس کے اخیر میں تحریر ہے :

”ابن اوراق زیچ الف یگی در روز یوم السبت در قلعة دیوبند

بتاریخ نوزدہم شہر ربیع الاول ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۳ء صورت تحریر یافت“

دیوبند میں ایک بزرگ قلعہ گزرے ہیں جن کا مزار تحصیل کے قریب سبزی فروشوں کے بازار میں واقع ہے۔ تذکرۃ العابدین صفحہ ۲۷۹ پر ان کا سن وفات ۸۲۵ھ ۱۴۲۱ء لکھا ہے۔ ان قلعہ گزر کا ایک شعر عام طور پر زبان زد ہے جس میں دیوبند ہی نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرعہ یہ ہے

قلو قلندرست بدر وازہ دیوبند

مجدد الفنائی کی سیرت ”زبدۃ المقامات“ جو ادمل گیا رھوس صدی کی تصنیف ہے اس میں ایک مکتوب بنام شیخ احمد دہلوی کے ذیل میں تحریر ہے :-

”دین موصی ست از مضافات سہارنپور میان دو آب“

(مطبوعہ محمود پریس کمپنی، ص ۳۸۴)

۱۳۸۳ھ میں دیوبند میں ایک زبردست بلیگ پھیلا تھا۔ اس
۱۸۸۳ء بلیگ کی تباہ کاریوں کو مولانا فضل الرحمن صاحب نے فارسی میں نظم
کیا ہے۔ اس نظم کا تاریخی نام ”قصہ غم دین“ ہے۔

۱۳۲۲ھ میں جیمس وکسن لاٹوش لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ
۱۹۰۵ء کے محاسبہ دارالعلوم دیوبند کے خیر مقدم میں جو نظم پڑھی گئی اس
میں بھی ”دین“ نظم کیا گیا ہے، شعر یہ ہے ۵
ہے یہ دارالعلم شاہ! یادگار مسدیں

کور دہ دین صاحب سے رشک شہ جڑوں پر

مذکورہ بالا تحریری اسناد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ”دین“ اور

”دیوبند“ دونوں نام مدت مدید سے مروج اور زبان زد ہیں۔ اس
لئے قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں اولیت کس کو حاصل ہے
تاہم میرے نزدیک وجہ تسمیہ کی پہلی دو روایتیں عقل اور قیاس
کے اعتبار سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں کہ ”دیوبند“ ”دیوی“ اور
”بن“ سے مرکب ہے۔ ان دونوں لفظوں کی آمیزش نے اس کو اولاً

”دیوی بن“ سے موسوم کر دیا جو بعد ازاں کثرت استعمال سے
”دے بن“ اور پھر رفتہ رفتہ صرف شکامین سے ”دیوبند“ ہو گیا۔

اس روایت کے آثار و قرآن بھی فی الجملہ پائے جاتے ہیں۔ یعنی دیوی کا مندر
اور ”بن“ کو ان میں سے آخری جزیر ختم ہوتے ہوئے ابقریب قریب محذوم ہو چکی
ہے۔ مگر اس کے وجود کا ثبوت (وجہ تسمیہ کے علاوہ) متعدد روایات کے سبب سے
”خبر متواتر“ کی حیثیت رکھتا ہے نیز دیوبند کے شمالی جانب ایک مقام فاضل
شیر کی بنی کے نام سے موسوم ہو گیا جو ای بن کا ایک حصہ بنو کی وجہ سے تصغیر
”بنی“ کہلاتا ہے۔ اس بنی کے کچھ کچھ آثار اب بھی باقی رہ گئے ہیں۔“

عکس تعلیم

۱۳۱۱ھ سے ۱۳۲۵ھ تک
۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۸ء تک

یہاں تک علامہ عثمانی کے نام، پیدائش، ولدیت، شجرۂ نسب، خاندان اور وطن پر حسب ضرورت لکھا جا چکا۔ پیدائش کے بعد عام طور پر حالات کے سلسلے میں تعلیم کی ابتداء تک شاذ و نادر ہی بچوں کے ایسے واقعات ہوتے ہیں جو سوانح کی زینت بن سکتے ہیں اس لئے یہاں سے ہم ان کے تعلیمی حالات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔

بسم اللہ | آپ کے سب سے پہلے استاد جنہوں نے آپ کی بسم اللہ کرائی حافظ محمد عظیم صاحب دیوبندی مرحوم تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق غالباً عربی کا قاعدہ شروع کیا ہو گا جو قاعدہ بغدادی کے نام سے مشہور ہے لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ اردو قاعدے سے تعلیم کا آغاز ہوا ہو۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بغدادی قاعدے ہی سے اس زمانے کے دستور کے مطابق آغاز ہوا ہو گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ والد محترم مرحوم نے کسی گتے کے ”نکڑے“ پر ”الف“ ”ب“ لکھ دی ہو اور حافظ نامدار صاحب سے ابتدا کرا دی ہو۔ اس وقت آپ کی عمر چھ سال کی تھی۔ بسم اللہ کا سنہ تیرہ سو گیارہ ہجری تھا۔ ماہ اور تاریخ گنہامی کے پردے میں ہیں۔

آپ قاعدہ وغیرہ سے فارغ ہوئے، تو
دارالعلوم میں داخلہ | سوال یا اور کسی ماہ ۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم

دیوبند میں داخل ہوئے۔ اور قرآن کریم حافظ نامدار خان صاحب سے بھی
 پڑھا۔ چنانچہ دارالعلوم کی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۳۱۲ھ
 میں سورۃ الحمد سے سورۃ النازعات تک امتحان دیا۔ ۱۳۱۳ھ کی
 روئداد میں آپ کا نام موجود نہیں ہے۔ ۱۳۱۳ھ اور ۱۳۱۴ھ کی سالانہ روئداد
 میں بھی طلبہ کی فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں
 سالوں میں آپ والد مرحوم کے دوران ملازمت میں ان کے ساتھ ہوں گے،
 اور وہیں رہ کر قرآن کریم اور بعض اردو کی کتابیں پڑھی ہوں گی۔

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں آپ کا نام پھر طلبہ کی فہرست میں موجود ہے۔
 اور پھر سلسلہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء تک چلا گیا ہے۔

قرآن کریم اور اردو کی کتابوں کی تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے فارسی کی
 ابتداء دارالعلوم کے فارسی استاد منشی منظور احمد صاحب سے کی۔ اور بعد
 ازاں استاذ محترم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ العالی مفتی پاکستان
 کے والد مرحوم مولانا محمد حسین صاحب صدر مدرس شعبۂ فارسی دارالعلوم
 سے فارسی کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ ان تمام تاریخی تعلیمی حالات کا صحیح علم
 دارالعلوم دیوبند کی سالانہ رپورٹوں سے بڑھ کر اور ستر کہیں سے حاصل نہیں
 ہو سکتا اس لئے ہم آپ کو دارالعلوم کی سالانہ رپورٹوں سے علامہ عثمانی کی
 سال بسال تحصیل علوم کی کیفیت پیش کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ آپ نے ان کتابوں
 میں کتنے نمبر لیکر کامیابی حاصل کرتے رہے۔ یہاں یہ حقیقت واضح کر دینی بھی
 ضروری ہے کہ دارالعلوم میں کامیابی کا معیار پچاس نمبروں میں چالیس نمبر

ہوتا ہے۔ چالیس سے کم نمبر حاصل کرنے والا طالب علم فیل شمار کیا جاتا ہے۔ کامیابی کے بھی اعلیٰ، اول، دوم اور سوم مدارج ہوتے ہیں۔ جو طلبہ چالیس سے پینتالیس تک نمبر حاصل کرتے ہیں وہ تھرڈ ڈویژن میں سمجھے جاتے ہیں پینتالیس سے اوپر انچاس تک سیکنڈ ڈویژن ہوتی ہے۔ لیکن پچاس نمبر حاصل کرنے والا فرسٹ ڈویژن لیتا ہے۔ مگر ایک اس سے بھی اونچی ڈویژن ہوتی ہے جس کو اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اس میں پچاس سے اوپر نمبر حاصل کرنے والے طلبہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پچاس میں چالیس نمبر حاصل کرنا سخت معیاری مقام ہے حالانکہ یونیورسٹیوں میں تینتیس فیصدی نمبر حاصل کرنے والے طلبہ پاس سمجھے جاتے ہیں۔

نقشہ تعلیم سال بسال علامہ عثمانی مطابق روڈنارنگ

دارالعلوم دیوبند

۱۳۱۲ھ، ۱۸۹۴ء۔ از سورۃ الاحمد تا سورۃ النازعات امتحان دیا۔ نمبر

درج نہیں ہیں۔

۱۳۱۵ھ، ۱۸۹۷ء	۱۳۱۶ھ، ۱۸۹۸ء
۱۔ صفحۃ المصادر ۵۰	۱۔ بوستان ۲۰
۲۔ حکایات لطیف ۵۰	۲۔ انشائے بہارِ نجم ۲۰
۳۔ راہِ نجات ۵۰	۳۔ حسابِ کسور عام [۲۵
۴۔ پہاڑِ اسولہ تک [۵۰	یا اربعہ متناسبہ [۲۵
جمع تفریق بیض [۵۰	۴۔ املا فارسی ۲۵
۵۔ مفید نامہ ۳۶ ۲/۳	۵۔ مالا بد منہ ۳۵
۶۔ املا ۲۰	

۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء		۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء	
۵۰	۱- تحریر اقلیدس مقالہ اول	۴۸	۱- رقعات امان اللہ حسینی
۵۰	۲- حساب نفع نقصان		۲- کسور اعشار
۴۹	۳- احسن القواعد	۴۷	د جزر المربع
۴۹	۴- سکندر نامہ	۴۵	۳- انوار سہیلی باب اول
۵۰	۵- ابوالفضل و قزول	۴۲	۲- زینچا
۵۰	۶- صرف میر		۵- احسن القواعد
۴۷	۷- دستور المبتدی	۴۰	باب اول

۱۳۱۸ھ کی روداد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فارسی
آغاز تعلیم عربی کے ساتھ اسی سنہ میں آپ نے عربی بھی شروع
 کر دی تھی۔ چنانچہ صرف میر اور دستور المبتدی میں امتحان دیا ہے جو امتحان
 کی کتابوں کی فہرست میں موجود ہیں۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ
 میزان و منشعب کے بغیر صرف میر نہیں پڑھائی جاتی لہذا علم صرف عربی کی
 یہ ابتدائی کتاب کہاں پڑھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزان و منشعب
 پڑھی ہوگی لیکن امتحان نہیں نہ دیا ہوگا۔ یا خارج از جماعت پڑھ لی ہوگی۔
 ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۱۸ھ تک کے بارے میں مدرسین کے متعلق بھی یہ بتا دینا
 ضروری ہے کہ ان سالوں میں مولانا محمد حسین صاحب فارسی کے مدرس اول تھے
 اور منشی منظور احمد صاحب مدرس دوم۔ مؤخر الذکر فارسی کی ابتدائی کتابوں
 کے علاوہ حساب بھی پڑھاتے تھے۔

تقسیم تعلیم عربی از ۱۳۱۸ هجری تا ۱۳۲۵ هجری

۱۳۱۸ هجری ۱۹۰۰ ع	۱- صرف میر (علم الصرف) ۵۰	۲- میبذی (علم فلسفه) ۵۰
۱۳۱۹ هجری ۱۹۰۱ ع	۱- میزان منطق (منطق) ۵۰	۳- ملا حسن (منطق) ۵۰
	۲- قال اقول (منطق) ۵۰	۴- مستم العلوم (منطق) ۵۰
	۳- فصول اکبری (صرف) ۵۰	۵- میر قطبی (منطق) ۴۸
۱۳۲۰ هجری ۱۹۰۲ ع	۴- هدایة النحو (نحو) ۵۰	۶- محقق الحانی (علم معانی و بیانی) ۴۵
	۵- مصباح الصرف (صرف) ۵۰	۷- شرح وقایه (فقه) ۲۷
	۶- شرح مائتة عامل (نحو) ۵۰	۸- هدیه سعیدیه (فلسفه) ۱۷
۱۳۲۱ هجری ۱۹۰۳ ع	۱- شرح تهذیب (منطق) ۵۱	۱۳۲۲ هجری ۱۹۰۴ ع
	۲- اصول الشاشی (اصول فقه) ۵۱	۱- میرزا هدایت الله (منطق) ۵۱
	۳- ایسا غوجی (منطق) ۵۰	۲- نور الانوار (اصول فقه) ۵۰
	۴- قدوری (فقه) ۵۰	۳- مشکوة (علم حدیث) غیر حاضر
	۵- شرح جامی بحث فعل (نحو) ۵۰	۴- هدایه (فقه) غیر حاضر
	۶- کتزالدقائق (فقه) ۴۵	۵- میرزا آقا جلال (منطق) بیمار
۱۳۲۲ هجری ۱۹۰۵ ع	۱- قاضی مبارک (منطق) ۵۳	۱۳۲۳ هجری ۱۹۰۵ ع
	۲- حمد الله (منطق) ۵۳	۱- قاضی مبارک (منطق) ۵۳
	۳- صدرا (فلسفه) ۵۲	۲- حمد الله (منطق) ۵۳
	۴- میرزا هدایت الله (منطق) ۵۱	۳- صدرا (فلسفه) ۵۲
	۱- رشیدیه (علم مناظره) ۵۱	۴- میرزا هدایت الله (منطق) ۵۱
		۵- مسلم الشیوخ (اصول فقه) ۵۰

۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء -	۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء -
۱ - مقدمہ ہزری (قرأت) ۲۸	۱ - شمائل ترمذی (حدیث) ۵۱
۲ - عمل بالتجوید مع التدویر ۵۰	۲ - بخاری شریف (حدیث) ۵۰
۳ - جلالین (عربی تفسیر) ۵۱	۳ - ابن ماجہ (حدیث) ۵۰
۴ - مشکوٰۃ شریف (حدیث) ۵۱	۴ - ترمذی شریف (حدیث) ۵۰
۵ - ہدایہ اخیرین (فقہ) ۵۰	۵ - موطا امام مالک (حدیث) ۵۰
۶ - تصریح (علم ہیئت) ۴۵	۶ - موطا امام محمد (حدیث) ۵۰
۷ - شرح چغینی (ہیئت) ۴۱	۷ - بیضاوی شریف (تفسیر) ۵۰
۸ - سیح شاد (ہیئت) ۴۲	۸ - ابوداؤد شریف (حدیث) ۴۹
۲	۹ - نسائی شریف (حدیث) ۴۹
۲	۱۰ - مسلم شریف (حدیث) ۴۸

تجزیہ علوم و فنون

مذکورہ بالا تحصیل علم کے نقشوں سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فارسی، حساب، علم تجوید و قرأت، صرف، نحو، منطق، فلسفہ، علم معانی و بیان، ادب، فقہ، اصول فقہ، مناظرہ، ہیئت، حدیث اور علم تفسیر کے علوم و فنون دارالعلوم دیندہ میں داخل ہو کر حاصل کئے۔ اور ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۸ء میں درجہ فضیلت اول درجے (فرسٹ ڈوٹرن) میں پاس کیا جیسا کہ ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۸ء میں آپ کو تمام طلبہ میں نمبر اول ظاہر کیا گیا ہے۔

ہم سبقوں کی کلاس میں سب سے اول | نہ صرف یہ کہ آپ نے دورے میں درجہ اول کی پوزیشن حاصل کی بلکہ اس

سال دورہ حدیث میں ۹۹ فیصد نمبر لیکر اپنے تمام شرکائے درس اور کلاس کے طلبہ سے گویا سبقت لے گئے اور سب سے اول نکلے۔

علوم و فنون عربیہ کی کتابوں میں امتیازی نمبروں میں کامیاب ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا عہد تعلیم نہایت سنہری اور زریں عہد تھا اور آپ اپنے دور کے زہین، فطین اور قابل طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔

امتحانات کے نمبروں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سب سے زیادہ نمبر منطق کی سب سے مشکل اور آخری کتابوں یعنی حاشا اور قاضی غلامی میں اور فلسفے کی بلند پایہ کتاب صدرا میں علی الترتیب پچاس میں ترمین ترمین اور باون نمبر حاصل کئے ہیں۔ گویا علوم عقلیہ میں آپ کی ذہنی پرواز بہت بلند تھی اور عقلی قوتوں کے جوہر معقولات میں زیادہ چمکے نظر آتے ہیں۔ دوسرے درجے پر علم تفسیر اور حدیث میں ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔

عبد طالب علمی میں سلسلہ درس و تدریس | یہ خیر آج تک صحت اور حقیقت کے درجے میں شہرت رکھتی ہے کہ علامہ

عثمانی اپنے زمانہ طالب علمی میں بے تکلف قابل استادوں کی طرح اپنے ہم سبقوں اور نیچے کے طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۱۳ء کی سالانہ رپورٹ میں جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم مولانا شبیر احمد صاحب کے عہد طالب علمی میں پڑھانے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

”مولوی صاحب موصوف اس زمانے میں بھی جبکہ خود تحصیل علم میں مصروف

تھے طلبہ کو درس دینے میں اپنا بہت سا وقت صرف کرتے تھے۔ مفتی طلبہ تمام

علوم کی کتابیں آپ سے بے تامل پڑھتے تھے۔ (رونداد العلوم ص ۳۳۳) جناب مہتمم صاحب کے اس لفظ ”بے تامل“ نے مولانا عثمانی کے عہد تحصیل علم کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ مذکورہ عبارت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ منتہی طلبہ تمام علوم کی کتابیں علامہ کی اسٹوڈنٹ لائف میں ان سے پڑھنے کا عام رجحان رکھتے تھے۔ اور ان کے علم پر اس کم عمری اور طفلی میں اعتماد کرتے تھے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ان کی علمی قابلیت کا سکے سب کے دل پر بیٹھ چکا ہو۔

حضرت مولانا عہد الدین صاحب انصاری شیر کوٹی جو علامہ کے تحصیل علم کے زمانے سے ان کے دوست اور مخلص رفیق ہیں وہ اپنے ایک مکتوب میں راقم الحروف کو موصوف کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں :-

”قطبی اور میر تقی پڑھنے کے زمانے میں طلبہ کے اندر اپنے تمام جماعتوں سے نہ صرف ممتاز تھے بلکہ طلبہ کا بڑا، جو ہم بعد نماز عصر جمعہ کو مسجد میں صرف قطبی پڑھنے کے لئے ہوجاتا تھا۔ اور یہ مغرب تک ایسا درس دیتے جیسے ایک شخص اپنے مریدین میں ہو۔ تقریر اس قدر کرتے کہ طلبہ پر خاص اثر ہوتا۔ اس زمانے کے خاص طلبہ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی تھے جو میر تقی کے سبق میں شامل ہوتے تھے اور ان پر خاص کیفیت جذب اور وارفتگی طاری ہوتی تھی۔ انہی ایام میں المنورہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں امام مالک کا تذکرہ تھا۔ سید صاحب نے مضمون میں لفظ ”بغافہ جمع باغی کر کے عام معنی مراد لئے جس پر مولانا شبیر احمد صاحب نے گرفت کی اور معنی طالب لکھ کر اس الزام کو رفع کیا۔ شروع شروع میں معقولات (منطق فلسفہ) میں خاص شغف تھا۔ بہار کے مولانا عبدالوہاب معقولی دیوبند آئے مولانا اس وقت غلام محبتی پڑھا کرتے تھے۔ بہاری طلبہ نے ان کا

بہت احترام کیا اور وہ بھی معقولات میں اپنا ثانی کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ طلبائے دارالعلوم پران کی معقولیت کا خاص اثر ہو رہا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کو تفسیر و حدیث کی درسگاہ خیال کیا جاتا تھا۔ اور منطق و معقول کو یہاں کوئی مقام حاصل نہ تھا اور طلبہ بھی اس کو کچھ قابل اعتناء نہ سمجھتے تھے مگر معقولی صاحب اپنا اثر جبار ہے تھے چنانچہ ہم پران کا بڑا اثر پڑا۔ مولوی شبیر احمد صاحب کو بھی جو اس وقت طالب علم تھے ان کے سامنے لائے۔ ان سے یہ سن کرانی برداشت نہ ہوئی اور بحث شروع ہو گئی۔ طلبہ حیران اور معقولی صاحب بھی ”برہنہ گماں مبرکہ خالیست“ کے قائل نظر آئے۔ ”بعدیت زمانی اور بعدیت ذاتی“ میں ایسی بحث ہوئی کہ بہاری طلبہ دیوبند میں معقول کے قائل ہو گئے اور معقولی صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ آپ پھر سوچیں۔“

مولانا عماد الدین صاحب انصاری کا مکتوب علامہ کے تحصیل علم کے زمانے کی پوری بصیرت افروز تاریخ ہے جس سے وہ خود اپنے رفیق عثمانی کے ساتھ رہ کر لگے ہیں۔ اس خط سے موصوف کی زہانت، فطانت، لیاقت، استعداد اور جوہر علم کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ علمی ذوق و استعداد کی یہ بلند مقامی خدائے کریم کی دین ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عطا کرے ورنہ انصاری صاحب اسی خط میں مولانا عثمانی کی درس سے غیر حاضری اور بے پروائی کا چند لفظوں میں اس طرح اظہار فرماتے ہیں:-

”جماعت میں غیر حاضری عام معمول تھا۔ ہم زبردستی جماعت میں حاضری کے لئے بھیجتے۔ مفتوں سبق سے غیر حاضر رہتے مگر اس پر بھی یہ عالم تھا کہ امتحان میں سب سے اعلیٰ نمبر حاصل کرتے۔“

یہ ہے علامہ کی طالبانہ نہ زندگی کا خاکہ جس سے ایک صاحب فکر و نظر ان کے

اس دور کی پوری تصویر اپنے دماغ کے پردے پر کھینچ سکتا ہے جس کے بعد مزید اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دن بیت گئے | آپ کی طالب علمی کا زمانہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں ختم ہو چکا جو کبھی دوبارہ لوٹ کر آنا ناممکن تھا۔ اب تو اس

عہد ماضی کی یادیں رہ رہ کر آنے کا زمانہ آچکا تھا۔ خواہ کچھ بھی ہو نہ کہ نہ، عہد طفلی باقی رہتا ہے اور نہ عہد جوانی۔ طالب علمی کا زمانہ جوشا ہی زمانہ ہوتا ہے وہ انسانی زندگی کے دور کارزریں اور سنہرا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اگر غم ہوتا ہے تو صرف یہ کہ محنت و شوق سے علم حاصل کیا جائے۔ اور باقی دنیا کے تمام افکار و حوادث پر مٹھیاں بھر بھر خاک ڈال دی جائے۔ اس زمانے سے آگے گذر کر جیسے جیسے کی طرف منہ موڑ کر دیکھتے ہیں تو در سگا ہوں، کتب خانوں، بورڈنگ ہاؤسوں، مہنواؤں، ساتھیوں اور استادوں کی نوع بنوع اور رنگ رنگی یادیں، جواب خواب و خیال نظر آتی ہیں، دل بے قرارہ پر کچھ کے لٹکاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ پروفیسری، ڈاکٹری، میجسٹری، ججی اور گورنری پر لٹ مار کر مکتب کے ٹاٹ، سکول کی بنچوں اور کالج کے ڈیسکوں پر جا بیٹھیں اور عالم برزخ سے اپنے مشفق، مہربان، ہمدرد، لائق اور قابل اساتذہ کو واپس لاکر ان کے سامنے پھر زانوئے تلمذ تہ کریں اور عہد متانت اور دور فکر پر لٹ مار کر طالب علم بن جائیں اور لڑکپن کی یادیں تازہ کر ڈالیں۔

کجا است جہل جوانی و عہد برنائی

اے میرے زمانہ تحصیل علم کے ساتھیو! آؤ پچھلے لوٹ کر اس زمانے کو واپس لائیں جیسے ہم تم دارالکلیہ میں بیٹھ کر حوادث زمانہ سے بے خبر وقت عزیز کے سہانے لمحے گزار رہے تھے۔ جبکہ میں کانٹے پھول دکھائی دیتے تھے اور خزاں بہار نظر

آتی تھی۔ آہ ! اے مافی تو کتنا بے وفا ہے کہ میں حال اور مستقبل کے مضبوط
چھندوں میں پھانس کر روانہ ہو گیا۔ آج ان مہر و وفا سے لبریز لمحوں کو یادیں
ترستی ہیں لیکن ان کا بول ایک لمبی اور سرد آہ کے سوا کچھ نہیں۔ اب تو صورتِ
حال یہ ہے ۔

ہر اشک ہے افسانہ ہر درد کہانی ہے
لے لے کے یہی باقی حسرت کی نشانی ہے

اے میرے ہمدرد ! تم کہاں ہو۔ کس کار و بار زندگی میں مصروف ہو۔ تم
اس مہر و وفا، صدق و صفا اور لطف و محبت کی بستیوں کو اجاڑ کر کن دیرانوں کو
زینت زندگی بنا چکے ہو۔ میرے سینے میں دل بے تاب بے ساختہ پکاراٹھا ہے ۔
ہم نفسو ! اجر گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہل دل مہر و وفا کو کیا ہوا

اے دارالعلوم دیوبند کے متوسط دور کے فرزندو ! وہ دیکھو دارالحدیث
میں سرما کے دنوں میں سبز چوغہ اور سر پر سبز عمامہ باندھے ایک خضر صورت فرشتہ
سیرت علوم و فنون کے بحرِ ناپید کنار بیٹھے ہیں آبِ حیات کے چشمے بہا رہے ہیں اور گردِ گنبدِ ظل
پیاسے سکندر بیٹھے ہیں لیکن کوئی محروم نہیں یہ اپنے زمانے کے امام ہیں جنہیں مولانا
سید محمد انور شاہ کہتے ہیں۔ اور وہ دیکھو شام کا دوسرا گھنٹہ ختم ہو چکا ہے اور اسی
دارالحدیث سے امام کلام و تفسیر ابنِ عباس کی طرح علم و فضل کی بارش برساتا ہوا
جس کی طلاق لسانی پر عمل و گہرِ نثار ہوتے تھے مسلم کا درس دیکھنے کے آہے ہیں ۔
داہنے ہاتھ میں چھڑی ہے اور بائیں ہاتھ میں رومال کس ثقہ رفقا سے اپنے گھر کی طرف
روانہ ہو رہے ہیں۔ راستے میں طلبہ کی صفوں کی صفیں اس کے احترام میں بندھتی چلی
جاتی ہیں اور مین و دیوار کھڑے ہو کر سلام عقیدت پیش کر رہے ہیں یہ اپنے دور کے تحقق

علامہ شبیر احمد عثمانی ہیں۔ اور وہ دیکھو اسی دارالحدیث میں ایک اللہ کا ولی عجب انداز اور اطوار سے جاتا ہوا دکھائی دیا ہے۔ یہ فرشتہ سیرت اور انسان صورت میاں سید اصغر حسین صاحب ہیں جو ابوداؤد شریف کا درس سیدھے سادے الفاظ اور میٹھی اور پیاری گفتار میں دے رہے ہیں۔ اور گزرتے گزرتے میرے سامنے مفتی عتیق الرحمن کی جے کہتے ہوئے اور جیلے پر مسکاتے ہوئے، ہاتھ میں ایک ٹنڈا لئے عجب انداز سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ دارالافتاء کی طرف بھی دیکھو یہ وہی آسمان سے آیا ہوا فرشتہ شامی، درمختار، ردالمحتار، غایۃ الاوطار، فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ عالمگیری کے ڈھیر سامنے رکھے فتوے لکھ کر ہو العزیز الرحیم کے لفظوں کی کندہ مہر لگا رہا ہے۔ یہ وہی مقدس انسان ہے جس کا ذکر چند ورق پہلے گزر رہا ہے جنہیں مفتی عزیز الرحمن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور نذرانے پر چڑھ کر کوٹھی کے سامنے گزرو ایک نحیف الجشتہ مگر علم، سیاست، فراست، دانش کے مجسمہ تالین پر بیٹھے ہوئے گردن جھکائے مصروف نظر آتے ہیں۔ اور دارالعلوم کے نظم و نسق میں محو بہم تن وقف ہیں انہیں مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کہتے ہیں۔ فارغ ہو کر کہیں جاتے ہیں تو ہاتھ میں تسبیح گھوم رہے ہیں اور زبان پر ذکر اللہ جاری ہے۔ اور وہ دیکھو کوٹھی سے گزرتے ہوئے ذرا آگے بڑھ کر ایک پتلا دبلا انسان اپنے حجرے میں بیٹھا مشکوٰۃ شریف کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ سامنے چائے کا سماوار گرم ہو رہا ہے۔ ابوالکلام مرحوم کے بعد چائے پینے اور پلانے کا صحیح حق انہیں حاصل ہے۔ منہ میں پان ہے اور چہرے پر ظرافت کی چھلچھڑیاں چھوٹ رہی ہیں، اردو فارسی کے ادیب ہیں، شاعر بھی ہیں۔ مشکوٰۃ شریف کے پڑھانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ یہ مولانا سراج احمد صاحب ہیں۔ دررے کے بڑے گیٹ سے ایک استاد علم معانی و بیان اندر داخل ہو رہے ہیں در سگاہ کی

طرف رخ ہے اور مختصر معانی، تلخیص اور مطوّل پڑھاتے پڑھاتے طلبہ پر جادو کر رہے ہیں۔ جو کچھ پڑھاتے ہیں دل میں بٹھا دیتے ہیں۔ دس دفعہ سوال کرو تو گھبراتے نہیں۔ ایک طالب علم حد سے زیادہ شکوک پیش کرتا ہے اس کا نام ملاشنگی لکھ دیا ہے۔ ان کی تقریر سے درس گاہ گونجتی ہے اور دل کی گریں کھلتی چلی جاتی ہیں یہ مولانا عبدالسمیع صاحب ہیں۔ ابھی ابھی دارالعلوم کے باہر دروازے پر لپکا رکا ہے۔ کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق ساتھ ہیں، قادیانیوں، اہل حدیثوں اور بدعتیوں سے مناظرے کر کے آ رہے ہیں۔ مناظرے کے امام ہیں، چھوٹا قد سفید داڑھی تین ان کو داد کہا کرتا تھا۔ سفرو حضر میں جماعت سے نماز کے بے حد پابند، دلائل الخیرات کے زبردست عامل، طبیب خوش مزاج، مریض کو باتوں اور ظرافت آمیز چٹکوں سے اچھا کر دینے والے۔ یہ ہیں مولانا تفتیٰ حسن صاحب چاند پوری۔ مناظرے کی جو کتاب چھپوائے خواہ کتنی موٹی اور قیمتی کیوں نہ ہوتی میں زبردستی اٹھا کر چلا آتا۔ چلاتے رہ جاتے لیکن میرے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ آخری دفعہ غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں بس جالندھر میں ملاقات ہوئی اور پھر محروم دیدار رہا۔ ابھی ذرا اور ٹھہرو دیکھو وہ نودہرے کے کمرے میں دیوار سے مکر لگائے نہایت مناسبت سے حمد اللہ اور قاضی خاں کے نکتے حل کرنے والے ایک زبردست معقولی اور اپنے زمانے کے منطق کے امام ہیں۔ شاہ نہ دماغ ہے جی میں نہیں آتا تو کئی کئی وقت پڑھانے کا نام نہیں لیتے لیکن جو پڑھاتے ہیں وہ سونے پر سہلگے کا کام دیتا ہے۔ بے حد شفیق، نہایت مدبر، جہان نواز اور مردم شناس ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ایک ہفتہ میں ان کی خدمت میں ٹھہرا۔ یہ ہیں میرے استاد محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ اسی درس گاہ کے ایک کمرے میں ایک فلسفے کا محقق مصروف درس ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر تقریر کرتے ہیں۔ غضب کے ذہین ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین محقق طوسی بول رہا ہے۔

کہیں کوئی اعتراض کر بیٹھو تو ان کی زبان سے بڑا نفخس سننے میں وہ مزہ آتا ہے کہ جاگیروں کے پانے میں وہ مسرت نصیب نہیں ہوتی یہ مولانا رسول خان صاحب ہیں جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں فیض پینچا رہے ہیں۔ اور ابھی ذرا اور ٹھہرو وہ دیکھو مسجد میں اذان ہو چکی ہے ایک بار عجب ہستی اپنی درسگاہ سے متنبی اور حماسہ کے حواشی لکھتا لکھتا نماز کے لئے جا رہا ہے۔ راستوں میں بچتے بچاتے بڑی تیزی اور سہرتی سے السلام علیکم السلام علیکم کہتا ہوا رواں دواں ہے۔ چہرے پر حلال ٹپک رہا ہے۔ جدھر سے نکلتے ہیں طلبہ سہم جاتے ہیں۔ اپنے زمانے کے ادب و فقہ کے ماہر ہیں۔ آخری بار ۱۹۵۲ء میں جمعیتہ الطالبہ کے کمرے میں قیام پذیر تھے جدت میں حاضر ہوا بہت خوش ہوئے۔ بعض شاگرد پاؤں دبا رہے تھے میں بھی فسطیہ مسرت سے دبائے لگا۔ اگرچہ میں خود پروفیسر تھا لیکن استاذ محترم کے پاؤں دبائے وقت اپنے آپ کو وہی طفلِ مکتب تصور کر رہا تھا۔ یہ شیخ الادب مولانا اعجاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

آہ! ان ہستیوں کی یاد جب آتی ہے تو دل لوٹ جاتا ہے اور پیروں بے قرار رہتا ہے۔ ان میں سے بعض سلامت ہیں خدا انہیں سلامت رکھے اور اکثر دنیا سے گذر چکے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کی بارشیں برساتے۔

میں جذبات کے سمندر میں بہتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ذکرِ برسرِ مطلب علامہ عثمانیؒ کے عہدِ تعلیم کے دن بیتِ جانے کا تھا کہ طالبِ علمی کے زمانے کی وہ سہانی گھڑیاں لوٹ کر آنا ناممکن تھیں جو گذر گئیں، اب علامہ متعلم سے معلم بن چکے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں یہاں آپ کے اساتذہ سے تعارف کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ سوانح نگاری کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔

اساتذہ

آپ کے اساتذہ میں ابتداء سے آخر تک جو حضرات شامل ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں :

حافظ محمد عظیم صاحب دیوبندی جن سے بسم اللہ ہوئی۔ حافظ نامدار صاحب جن سے آپ نے قرآن کریم پڑھا۔ منشی منظور احمد صاحب مدرس دوم شعبہ فارسی و حساب جن سے حساب سیکھا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ حساب میں آپ کی مہارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مطبع قاسمی میں ایک شخص نے آپ سے کسی مرنے والے کی جائداد اور سامان کے فرائض نکلائے تو آپ نے اسی وقت بیٹھے تمام حصص نکال کر تمام وارثوں کے حق میں بتعین کر دیئے جس سے آپ کی حسابی معرفت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ البتہ مولانا محمد حسین صاحب دیوبندی نے آپ کو فارسی کی اعلیٰ کتابیں پڑھائیں۔ لیکن عربی علوم و فنون کی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے کے اساتذہ میں وہی حضرات ہو سکتے ہیں جو ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں بحیثیت پروفیسر فرائض انجام دیتے تھے۔ ان حضرات کے اسماء گرامی دارالعلوم کی ۱۳۲۰ھ کی رپورٹ کے مطابق حسب ذیل ہیں :

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، مولانا محمد حسین صاحب شیرکوٹی، مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی، حکیم محمد حسن صاحب برادر اصغر شیخ الہند، مولانا غلام رسول صاحب (صوبہ سرحد)، مولانا ترقی حسن صاحب چانڈپوری، مولانا گل محمد خان صاحب اور مولانا محمد احمد صاحب جو کاراہتمام مدرسہ کے علاوہ تعلیم دینے کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ علم تجوید و تفسیر تباری عبد الوحید صاحب الہ آبادی مدرس دارالعلوم شعبہ قرأت سے حاصل کیا۔

مذکورہ بالا تمام حضرات مولانا گل محمد خان صاحب کے علاوہ حضرت عثمانی کے اساتذہ تھے۔ مولانا عماد الدین صاحب انصاری شیرکوٹی نے اپنے ایک مکتوب ۲۱ نومبر ۱۹۵۹ء میں میرے اس سوال کے جواب میں کہ علامہ کے اساتذہ کون کون تھے حسب ذیل تحریر روانہ فرمائی، میں وہ تفصیل و ارقامین کے سامنے پیش کرتا ہوں اور یہ بھی کہ کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں۔

۱۔ مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے :- ترمذی شریف، بخاری شریف، بیضاوی، ہدایہ اخیرین، توضیح تلویح۔

۲۔ مولانا غلام رسول صاحب سے :- شرح جامی، مختصر المعانی، مطول، منطق، فلسفہ الہیات، عروض کی کتابیں، بعض ادب کی کتابیں۔

۳۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے :- جلالین شریف، مسلم شریف۔

۴۔ مولانا محمد حسین صاحب شیرکوٹی سے :- کافہ، تفسیر، شرح چغسنی،

سبقت شاد۔ (آپ نے ان کی ذہانت کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ تمہیں کافہ

پڑھاؤں گا۔ خارج وقت مدرسہ میں پڑھاتے تھے)۔

۵۔ مولانا محمد سہول صاحب سے :- کتب صرف و نحو و ابتدائی کتب منطق۔

۶۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب سے :- کنز الدقائق، شرح وقایہ۔

۷۔ مفتی عزیز الرحمن صاحب سے :- درنختار، دآرمی، سنن نسائی۔

۸۔ حافظ محمد احمد صاحب بہتم سے :- مشکوٰۃ شریف۔

مذکورہ بالا تفصیل میں علامہ کے واقف حال مولانا انصاری نے مولانا سہول

صاحب کو بھی اساتذہ کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ لیکن مدرسہ کی رپورٹ میں

مولانا عثمانی کے عہد تعلیم میں مولانا سہول صاحب کا نام کہیں درج نہیں۔ مگر یہ

ضرور ہے کہ مولانا سہول صاحب کئی سال دارالعلوم میں پڑھایا کئے ہیں اور جو

قابل اساتذہ میں سے ملنے گئے ہیں۔

حضرت مفتی عزیز الرحمنؒ سے درمختار اور دارمی کی تعلیم کا بھی مولانا عابد الدین صاحب نے ذکر کیا ہے، غالباً خارج میں پڑھی ہوں گی یا ان دونوں کا امتحان نہیں دیا گیا ہوگا جس کی وجہ سے سالانہ رپورٹوں میں ان کتابوں کا اندراج نہیں ہے۔ اساتذہ کی مذکورہ تفصیل کے بعدم قارئین سے علامہ کے بڑے بڑے اساتذہ کا تعارف کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ وہ علماء اور شیوخ ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے علم و فضل میں یگانہ روزگار تھا۔

آپ کا اسم گرامی محمود حسن اور
۱۔ شیخ الهندية الشافعية ۸۵۲ھ سے ۹۲۱ھ تک
 لقب شیخ الهند تھا جو تحریکِ خلافت

کے زمانے میں قوم کی زبان سے نکلا اور مشہور ہوا۔ آپ کے والد محترم مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبند کی صاحبِ وجاہت ہستیوں میں سے ایک تھے۔ خاندان عثمانی سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر مامور رہے اور پھر نیشن لینے کے بعد دارالعلوم دیوبند کی زبردست خدمات انجام دیا کئے۔ متنبی، حماسہ، قصیدہ بُردہ، قصیدہ بانٹ سعاد، سب سے متعلقہ کے بہترین شائع گذرے ہیں۔ ہم نے تذکرہ علمائے دیوبند کی پہلی جلد جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا فضل الرحمن صاحب والد محترم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ذوالفقار علی صاحب پر مشتمل ہے، مؤخر الذکر پر موطا مقالہ لکھا ہے۔ جو ان کی تمام علمی و عملی زندگی کو بقدر ضرورت حاوی ہے۔ شیخ الهند انہی کے نامور فرزند تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے

پہلے طالب علم تھے۔ ۱۳۶۸ھ (۱۸۵۳ء) میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم ہی میں تمام عربی تعلیم حاصل کی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاص طور پر علم کا استفادہ کیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے بھی حدیث پڑھی ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۵ء) میں دارالعلوم کے مدرس بنائے گئے۔ ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) میں صدر مدرس یا شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۳۲۳ھ (۱۹۱۵ء) میں سفر حجاز اختیار فرمایا۔ ان دنوں میں جنگ طرابلس کے بعد جرمنی اور ترکی متحد ہو کر برطانیہ سے نبرد آزما تھے۔ شیخ الہند نے برطانیہ حکومت کا ہندوستان سے تختہ الٹنے کے لئے ایک زبردست پروگرام بنایا تھا جن کی تفصیلات ”سفرنامہ شیخ الہند“ مصنفہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ میں ملیں گی۔ جب آپ مکہ معظمہ پہنچے اور مدینہ میں قیام کے بعد پھر مکہ معظمہ کو واپس ہوئے تو قیام مکہ کے دوران میں شریف حسین والی مکہ معظمہ نے آپ کو انگریزوں کے اشارے پر گرفتار کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ تاآنکہ آپ کو مالٹا میں اسیر کر دیا گیا۔ چار سال تک وہاں نظر بند رہ کر اور پھر رہا ہو کر ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کو آپ بمبئی پہنچے۔ یہاں پہنچ کر تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ لیکن عمر نے زیادہ وفانہ کی اور ۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) کو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر دہلی میں وفات پائی۔ جنازہ دیوبند لایا گیا اور وہاں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ میں نے

حکیم محمد حسن صاحب

صرف ان کو دیکھا ہے بلکہ طب کی کتابوں میں موجز اور سیدی اور فقہ میں ہدایہ اخیرین کے کچھ اسباق پڑھے ہیں طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ گھوڑے کی سواری اور شکار کے بہت شوقین تھے۔ ایک دفعہ گھوڑی سے گر گئے اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بڑی مشکل سے بڑی جبرٹی اور چلنے پھرنے

کے قابل ہوئے۔ اپنے محلے کی مسجد میں بلا لیتے اور وہیں سبق پڑھاتے۔ روزانہ سبق کا ہونا ان کے یہاں مشکل تھا کوئی ہفتہ پورا سبق پڑھانے میں گذر جاتا تو یہ اس ہفتے کی خوش قسمتی تھی۔ سبق پڑھاتے وقت حواشی پر نظر رہتی تھی۔ حواشی دیکھتے جاتے اور پڑھاتے جاتے تھے۔

چونکہ عمر میں تقریباً اساتذہ دارالعلوم سے بڑے تھے پھر شیخ الہندؒ کے چھوٹے بھائی اور مزید برآں یہ کہ مولانا ذوالفقار علی کیے ازبانیان دارالعلوم کے صاحبزادے تھے اس لئے ہتم صاحب سے لیکر ادنیٰ مدرس تک سب ہی ان کے سامنے لپکتے تھے۔ مدرسے کے مقررہ طبیب تھے اور مدرس بھی۔ فن طب میں بھی مہارت رکھتے تھے، جس کو باقاعدہ دہلی میں پڑھا تھا۔ اس لئے تمام طلبہ عموماً ان کے حال کو کنسیر لکھواتے۔ نسخہ پر جس طالب علم کی سفارش فرماتے اس کے پیسے مدرسہ ادا کرتا تھا۔ ہتم صاحب بھی بے چون و چرا منظوری دیدیتے۔ اگر کبھی کوئی طالب علم مایوس ہوتا تو آپس کا پارٹ لیتے تھے۔ طلبہ سے بہت ہمدردی فرماتے۔ ٹانگ ٹوٹنے سے پہلے مدرسے بھی آتے اور وہاں بھی پڑھا دیتے تھے۔ غالباً ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ انتقال فرمایا۔ صحیح سن یاد نہیں رہا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

مولانا محمد حسین صاحب شیرکوٹیؒ | راقم السحرون کے ہوطن شیرکوٹ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم کے جید علماء میں سے تھے خصوصاً علم ہیئت میں کمال رکھتے تھے۔ نہ صرف ظاہری علوم کے عالم تھے بلکہ باطنی علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ تصوف سے ذوق و شوق رکھتے اور بزرگ سیرت انسان تھے۔ زہد و عبادت میں زندگی گذارتے۔ آپ کے والد محترم حضرت مولانا محمد ہادی صاحب شیرکوٹ کے اولیاء میں سے تھے۔

مولانا محمد حسین صاحب دیوبند کے ہی فارغ التحصیل تھے۔ بعض مدارس مثلاً رڑکی وغیرہ میں مدرس رہے، اور پھر آپ کو دارالعلوم میں بلا لیا گیا۔ یوں تو تمام علوم میں قابل تھے لیکن ہیئت اور ریاضی میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے واپسی میں جدے میں طاعونی بخار ہوا اور اسی میں ماہ صفر ۱۳۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات یغفرلہ سے نکلتی ہے۔

مولانا غلام رسول صاحب | آپ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ علوم عقلیہ منطق و فلسفہ میں کمال رکھتے تھے۔ ۹ سوال

۱۳۱۵ھ کو مجلس شوریٰ دارالعلوم نے بحیثیت مدرس فلسفہ میں روپیہ ماہوار پر تقرر کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱ سوال ۱۳۱۵ھ کو دارالعلوم دیوبند کے دفتر سے رات کے گیارہ بجے ایک خط مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کو لکھا تھا جو ان دنوں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خانقاہ میں مقیم تھے۔ یہ مکتوب علامہ عثمانی مرحوم کے یہاں کراچی میں میری نظر سے گزر احسن کی میں نے بعینہ نقل حاصل کر لی۔ یہ لفافہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا چھوٹا سا تڑکا ہے جو ۵ مارچ ۱۸۹۸ء کو دیوبند کے ڈاکخانے سے روانہ ہوا۔ اس میں شیخ الہندؒ لکھتے ہیں :

”پرسوں اہل شوریٰ نے فلسفہ کی مد میں مولوی غلام رسول کو بمشاہدہ

میں روپیہ ماہوار مقرر کیا ہے اللہ انجام بخیر کرے اور مدرسین بد دل

ہو رہے ہیں“

علامہ عثمانی اکثر مجلسوں میں ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے حجرے

میں رہا کرتے تھے۔ اکثر علامہ عثمانی کو مدرسے سے جاتے جاتے اپنے ساتھ لے جایا

کرتے اور وہاں جا کر خود بھی چائے پیتے اور آپ کو بھی چائے پلاتے، اور خارج اوقات میں بھی پڑھاتے۔

علمائے دیوبند میں مولانا عثمانی اور ان کے معاصرین تقریباً سب ہی ان کے شاگرد تھے۔ بہت شفیق، نرم دل، سنت کے متبع، قناعت پسند تھے۔ بائیس سال تک دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس قیام فرمایا اور آپ کی ذات سے علوم کے وہ چشمے چھوٹے جن سے تشنگانِ علوم اپنی پیاس بجھائی۔ ۱۸ محرم الحرام ۱۳۳۴ھ کو آپ نے دنیا سے فانی سے کوچ کیا۔

آپ کی وفات نے علمائے دیوبند کو سخت متاثر کیا۔ علماء اور طلبہ نے آپ کے غم میں بہت سمرٹے لکھے۔ خصوصاً مولانا حبیب الرحمن صاحب کا عربی مرثیہ جو مولانا مرحوم کے اخلاق و خصائل اور فضائل پر مشتمل ہے۔ نیز مولانا اعجاز علی صاحب کے دو مرثیے ایک عربی میں اور دوسرا اردو میں، اور ایک مفتی محمد شفیع صاحب کا عربی میں قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی وفات کا تذکرہ اور مرثیے القاسم ماہ صفر ۱۳۳۴ھ اور القاسم اربع الاول میں شائع ہوئے ہیں۔

استاذ محترم مولانا اعجاز علی صاحب القاسم ماہ صفر ۱۳۳۴ھ میں تحریر فرماتے ہیں :-

”اب تک وہائی مرض کا نام و نشان بھی دیوبند میں نہ تھا کہ خدا جانے مولانا (غلام رسول صاحب) کو یہ خیال کس طرح پیدا ہو گیا کہ ہمارا وقت قریب آگیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی آپ نے اپنے تمام شاگردوں سے ان کے حجروں، گھروں پر جا کر وعدے لئے کہ ہم مرجائیں گے تو کتنے فستق پڑھ کر ہم کو ثواب پہنچاؤ گے۔ چنانچہ سب نے اپنی اپنی حیثیت کے موافق وعدے کئے۔ ان کو اعیاد و موافقی پر زیادہ زمانہ گزرنے نہ پایا تھا

کہ آپ مرض وبائی میں مبتلا ہوئے۔ جب تک آپس قابل رہے کہ طلبہ آپ کی بغلوں میں ہاتھ دیکر آپ کو جائے قیام سے لے جاتے اور صف نماز میں شریک کر دیتے تھے تب تک آپ نے کوئی نماز بغیر جماعت کے ادا نہ کی۔ وفات سے دو روز قبل بغم کی زیادتی سے آپ کی بات سمجھ میں آنا دشوار ہو گئی..... حضرات مدرسین و طلبہ دارالعلوم نے جس سرگرمی سے تیمارداری کی وہ ان کے دلوں کی محبت کا حال بتاتی تھی۔ آخر کار انسانی ضعیف کوششوں پر تقدیر غالب آئی اور ۱۸ محرم ۱۳۳۶ھ کو آپ نے قبل از طلوع صبح صادق داعی اجل کو لبیک کہا۔

(القاسم ماہ صفر ۱۳۳۶ھ ص ۱)

مولانا سید ترقی حسن صاحب چاند پوری | چھوٹا قد، منحنی جسم، سفید ریش، سر پر محمودیہ ٹوپی،

سادہ لباس، بہت زیادہ ظریف لطیف، جاڑوں کے دنوں میں چمڑے کے موزے اور صاف، صحت پر بہت محتاط، چاند پوری ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے دیوبند کے فاضل تھے۔ دیوبند میں پڑھاتے رہے۔ بعد ازاں مراد آباد کے شاہی مسجد کے مدرسہ اور درجہ نگہ میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۲۰ء (۱۳۳۹ھ) میں پھر دارالعلوم میں ناظم تعلیمات اور مناظر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ میں نے ان سے سنن نسائی کے چند اسباق پڑھے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد دارالعلوم کی فضا ان کے لئے سازگار نہ رہی اس لئے علیحدہ ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد غالباً ۱۹۵۰ء میں چاند پوری میں انتقال فرمایا۔

مولانا حافظ محمد احمد صاحب | آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب
بانی دارالعلوم کے صاحبزادہ تھے۔

۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم
گلاؤٹی ضلع بلندشہر میں مولانا عبداللہ انیسوی سے حاصل کی۔ بعد ازاں مدرسہ
شاہی مراد آباد میں مولانا قاسم العلوم کے شاگرد رشید مولانا احمد حسن صاحب
سے پڑھائے۔ پھر دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند سے منطق اور ادب کی کتابیں
پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب محدث دارالعلوم دیوبند سے ترمذی
کے کچھ اسباق پڑھے اور بعد ازاں مرکز علماء و طلباء میں بھیج کر مولانا رشید احمد
صاحب گنگوہی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں دیوبند
میں مدرس ہوئے۔ ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) میں مولانا گنگوہی نے جو سرپرست
مدرسہ تھے آپ کو مدرسہ کا اہتمام سپرد کیا۔ آپ کے دور اہتمام میں مدرسہ کو
چار چاند لگ گئے۔ اور ہر شعبہ میں کافی ترقی ہوئی۔ آپ کا دبیر مدرسہ اور شہر میں
مشہور تھا۔ سب طلبہ اور مدرسین آپ سے مرعوب تھے۔ ۱۹۲۳ء (۱۳۴۱ھ)
میں مفتی اعظم کے عہدے پر حیدر آباد دکن میں مامور رہے۔ ۱۹۲۶ء میں وہاں
سے پھر دارالعلوم میں تشریف لے آئے۔ ۱۹۲۹ء (۱۳۴۶ھ) میں شہرت گرم ہوئی
کہ نظام حیدر آباد دہلی تشریف لارہے ہیں اس لئے آپ ان کو دیوبند آنے کے
لئے دعوت دینے کی خاطر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ بیماری
ہی میں دیوبند واپس ہونے کی رائے ہوئی لیکن ابھی نظام آباد کے اسٹیشن پر
گاڑی پہنچی تھی کہ حدود دکن میں ۳۰ جمادی الاول ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) کو انتقال
فرمایا۔ نظام صاحب کو خبر دی گئی۔ انہوں نے جنازہ حیدر آباد لانے کا حکم
دیا۔ اگلے روز عصر سے کچھ پہلے ”خطہ صالحین“ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دئے

گئے۔ آپ نے بنیالیس سال تک دارالعلوم کی خدمات انجام دیں۔ پہلے دس سال بسلسلہ تعلیم و تدریس اور بقیہ پچیس سال بحیثیت مہتمم۔

حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کا ذکر خیر آغاز کتاب میں آچکا ہے اس لئے یہاں دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں وہاں ملاحظہ سے گذر چکا ہے۔

اساتذہ سے فارغ ہو کر اب ہم قارئین کرام کو **تعارف دارالعلوم** علامہ شبیر احمد عثمانی کے مرکز تعلیم اور مادر علمی

کے حالات سے بھی روشناس کرانا نہایت ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر آپ کے سوانح زندگی و علمی نامکمل رہ جائیں گے اس لئے نہایت ہی مختصر سے تعارف کے لئے دارالعلوم کا تذکرہ چھیڑتے ہیں جس کی تفصیلات ہمارے ”تذکرہ علمائے دیوبند“ میں پڑھئے۔ یہ وہی دارالعلوم ہے جس میں راقم الحروف نے سوال ۱۳۲۳ھ سے شعبان ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) تک سات سال دارالعلوم میں زندگی کے بہترین لمحے طلب علم میں گزارے۔ ہم اپنی اور حضرت عثمانی کی اس مایہ صد افتخار درس گاہ اور اسلامی یونیورسٹی کے تعارف کے لئے اپنے قلم کی باگ ”تاریخ دیوبند“ کی طرف موڑتے ہیں۔

علامہ کی مادر علمی

دارالعلوم دیوبند

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۸۶۷ء یوم پینشنبہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ مبارک و مسعود دن تھا جس میں انتہائی بے سرو سامانی کے ساتھ صرف ایک طالب علم ”شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ“ اور ایک استاذ ”حضرت ملا محمود صاحب“ سے چھٹہ کی تاریخی مسجد کے کھلے صحن میں قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی قیادت و رہنمائی اور حضرت حاجی عابد حسین، حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ، اور حضرت مولانا فضل الرحمن رحمہم اللہ جیسی برگزیدہ شخصیتوں کے تعاون اور مشورہ سے اس درس گاہ کا آغاز کر دیا گیا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یہ معمولی درس گاہ دنیا کے اسلام کا مقبول ترین دارالعلوم سمجھا جانے لگا! اور ہندوستان کے دہ دراز علاقوں سے گذر کر مختلف ممالک اسلامیہ کے طالبان علم بھی جوق در جوق اسلامی علوم و فنون کی طلب و تحصیل کے لئے اس میں جمع ہو گئے اور مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے دارالعلوم کا صحن معمور نظر آنے لگا۔

پہلے سال کے اختتام پر طلباء کی تعداد ۷۸ تک پہنچ گئی! جن میں دیوبند اور اس کے قرب و حوالہ کے علاوہ متعدد دور دراز مقامات مثلاً بنارس، پنجاب، اور افغانستان کے ۵۸ طلباء شریک تھے طلباء کے اضافہ کے ساتھ مدرسین کا اضافہ بھی ناگزیر تھا! چنانچہ آخر سال میں ۴۴ مدرس اور بڑھائے گئے حضرت

مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ کو صدارت تدریس تفویض کی گئی :

دارالعلوم کی روز افزوں ترقی | دارالعلوم کا تعلیمی اٹھان شروع
ہی سے بہت بلند اور نتیجہ خیز رہا ہے۔

ابھی اس نے اپنی عمر کی دوسری ہی منزل طے کی تھی کہ اس میں ایسے طلباء تیار ہو گئے، جو تدریسی خدمات سرانجام دے سکتے تھے ! چنانچہ دارالعلوم کے ایک فاضل طالب علم سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم میں مدرس مقرر کئے گئے ! طلباء کی تعداد پہلے ہی سال میں حیرت انگیز طور پر ۸۷ ہو گئی تھی ! جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ اور چند ہی سال میں چھتہ کی مسجد جس میں دارالعلوم کا آغاز ہوا تھا ! ناکافی ثابت ہونے لگی اس لئے اولاً جامع مسجد میں جو اسی زمانے میں تعمیر ہو رہی تھی قدیم مدارس کے طرز کے مطابق دالان اور حجرے بنائے گئے جس میں ۱۲۹ مسجد میں دارالعلوم منتقل کر دیا گیا۔ مگر بہت جلد ہی یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی، تو قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتوی نے دارالعلوم کے لئے آبادی سے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت کی تجویز پیش کی یہ تجویز عام طور پر پسند کی گئی اور اس کے لئے چند بیونا شروع ہو گیا۔

کئی دن کے گشت و انتخاب کے بعد زمین کا ایک قطعہ جو دیوبند کے شمال و مغرب میں چھتہ کی مسجد کے قریب تھا خرید لیا گیا۔ یہ جگہ آبادی سے ملحق ہونے کے باوجود ایسی تھی جس میں دارالعلوم کے بڑھنے کے لئے کافی گنجائش تھی۔

۲ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ (۱۸۷۶ء) کو جمعہ کے دن جلسہ عظیم انعام سنگ بنیاد | کے بعد دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ پہلی

اینٹ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ نے نصب فرمائی پھر ایک ایک اینٹ حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت حاجی عابد حسین اور مولانا محمد منظر

صاحب کا نڈھلوی نے رکھی اور اس وقت دیوبند کے جوانب و اطراف کا بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ سب لوگوں نے نہایت خضوع و خشوع اور الحاح و زاری کے ساتھ دارالعلوم کی بقاء کے لئے دعا کی حضرت نانوتوی نے منبر مایاکہ :

”عالم مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق بانڈی کے مانند ہے جب

تک اس کا مدار توکل علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا“

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے تاریخ تعمیر کا مادہ ”اشرف عمارات“

سے نکالا۔ ”اشرف عمارات“ کے اعداد بحساب اسجد ۱۲۹۳ آتے ہیں۔ سنگ بنیاد

۲ رزی الحج ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۶ء) کو رکھا گیا تھا۔ مگر چونکہ تعمیر کا کام سال آئندہ

میں شروع ہوا اس لئے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) کو آغاز تعمیر قرار دیا گیا ہے۔ پانچ سال

کی مدت میں یہ عمارت ”نودرہ“ کے نام سے بن کر تیار ہوئی؛ اس کے دو درجے

ہیں اور ہر ایک درجہ میں نو نودرہ وازے ہیں، دارالعلوم کی یہ سب سے پہلی عمارت

ہے اس کی تعمیر نہایت سادہ مگر پرکار اور شاندار ہے۔ حضرت مولانا رفیع الدین

صاحب جن کے زمانہ اہتمام میں نودرہ تعمیر ہوا، تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں

سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کا نقشہ من جانب اللہ قلوب میں

الہام ہوا تھا :

خود حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نے نودرہ کی تعمیر شروع ہونے

سے قبل خواب دیکھا کہ :

”اس مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں۔ اور فرما

رہے ہیں کہ ”یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے“ یہ فرما کر خود عصائے مبارک

سے ایک طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے

چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد رکھ دو اگر تعمیر شروع کرائی گئی“

اس احاطہ میں وہ کنواں ہے جو نودرہ کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ یہ کنواں دارالعلوم اور دیوبند میں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ اس کا پانی نہایت ٹھنڈا اور شیریں ہے۔ مولانا رفیع الدین صاحب نے ہی ایک خواب میں یہ بھی دیکھا کہ:

”کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ بعض لوگوں کے چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھر داکر لے جا رہا ہے؟“

مولانا نے برتنوں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی تعبیر فرمائی کہ اس سے ہر شخص کا ”ظرفِ علم“ مراد ہے۔ جس کا جتنا ظرف ہے اسی قدر علم اس کے نصیب حصہ میں آئے گا!

مسجد دارالعلوم | ۱۳۲۴ھ (۱۹۱۰ء) میں دارالعلوم مقدس اکابر نے مسجد کی بنیاد کی دیواریں خود اپنے مبارک ہاتھوں سے تعمیر کیں رواد میں سنگ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے۔

طلباء کے عام مجمع میں بزرگانِ دین نے مسجد کی بنیاد رکھی اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے اپنے ہاتھ سے انیٹیں رکھیں اور نہ صرف انیٹیں رکھیں بلکہ اس دیوار کی کل بنیاد جو بہت گہری تھی طلباء نے خود اپنے ہاتھوں سے بھری۔ طلباء کے ساتھ کل مدرسین اور اراکینِ مدرسہ نہایت ذوق و شوق سے خود انیٹیں اپنے سرورں اور ہاتھوں پر لاتے تھے اور بجائے معماروں کے تعمیر کرتے تھے!

سبحان اللہ طلباء کا جوش، مسرت کے ساتھ سنت خلیل اللہی میں مشغول ہونا اور ساتھ میں رجزیہ اشعار اور تعمیر بیت اللہ کے وقت کی حضرت خلیل اللہ کی دعائیں پڑھنا عجیب موثر اور پر جوش سماں تھا۔

مسجد کی تعمیر سیٹھ غلام محمد اعظم صاحب کی تنہا فیاضی کی یادگار ہے۔ مسجد

کی روکار اور منار سنگِ سرخ کے ہیں۔ جن پر نہایت حسین و دلآویز نقش و نگار کندہ ہیں۔ صحنِ مسجد میں ”مرمر“ کا سنگین حوض ہے جو ہر وقت شفاف پانی سے لبریز رہتا ہے اس میں پانی برقی موٹر کے ذریعہ بھرا جاتا ہے۔ یہاں بچکانہ اوقات نمازیوں کی کثرت اور حجوم کو دیکھ کر جمعہ و عیدین کا سماں نظر آتا ہے۔ مسجد کی روکار میں سنگ مرمر کا کتبہ نصب ہے جس میں مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں :

در مدرسه مسجدے بناشد	ایں مژدہ زدوستان شنیدم
بر لوح حینش اسم اعظم	خواندم چو لہجن اور رسیدم
در سجده شکر چوں فتادم	در گوش ایں شنیدم
مقرون شدہ عبادت و مسلم	در مدرسه خانقاه دیدم

۱۳۲۸ھ

۱۳۲۸ھ

یہ مسجد دو منزلہ ہے بالائی منزل ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) کی تعمیر ہے ! دارالعلوم کی پُر شکوہ اور خوش منظر عمارت کے اس گوشہ میں جو ریلوے اسٹیشن کو شہر سے ملانے والی سڑک کے آخری سرے پر واقع ہے اور جس سے آنے والے کو دارالعلوم کے مشرقی دروازہ میں داخل ہونے پر سب سے پہلے جو عمارت ملتی ہے ! وہ دارالعلوم کی یہی دو منزلہ خوشنما مسجد ہے جس کی مشرقی جانب بالائی منزل پر دارالافتاء کی عمارت واقع ہے ! جو تین وسیع کمروں اور ایک کشادہ دالان پر مشتمل ہے۔

دارالحدیث | جس طرح دارالعلوم دیوبند کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درس گاہ ہے جو عین اسلامی علوم کے زوال کے وقت جمہور مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث

ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے جو اس نام سے عالم وجود میں آئی! اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں چپہ چپہ پر مدارس کا جال بچھا ہوا تھا! اور ایک ایک ذرہ علم کی روشنی سے منور تھا! لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پہلے نہیں بنی!

اسلام کی تاریخ میں دارالحدیث کے نام سے اس سے پہلے پہل عمارت بنانے کا شرف شام کے فرمانروا ملک عادل نور الدین زنگی متوفی ۵۶۹ھ کو حاصل ہے۔ سلطان محمود نے یہ دارالحدیث دمشق میں تعمیر کرایا تھا! دوسرا دارالحدیث قاہرہ (مصر) میں سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے بھتیجے ملک کامل نے قائم کیا۔ اور پھر یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ صرفہ ایک شہر دمشق میں یک وقت ۱۸ دارالحدیث موجود تھے جن میں ہر ایک بجائے خود زبردست عظمت و شان کا مالک تھا!

دارالعلوم میں دارالحدیث کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) کو ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی، طلباء نے باصراۃ مزدوروں کی بجائے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ والہانہ انداز میں خود بنیاد رکھی، حضرت تھانویؒ نے صحیح سے منبرمایا:

”سب صاحب ایک ایک دو دو اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھ دیں یہ مظلوم

حق تعالیٰ کے ہاں کس کا غلوم مقبول ہو جائے“

چنانچہ تمام شرکار جلسہ نے دو دو اینٹیں رکھیں!

دارالحدیث کی یہ پرنسکوه عمارت بہم وجوہ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۱ء) میں مکمل ہوئی۔

یہ طویل و عریض اور سربفلک عمارت نودرہ کی پشت پر واقع ہے اور دارالحديث دو حصوں پر منقسم ہے۔ نودرہ کی پشت پر جو عمارت ہے قدیم دارالحديث بھی ہے مگر آجکل اس میں درس حدیث کی بجائے دوسری مختلف جماعتیں پڑھتی ہیں۔ دارالحديث کے گرد و پیش ۱۳ کمرے ہیں؛ جو درس کے کام آتے ہیں۔ دارالحديث کا طول ۶۸ فٹ اور عرض ۳۵ فٹ ہے جو نودرہ کے اوپر واقع ہے اس کی رو کا مغرب کی جانب ہے اب حدیث کا درس اس عمارت میں ہوتا ہے اور دارالحديث "نوقانی" کے نام سے موسوم ہے یہ عمارت ۱۲۵۲ھ (۱۹۳۲ء) کی تعمیر ہے۔

دارالتفسیر | قدیم دارالحديث کے اوپر دارالتفسیر کی مریع عمارت ہے، یہ طول و عرض میں ۳۰ x ۳۰ فٹ ہے۔ اس کے اوپر نہایت خوش نما گنبد بنا ہوا ہے جو اپنی رفعت و عظمت اور حسنِ تعمیر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے۔ دارالتفسیر ۱۲۵۸ھ (۱۹۳۹ء) کی تعمیر ہے۔ دارالحديث اور دارالتفسیر کی یہ سربفلک عمارت بہ ہیئت مجموعی اس قدر عظیم الشان اور پر شوکت ہے کہ دیکھنے والا غرقِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا؛ اس کا آسمان سے باتیں کرنے والا گنبد سیلوں سے نظر آتا ہے۔

دار جدید | دارالحديث کے سامنے جدید دارالاقامہ ہے جو بڑے بڑے ۱۱ کمروں پر مشتمل ہے۔ دار جدید کے کمروں کا سلسلہ دارالحديث کی شمالی جانب سے شروع ہو کر مستطیل شکل میں مغرب سے گذرتا ہوا جنوبی سمت چلا چلا گیا ہے۔ کمرے وسیع اور کشادہ ہیں۔ اور سب کے سامنے برآمدے ہیں۔ اس احاطہ کے شمال و جنوب اور مغرب میں تین دروازے ہیں۔ مغربی دروازہ جو عین دارالحديث کے مقابل ہے "باب الظاہر" کے نام سے،

موسوم ہے۔ دار جدید کا یہ احاطہ دارالعلوم کا سب سے زیادہ پُر فضا مقام ہے۔ کئی ایک طرز میں کا نہایت وسیع صحن ہے جس کی تین سمتوں میں دارالاقامے اور مشرقی جانب دارالحديث ہے۔ دار جدید میں دو کشادہ سڑکیں ہیں ایک از الحیث سے شروع ہو کر باب الظاہر پر ختم ہوتی ہے۔ اور دوسری سڑک شمالی دروازہ سے نکل کر جنوبی دروازہ میں گم ہو جاتی ہے۔ ان سڑکوں نے دار جدید کے احاطہ کو چار قطعوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان قطعوں میں رنگ برنگ کے پُربہار اور جذبات نظر پھولوں اور قسم قسم کے چھوٹے بڑے درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے جس نے منظر میں ایک ایسی دل کشی پیدا کر دی ہے جو بے ساختہ دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہری بھری گھاس سے پورا احاطہ خوش منظر اور شاداب نظر آتا ہے۔

باب الظاہر | باب الظاہر دار جدید کا صدر دروازہ ہے۔ یہ دروازہ دارالعلوم کی ایک نہایت خوش نما اور غالباً عمارت ہے۔ ۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ء) میں اس کی تعمیر ہوئی۔ باب الظاہر موجودہ تاجدار افغانستان اعلیٰ حضرت المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ کے گراں قدر شاگرد عطیہ اور دارالعلوم سے وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

دارالقرآن | دار جدید کے جنوبی گوشہ میں دارالقرآن کی عمارت ہے جو کوٹوٹو لوکمانہ کے مشہور تاجرا الحاج فیروز الدین صاحب کی فیاضی اور خدمت قرآنی کی یادگار ہے۔ یہ عمارت پانچ کمروں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہر سال کم و بیش دو سو بچے قرآن مجید پڑھتے اور حفظ کرتے ہیں ۱۳۶۸ھ میں اس کی تعمیر ہوئی !

علامہ عثمانی کی شادی خانہ آبادی

چونکہ عہد طالب علمی ، ذکر اساتذہ کرام اور دارالعلوم دیوبند کی تاریخی حیثیت کے ترتیب وار سلسلے نے علامہ کے کسی اور واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے محبور رکھا اس لئے ہم ذرا سلسلہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کی طرف پھرتے ہیں اور معلومات میں یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب علامہ ابھی مصروف تحصیل علم تھے تو فراغت سے دو سال پہلے ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء کو آپ کی سنت نکاح جس کو عام طور پر ہماری زبان میں شادی کہتے ہیں منعقد ہوئی۔ جیسا کہ آپ کی بیگم صاحبہ کی زبانی صحیح تاریخ اور سن معلوم ہوا۔

اُس نیک دل خاتون کا جو علامہ کی بیگم بنیں مختصر شجرۂ نسب یہ ہے :-
 مسماۃ ام ہانی بنت بلنذجبت بن شرف الدین بن شمس الدین بن سید
 حسن بن مولوی سید غلام حسین صاحب بچڑوی رحمۃ اللہ علیہ بن سید
 جعفر علی ۔

یہ مختصر سلسلہ نسب جو مجھے موصوف کے چھوٹے بھائی مولوی سعید احمد عثمانی سے حاصل ہوا ، ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ سیدہ دل کے خاندان کی بیٹی ہیں اور جو بفضلہ تعالیٰ ابھی بقیہ حیات ہیں اور کراچی میں اپنی بھتیجی منیبہ خاتون کے پاس مقیم ہیں جس کو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی بابو فضل حق سے لیکر پرورش کیا تھا۔

۱۔ علامہ عثمانی کی اہلیہ کا مارچ ۱۹۴۲ء کے پہلے ہفتے میں بجر ۸۵ سال بمرض
 فارغ انتقال ہوا ۔ معتمد

بے اولادی شادی کی خبر کے بعد انسانی حیثیت سے یہ لکھتے ہوئے ہیں ایک گونہ افسوس ہو رہا ہے کہ ہم قارئین کو یہ بتائیں کہ علامہ دنیا سے بغیر اولاد رخصت ہوئے اور آپ نے اپنی زندگی میں یہ بہار نہ دیکھی۔ قدرت نے انسانوں میں جو تقسیم کی ہے ہم اس کے اسرار و رموز اور حکمتوں تک رسائی نہیں رکھتے بس صرف یہی سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں درست کرتے ہیں اور ہم کچھ نہیں جانتے۔ ورنہ قادر مطلق کی غیر محدود قدرت کے جلوے آپ کے سامنے ہیں۔

انہوں نے چاہا تو آدم علیہ ماں باپ کے بغیر پیدا کر دیا، عیسیٰ علیہ السلام کو صرف ماں سے باپ کے بغیر پیدا کر کے ایک خاص آیت کا مظاہرہ کیا۔ ابراہیم علیہ السلام کے یہاں اسماعیل اور اسحق علیہما السلام کو اس وقت پیدا کیا جبکہ وہ اندر ان کی بیوی دونوں سلسلہ اولاد کی منزل سے گزر چکے تھے اور بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ زکریا علیہ السلام کے گھر میں سحیٰ علیہ السلام کے نور سے اس وقت اجالا ہوا جب وہ خود شیخوخت کو پہنچ چکے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھی۔ غرض قدرت جیسا کہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے تو وہ بے اولادوں کو بھی اولاد دے سکتی ہے، لیکن اگر نہیں دیتی تو جائے شکایت نہیں بلکہ اس میں بھی جائے شکر ہے بقول شاعر

قسمت کیا ہر شخص کو قدام ازل نے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

دنیا میں اولاد ماں باپ کے مال و دولت، مکان اور جائیداد کی وارث ہوتی ہے اور اس سے کسی انسان کا سلسلہ نسب چل کر نام و نشان کا باعث بنتا ہے لیکن علامہ کو قدرت نے ایسی معنوی اولاد عطا کی کہ اس کے سامنے نسل و نسب کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ان کی تصانیف اور ان کے علمی کارنامے ہیں جو قیامت تک صفحہ روزگار پر ان کا نام و نشان باقی رکھیں گے جبکہ صرف اولاد والوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

خواہ کچھ بھی ہو لیکن انسان کا دل اولاد کی تمنا میں بقدر ظرف بقیہ قرار دیتا ہے۔ اس لئے فطرت انسانی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر آپ بھی غموم دیکھے جاتے رہے ہیں۔ اس لئے اس غم کا رد عمل دوسری صورت میں ظاہر ہوا کہ آپ نے اپنے بھائی کی اولاد کو لیکر اپنے بچوں کی طرح ان کی تربیت کی۔ (اس سلسلے میں آپ کے چھوٹے بھائی بابو فضل حق عثمانی نے جو مجھے اسٹیشن ڈی اور قلمی بیان میرے حوالے کیا، اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں پیش کرتا ہوں لکھتے ہیں:

”حضرت مرحوم کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے بچوں اور باخصوص بھائیوں

کے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب حج سے واپس آئے تو میرے پاس

صرف اپنا بچہ تھا اس کو اپنا متبئی بنالیا۔ اس کا نام بھی آپ ہی نے نعمان

رکھا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی عنایت فرمائی جس کا نام منیبہ

خاتون ہے۔ میں تو مع اہل و عیال باہر ملازمت پر تھا اور نعمان حضرت

علامہ کے پاس رہتا لیکن قدرت خداوندی سے چار سال کے بعد اس کا

انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات پر علامہ اور ان کی اہلیہ کو جو صدمہ ہوا وہ

بیان سے باہر ہے۔ روزانہ اس کی قبر پر جاتے۔ اور کبھی کبھی قبر کی مٹی

لے آتے اور اپنی اہلیہ محترمہ کو دیتے کہ یہ ہمارے نعمان کی قبر کی مٹی ہے جب

ہیں اس کی وفات کی خبر ہوئی تو ہم اپنی ملازمت سے رخصت لیکر آئے

اور ان کے غم میں شریک ہوئے۔ لیکن ان کے اس غم کو دیکھ کر ہم نے

اپنی لڑکی منیبہ کو پیش کر دیا کہ آپ اس کی پرورش کر لیجئے لیکن آپ نے

فرمایا کہ بھائی جب میری قسمت میں ہی آئے تھے نہیں تو پھر میں کسی کے

بچے کو رکھ کر یہ صدمہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ بالآخر باصرہ تمام آپ نے

منیبہ کو اپنے زیر سایہ پرورش کرنے کے لئے قبول فرمالیا اور جلان سے

زیادہ سمجھ کر پالا۔ اس کے لئے مکان بنوا کر دیا۔ تعمیر مکان کے بعد جب اس کے نام کر دیا تو اس کو اپنے قیام کی وجہ سے دس روپیہ ماہوار کرایہ دیتے رہے۔ خود اپنے اخراجات ہی مولانا محمد سحی صاحب تھانوی کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کی۔ احمد شہ کہ منیبہ خاتون کے کئی کئی بچے ہیں۔ علامہ تو دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن لڑکی کو ان کی جدائی کا بہت احساس ہے۔“

مولانا محمد سحی صاحب تھانوی جن سے علامہ نے اپنی جتنی منیبہ کی شادی کی دیوبند کے فاضل

اور قابل شخصیت کے مالک ہیں۔ علامہ کی عہد طلب علم سے خدمت کرتے رہے۔

مذکورہ بالا بیان میں ایک خاص چیز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ علامہ نے اپنے زہ کثیر سے تفسیراً

بیس ہزار روپیہ لگا کر یہ مکان محلہ گوریوارہ میں بنوایا اور اس کو اپنی جتنی کے

نام کر کے پھر دس روپیہ ماہوار کرایہ باصرار اس کو دیتے رہے۔ میرے نزدیک

صلہ رحمی کی یہ اعلیٰ مثال کہی جاسکتی ہے۔ راقم الحروف نے یہ مکان دیکھا ہے

اور اس میں چند گھنٹے بھی گزارے ہیں جبکہ ۱۹۳۵ء کی سہ ماہی کی تعطیل میں کپور تھلہ

سے شیرکوٹ جاتے ہوئے دیوبند میں قیام کیا تھا۔ دوسری مرتبہ پاکستان

کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب اگست ۱۹۴۷ء میں میرا دیوبند جانا ہوا

اور ایک ہفتہ استاذ محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند

کے پاس ٹھہرا تو اس اشار میں ایک دفعہ علامہ کے مکان کے پاس سے گزر ہوا تو اس میں کسی

عورت کے رونے کا آواز آئی معلوم ہوا کہ کوئی شہزادی بھی اس میں براہِ جہان ہے

۱۸-۱۹ سال پہلے حاجی جمیل احمد امین نمبر دار مرحوم نے کسٹومرن سے نیلام میں یہ مکان خرید لیا تھا اور اس وقت بھی ان سے اپنی وعیال اس میں رہ رہے ہیں۔ اشفاق احمد

بہر حال ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ کو علامہ کی شادی ہوئی لیکن تاحیات کوئی بچہ نہ ہوا۔ لیکن اس خواہش کی چنگاری دل میں شگفتی ضرور رہی۔

سلسلہ درس و تدریس

جب علامہ ۱۳۲۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اور طالب علمی کے زمانے میں آپ کی علمی قابلیت کا سیکہ سارے دارالعلوم پر بٹھ گیا تو اس حقیقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا، کہ آپ دارالعلوم میں درس دینے کے لئے نہایت موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۲۶ھ کے شوال سے آپ کو دارالعلوم دیوبند میں منصب تدریس پر مقرر کر دیا گیا اور پڑھانے کے لئے درسیات کی اعلیٰ کتابیں دے دی گئیں اور دارالعلوم دیوبند کا یہ پہلا زبردست فارغ التحصیل عالم ہے جو فارغ ہوتے ہی نو عمری میں سینئر پروفیسروں کی صف میں جگہ لیتا ہے۔

اسی سال جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے

مولانا محمد ابراہیم بلیاوی استاد معقول و منقول کی آمد

تشریف لائے۔ علامہ عثمانی مرحوم کے یہاں اس زمانے میں بلیا کے کوئی صاحب جو دارالعلوم میں پڑھتے تھے، مقیم تھے۔ انہی کی وجہ سے مولانا بلیاوی بھی علامہ کے مکان پر ٹھہرے۔ موصوف نے دورۂ حدیث کی درخواست دی لیکن کتابوں میں ترتیب نہ ہونے کے باعث حدیث کے اسباق نہ مل سکے اور ایک سال

پیچھے ہٹا دے گئے۔ یہی چند ماہ ہیں کہ ان میں مولانا بلیاوی نے علامہ عثمانی کی باقاعدہ دارالعلوم کی کلاس میں شام گری کی۔

جب آپ دارالعلوم میں
مدرسہ فتحپوری دہلی کی صدارت ۱۳۲۶ھ

ہے تھے تو مدرسہ فتحپوری دہلی کی صدر مدرس کے لئے، مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتہائی دہلی نے مولانا حبیب الرحمن صاحب، سابق مہتمم دارالعلوم دہلی سے کسی قابل مدرس کے لئے درخواست کی۔ مہتمم صاحب جو علامہ کے برادر بزرگ بھی تھے، انہوں نے وہاں کی صدارت کے شایان شان علماء پر نظر ڈالی اور علامہ کو اس عہدے کے لئے فٹ اور موزوں تصور کرتے ہوئے آپ کو دہلی بھیج دیا۔ چنانچہ موصوف نے ابھی دارالعلوم میں کچھ ماہ تعلیم دی تھی کہ وہاں تشریف لے گئے۔ یہ مدرسہ اپنی نوعیت کا دہلی میں سب سے بڑا مدرسہ تصور کیا جاتا تھا۔ اور اب بھی اس کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں آپ نے شعبان ۱۳۲۸ھ تک دورہ حدیث اور دوسری اعلیٰ درجہ کی کتابیں پڑھائیں۔

دہلی کو ہندوستان کی مرکزی حیثیت سے یوں بھی بڑا مقام حاصل رہا کیا ہے اس لئے مرکز میں علامہ کی تقریروں اور صدارت تدریس کی وجہ سے آپ کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔ دہلی کے قیام نے مولانا عثمانی کی زبان اور بیان پر سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ اول تو تقریر سے عہد طفلی ہی سے خداداد دلچسپی تھی لیکن دہلی کی زبان نے آپ کی اردو کو اور بھی شستہ بنا دیا۔ وہاں کے لب و لہجہ، وہاں کے انداز تکلم، محاوروں اور روزمرہوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

ادھر تعلیم سے فراغت پا کر مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بھی بحیثیت مدرس فتحپوری کے مدرسہ میں تشریف لے گئے اور پھر دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے

اور قریب ہونے کا موقع ملا جس کی وجہ سے قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور دونوں میں دوستی کے رشتے مستحکم ہو گئے۔ ابھی علامہ کو فتحپوری میں دو سال ہی ہوئے تھے کہ آپ کو دارالعلوم دیوبند بلا لیا گیا۔

دہلی سے دیوبند واپس بلائے جانے کے متعلق جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کا حسب ذیل بیان بہترین استادین

علامہ پھر دارالعلوم دیوبند میں
۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۱ء

ہے۔ موصوف ۱۳۳۳ھ کی رویت دارالعلوم میں لکھتے ہیں :-

۱۳۲۶ھ میں آپ مدرسہ فتحپوری دہلی کے مدرس اول مقرر ہو کر گئے۔

۱۳۲۸ھ تک وہاں رہے۔ ممبران مدرسہ کو یہ امر پسند نہ تھا کہ ایسے لائق اور

کار آمد شخص کو دارالعلوم سے جدا رکھا جائے۔ اس لئے سوال ۱۳۲۸ھ میں

دیوبند بلائے گئے۔ (رویت دارالعلوم دیوبند ۱۳۳۳ھ صفحہ ۷۲)

مہتمم صاحب کے اس جملے سے کہ ”مولانا شبیر احمد صاحب کو سوال ۱۳۲۸ھ میں واپس بلا لیا گیا“ یہ مترشح ہوتا ہے کہ علامہ رمضان شریف کی بڑی تعطیل کے بعد سوال کے ابتدائی تعلیمی سال کے لئے دہلی آجی گئے ہی ہوں گے کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے ان کا وہاں رہنا پسند نہ کیا اور ان کو وہاں سے بلا لیا۔

جب علامہ دہلی سے بلائے گئے ہیں یہ وہ وقت تھا

دارالعلوم کی فضا

کہ دارالعلوم میں تعلیمی اور تبلیغی نیز سیاسی حالات نے ایک نئی گرد و غبار مچا دی تھی۔ دارالعلوم میں نصاب تعلیم میں تبدیلیوں کے ساتھ ایک خاص درجہ تعلیم کھولا گیا تھا جس میں فارغ التحصیل طلبہ کو تبلیغ کے لئے تیار کیا جانا تھا اور اس درجہ خصوصی میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب، حضرت شاہ محمد امجد علی صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

رحیم اللہ کی تصنیفات کا درس دیا جانا بھی شامل تھا۔ علامہ عثمانی ان حضرات کی تصانیف اور بالخصوص حجة الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے مضامین عالیہ میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ ادھر جمعیت الانصار کے جلسے مؤتمرا انصار کے نام سے ہونے والے تھے۔ علامہ نے بھی اپنا مضمون ”الاسلام“ پڑھ کر علماء پر دھاک بٹھا دی تھی۔ یہی سلسلہ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۸ھ کا سال ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے شعبان کے ماہ میں القاسم کا پہلا پرچہ نکلا ہے۔ اور اسی سال میں دارالعلوم کی تاریخ کا زبردست کارنامہ جلسہ دستار بندی ہوا۔ اندریں حالات علامہ کو دارالعلوم میں بلانے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ علاوہ ازیں ایک اور وجہ بھی دہلی ترک کرنے پر مجبور کر رہی تھی وہ تھی آپ کی خود دارانہ طبیعت کہ مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع محتبائی دہلی کے سامنے، جو ان دنوں مدرسہ فتحپوری کے کل کلاں تھے، علامہ جھک نہ سکے۔ لیکن مولوی عبدالاحد صاحب نے جو شکایتی خط مولانا حبیب الرحمن صاحب کو لکھا اس میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ آپ نے ان کو وقت سے پہلے بڑا بنادیا ہے۔ جیسا کہ مولانا بلیاوی کی زبانی معلوم ہوا۔ دراصل صاحب محتبائی نے ان کی خودداری کو ”بڑا بنادیا ہے“ سے تعبیر کیا ہے۔ ممکن ہے یہ وجہ بھی ہو لیکن علامہ تو مرکزی کینٹ کی وزارت کے قابل تھے اس لئے ان کے شایان شان دارالعلوم دیوبند ہی تھا جس کی طرف واپس بلائے گئے۔

واپسی پر آپ کو اکابر مدرسین میں جگہ دی گئی اور اعلیٰ درجے کی کتابیں پڑھانے کی پیشکش کی گئی۔ اس سلسلے میں حضرت حافظ محمد احمد صاحب مہتمم اور مولانا حبیب الرحمن صاحب سابق نائب مہتمم کی حسب ذیل تحریری دستاویزی پیش نظر رکھئے جس سے علامہ کی ابتدائی پوزیشن کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ لکھتے ہیں :-

”مولانا (شیخ الہند) نے (حج کو) تشریف لے جانے سے ایک روز قبل ترمذی کا سبق خود پڑھایا اور آپ کے تشریف لے جانے کے بعد دورۂ حدیث کے اسباق اس طرح تقسیم کر دئے گئے کہ حضرت مولانا کی جگہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کو ترمذی شریف کا سبق دیا گیا اور قائم مقام صدر مدرس آپ ہی بنائے گئے۔ مسلم شریف کا سبق مولوی شبیر احمد صاحب کو دیا گیا۔ مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب بموجودگی حضرت مولانا (شیخ الہند) عرصہ آٹھ سات سال سے دورۂ حدیث کی ایک ایک دو دو کتاب ہر سال پڑھاتے تھے ترتیب اسباق حدیث اس طرح ہوتی تھی کہ شروع سال پر ترمذی حضرت مولانا (شیخ الہند) کے یہاں، مسلم شریف اور ابو داؤد میں سے ایک کتاب مولانا انور شاہ صاحب کے یہاں، اور ایک مولانا شبیر احمد کے یہاں“ (رویداد العلوم ص ۳۳۳ صفحہ ۳۳۳)

مذکورہ بالا عبارت سے کئی تاریخی واقعات مل گئے جن سے علامہ کی دیوبند پسندی کی تعلیمی سرگرمی اور اکابر اساتذہ میں شمولیت کا حال معلوم ہوا۔ یعنی شیخ الہندؒ کی موجودگی میں وہ ہستیاں جن کو بخاری شریف اور ترمذی کے علاوہ مسلم اور ابو داؤد شریف جیسی حدیث کی جلیل القدر کتابیں پڑھانے کے فرائض سپرد کئے گئے وہ استاذی مولانا سید انور شاہ صاحب اور مولانا عثمانی تھے۔ گویا شیخ الہندؒ کے بعد یہی دو ہستیاں تھیں جن کو بلند مقامی حاصل تھی۔ اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فتحپوری سے واپسی پر موصوف آغا نے ملازمت ہی سے ابو داؤد شریف اور مسلم شریف پڑھاتے رہے ہیں۔ رپورٹ بتلاتی ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۳۳ میں حج کے لئے تشریف لے گئے اور علامہ ان کی موجودگی ہی میں سات آٹھ سال پہلے سے دورۂ حدیث کی مذکورہ بالا دو کتابوں میں سے کبھی ایک اور کبھی دوسری پڑھایا کئے۔

اس تاریخی تحریر کے علاوہ موصوف کے شاگردوں سے جن جن کتب کے پڑھانے کا سراغ لگا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے چھوٹی بڑی ہر فن کی کتابیں پڑھائی ہیں۔ مثلاً مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی نے مجھ سے کہا کہ میں نے علامہ سے اصول النشاشی، تلخیص المفتاح، ملاحسن، بیضاوی، مشکوٰۃ، ابوداؤد، مسلم شریف، حمد اللہ، صدرا وغیرہ کتابیں پڑھی ہیں۔ تاجور صاحب کا دورِ تعلیم ۱۳۲۶ھ سے ۱۳۳۶ھ تک رہا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی حال وارء کراچی نے فرمایا کہ میں نے علامہ سے قاضی، حمد اللہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ عنرض یہ ہے کہ موصوف نے تقریباً ہر فن کی کتب کا دارالعلوم میں درس دیا۔ ان کتب کے علاوہ بخاری شریف اور ترمذی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کی وفات کے بعد پڑھایا گئے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے طویل مضمون ”دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن“ کے عنوان کے ماتحت جو رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوا، لکھتے ہیں :-

”یوں استاذ ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم کے سارے اساتذہ کے ساتھ تلمذ کی نسبت اس فقیر کو حاصل ہے لیکن سچی بات یہی ہے کہ حضرت کشمیری مولانا شیخ الہند، مولانا شبیر احمد نور اللہ قبور ہم سے تمتع کے جو مواقع میسر آئے، دوسرے اساتذہ کے متعلق دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم اس سال جو ہمارے دورے کا سال تھا مدرسہ کی تدریسی خدمت سے دستکش ہو کر گھر بیٹھ گئے چند دنوں تک ان کے گھر پہنچ کر فقیر اور مولانا نور الہدیٰ درجہ گوی ابوداؤد پڑھتے رہے لیکن مولانا پر جو حال طاری تھا اس نے زیادہ دنوں تک اس سلسلے کو بھی باقی نہ رکھا۔ مدرسہ کی طرف سے ان کی کتاب سنن ابی داؤد کا سبق حضرت

میاں سید اصغر حسین صاحب نور اللہ فریہ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

(رسالہ دارالعلوم ماہ رمضان ۱۳۴۲ھ جون ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۵ کالم ۲)

مذکورہ عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت میاں صاحب سے پہلے حضرت عثمانی
ہی ابوداؤد پڑھایا کرتے تھے اور جب وہ اس سال جو کہ گیلانی صاحب کے در سے
کاسال تھا دستکش ہو گئے تو یہ کتاب حضرت میاں صاحب کے پاس پہنچ گئی اور
پھر تازہ زندگی میاں صاحب ہی اسے پڑھاتے رہے۔

خطیب ملت استاذی مولانا محمد طیب صاحب موجودہ مہتمم دارالعلوم اپنے
مضمون ”حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی“ میں تحریر فرماتے ہیں :-

”ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمد اللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے مگر
آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے۔ اور صرف کتاب و سنت اور فنون
دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب
اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔“

(رسالہ دارالعلوم ماہ مئی ۱۹۵۶ء جلد ۱۱ شمارہ ۷)

اس ڈاکو مینٹ سے معلوم ہوا کہ موصوف آغاز ملازمت سے ہی بڑی بڑی کتابیں
حمد اللہ جیسی پڑھاتے تھے اور نہ صرف یہ کتابیں بلکہ معقولات یعنی منطق، فلسفہ اور
علم کلام سے شروع شروع میں آپ کو زیادہ دلچسپی تھی لیکن پھر کتاب اللہ، سنت
رسول اللہ یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ کی طرف توجہ فرمائی اور ان فنون کو بھی معقولات
سے زیادہ کمال پر پہنچا کر جھوٹا جس کا زندہ ثبوت ان کی تفسیر اور سلم کی شرح فتح الملہم ہے۔
دنیا میں کوئی شخص ہر فن مولا ہو جائے مشکل ہی نہیں
جامع علوم و فنون | بلکہ ناممکن کے قریب قریب ہے لیکن علامہ شبیر احمد
صاحب اپنے ماحول میں علوم معقول و منقول، فن تحریر و تقریر میں جامع تھے،

اور دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بھی وہ
ہستی تھی کہ جن کو جامع العلوم والفنون کہا جاسکتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب بلاشبہ
ہر علم و فن میں سب سے بلند مقام رکھتے تھے لیکن وہاں تحریر و تقریر کا معاملہ ٹھنڈا تھا۔
ہم یہاں تک مذکورہ بالا تحقیقی بیانات کی مدد سے اس مقام پر پہنچ چکے کہ نقیین
کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ علامہ نے اپنے عہدِ معلیٰ میں ہر علم و فن کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھا
کر ایک خاص تاریخی مقام حاصل کیا اور فنِ تعلیم میں وہ اپنے دور کے ایکسپٹ پر و فیسر
اور ماہرِ تعلیم تھے۔ اور علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں یکساں مہارت کے مالک تھے۔
کسی اہل علم کو میرے نزدیک اس وقت عالم کہا جانا چاہیے جبکہ اس کو اپنے معلومات
اور علمی تحقیقات پر اتنا وثوق اور اعتماد ہو جائے کہ وہ ہر سوسائٹی اور مجلس میں اپنے
شعوس علم اور بصیرت کے باعث تفوق اور بالادستی حاصل کر سکے اور علماء و فضلاء
اس کے سامنے سر جھکا لیں، یہ مقام ان کو اپنی آغاز زندگی سے حاصل ہو چکا تھا اور یہی
ان کے حق میں اسی تفوق و بالادستی کو قدرت کا زبردست انعام تصور کرتا ہوں۔
اور تم بالائے تم اور حیرت اندر حیرت یہ ہے کہ نو عمری اور جوانی میں اس مقام پر پہنچ
گئے جہاں عمر کا پکا انسان پہنچے ہیں۔ ۱۳۳۳ھ کی دارالعلوم کی رپورٹ کے حسب ذیل
جملے ملاحظہ فرمائیے جو اس وقت کے مہتمم صاحبان مولانا محمد احمد صاحب اور مولانا
حبیب الرحمن صاحب کی طرف سے ہیں :-

”مولوی شبیر احمد صاحب مؤخر طبقہ کے اصحاب میں سے ہیں اور

ماشاء اللہ نو جوان اہل علم میں سے ہیں جن کو علوم اکابر کا حامل قرار دیا جائے
تمام علوم معقول و منقول میں کامل استعداد رکھتے ہیں۔ تقریر و تحریر میں بے مثل
ہیں۔ خصوصاً علم حدیث میں ایسا ملکہ ہے جو معمر اور تجربہ کار مشائخ حدیث کو

ہوتا ہے“ (رونداد دارالعلوم ۱۳۳۳ھ ص ۲)

جمعیت الانصار اور علامہ شبیر احمد عثمانی

شہرت عام اور بقائے دوام | سعادت مند پیشانیوں کسی بلند شخصیت کے مستقبل کی جھلک لوگوں کی آنکھوں کو اس طرح دکھا دیتی ہیں کہ اہل بصیرت کے لئے سب کچھ اس میں نظر آجاتا ہے۔ حضرت عثمانی عہد طالب علمی میں ہی طلبہ میں شہرت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ اور ان کے ذریعہ باہر کے معاصرین میں آپ کے چرچے ہو چلے تھے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی تک ان کی قابلیت اور لیاقت کی شہرت پہنچی اور یہ زمانہ ان کی بھی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ دونوں میں باہمی نامہ و پیام خط و کتابت اور تبادلہ سلام ہونے لگا۔ جب عہد طالب علمی سے نکل کر دہلی پہنچے تو مرکز میں تقریروں کے سلسلے نے آپ کے ذکر کو باہر کے علمی اور عوامی حلقوں تک پہنچایا ابھی آپ دہلی ہی تھے کہ دارالعلوم میں حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کو بلایا اور یہاں اب فضاؤں میں انقلابی حرکت اور تعلیمی پروگرام میں ایک خاص تبدیلی رونما ہونے کے آثار ہوتے۔ شیخ الہند کے اشاروں پر الانصار کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل ہوئی۔ مولانا عثمانی اس کے سرگرم رکن رہے۔

جمعیت الانصار ۲۷ رمضان ۱۳۲۷ھ | اس انجمن کی تشکیل کا پس منظر اور تاریخی خاکہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

مؤتمر الانصار مراد آباد کے جلسے منعقدہ ۱۵-۱۶-۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کی رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں :-

” مدت ہے اس قسم کے خیالات میرے اور دیگر تعلیم یافتگان مدرسہ میں سے

ایک بڑی جماعت کے ذہن میں خطور کر رہے تھے مگر ان کے اظہار کی نوبت بتدریج

۲۶ ماہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ بعد عشاء آئی جب استاذ العالم

حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہ العالی نے مدرسہ کی روز افزوں ضرورت تعلیمی و مالی حالت کی طرف تعلیم یافتگان مدرسہ کو متوجہ کرنے کی ضرورت بیان فرمائی ۔

رمضان کی ستائیسویں شب مقدس کو حضرت مولانا مدظلہ العالی اوپنپرستاران جمعیت نے اس مجلس کے انعقاد کی اجازت دی اور بروز چہار شنبہ ۲۷ رمضان بوقت ۹ بجے بصدارت جناب مولانا محمود حسن صاحب سلمہ اقامتی جلسہ ہوا جس میں قدیم طلبہ مدرسہ کی ایک معقول تعداد شامل ہوئی ۔ اول قاری حافظ محمد طیب سلمہ ابن مولانا حافظ احمد صاحب نے سورہ صف کی خوش الحانی سے تلاوت کی اس کے بعد پڑھنے اپنے مرنے والی علی مدرسہ عالیہ دیوبند کے حقوق اور انعقاد مجلس کی ضرورت پر مختصر تقریر کی بندہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو استاذ العلماء حضرت مولانا مدظلہ العالی نے اس کی تائید میں ایک مفصل تقریر فرماتے ہوئے مجلس کی ضرورت ظاہر فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اب ضرورتیں ایسی پیش آرہی ہیں جن کی وجہ سے ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا ہے ۔ اس درمیان میں جناب مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ (ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور مولانا مولوی حبیب الرحمن صاحب مددگار مہتمم نے بھی تقریریں فرمائی اور معمولی بحث کے بعد مجلس کے انعقاد کی ضرورت باتفاق رائے تسلیم کی گئی اور مجلس کا نام ”الانصار“ تجویز ہوا۔“

(رپورٹ ص ۵۴ و ۵۵)

شوال ۱۳۳۳ھ کے القاسم میں مولانا سندھی جمعیت الانصار کے آغاز کے متعلق لکھتے ہیں :-

”دارالعلوم (دیوبند) میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوئی جس سے منتشر
پردانے شیعہ کے گرد جمع ہونے شروع ہوئے اور یہ جمعیت الانصار کی ابتداء
ہے جو ۲۷ رمضان ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مدرسہ عالیہ
میں منعقد ہوئی۔“ (القاسم ص ۱۱)

ان تحریروں سے تشکیل انجمن کی پوری روئداد سامنے آگئی جس میں بتایا گیا ہے
کہ اس قسم کی انجمن کو جنم دینے کے لئے عرصے سے دماغ میں خیالات کی کچڑی پک رہی
تھی۔ اور بالآخر وہ وجود میں آگئی۔ انجمن کے اغراض و مقاصد مرتب ہوئے جو مذکورہ
رپورٹ میں تفصیل سے درج ہیں۔ قواعد و ضوابط اور قوانین ترتیب دے گئے۔
اور اسی ”الانصار“ کے ماتحت چھ شعبے قائم کئے گئے۔ یہ رپورٹ اس وقت
میرے سامنے ہے اور میں نے اس کے تمام اطراف و جوانب پر غور کیا ہے اور راقم
الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس انجمن کو پھر زندہ کر کے اس کی سکیم کو از سر نو چلایا
جائے۔ جو چھ شعبے اس جمعیت میں قائم کئے گئے ان کے متعلق دفعہ ۶ کے ماتحت
مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں :-

”جمعیت (الانصار) اپنے فرائض (یعنی مدرسہ کی تعلیمی انتظامی،
مالی ترقی کی تعیین و تشخیص کے لئے پانچ شعبے قرار دیتی ہے (الف) تکمیل
التعلیم (ب) نظام التعلیم (ج) الارشاد (د) التالیف والاشاعت
(ه) جلسہ علمیہ۔ (روئداد مؤثر الانصار مراد آباد ص ۱)

یہ پانچ شعبے اپنے اندر انقلاب کی ہمہ گیر قوت کے حامل ہیں۔ اسی کے قواعد
و ضوابط کے ضمیمے میں آگے چل کر قاعدہ و دفعہ ۷۶ میں رپورٹ لکھتے ہیں :-
”جمعیت الانصار کا وہ جلسہ علمیہ جس میں (الف) قرآن شریف و حدیث
شریف کے اسرار و لطائف بیان ہوں (ب) اصلاح عقائد و اخلاق

اعمال کے متعلق علمی مضامین پڑھے جائیں (ج) مسلمانوں کی مذہبی علوم و معارف کی حفاظت و اشاعت کے وسائل پر عموماً اور مدارس و مساجد کی اصلاح و عمارت پر خصوصاً بحث و مشورہ ہو (د) ان تجاویز پر عمل کرنے کا تہیہ کیا جائے مگر الانصار کے نام سے موسوم ہو گا۔

(رپورٹ موثر الانصار ص ۱۲)

غرض یہ کہ دارالعلوم میں ایک خاص حرکت پیدا ہوئی اور ۱۳۲۴ھ میں جب کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مدرسہ فقہ پوری دہلی میں ملازم تھے دارالعلوم میں انقلابی ہوا یہی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس اشار میں علامہ دہلی سے جمعیت الانصار میں شرکت کرنے کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ یہاں سے حضرت عثمانی کی شہرت میں مزید اضافہ شروع ہوا۔ کیونکہ آپ بھی ”الانصار“ کے ایک ممتاز ممبر بنائے گئے۔ مولانا عبید اللہ صاحب نے رپورٹ میں اس حقیقت کا نشان اس طرح دیا ہے لکھتے ہیں :-

”اور ایک مجلس علم و نفاذ نظام مدرسہ اور طرز تعلیم کے بارے میں غور و فکر کے جمعیت الانصار کے ارکان ذیل سے مرکب کی گئی :

مولانا مولوی ناظر حسن صاحب ، مولانا مولوی رفیع حسن صاحب۔

مولانا شاہ وارث حسن صاحب باری ، مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب کشمیری۔

مولانا مولوی حسین احمد صاحب ملنی ، مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب بھابھاپوری

مولانا اصغر حسین صاحب دیوبند ، مولانا مولوی شبیر احمد صاحب دیوبند

عبید اللہ ناظم جمعیت الانصار“ (رپورٹ صفحہ ۵۵)

مذکورہ فہرست سے مولانا عثمانی کا انجن انصار نیز اصلاح تعلیم کی کمیٹی

میں ہونا صاف ظاہر ہے۔

ابھی آپ دہلی کے مدرسے سے وابستہ تھے کہ اصلاح تعلیم کی کھٹی کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ نے

جمعۃ الانصار میں حضرت عثمان کی شاندار خدمات ؛

۱۱۔ ۱۲ محرم ۱۳۲۸ھ کی میٹنگ میں شرکت فرمائی۔ اس میٹنگ میں جو بغرض اصلاح نصاب و طریقہ تعلیم و تعلم منعقد کی گئی تھی نہ صرف کھٹی کے مذکورہ بالا افراد شامل ہوئے بلکہ دیگر حضرات کو بھی مشورہ کے لئے دعوت دی گئی۔ رپورٹ کے صفحہ چھپن (۵۶) پر اس کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں حسب ذیل حضرات کے دستخط ہیں جنہوں نے اس میں شرکت کی :

”محمد ناظر حسن ، صدیق احمد عفا اللہ عنہ بقلم خود ، محمد اشرف علی عفی عنہ ، احمد حسن امروہو غفرلہ ، خلیل احمد غفرلہ ، محمود حسن عفی عنہ ، عبید اللہ ، ابو محمد احمد عفی عنہ ، عبدالمومن محمد کفایت اللہ ، جاگسا سراج احمد عفی عنہ ، بندہ محمد امین عفی عنہ ، محمد سہول عفی عنہ ، وارث حسن عفی عنہ ، عبد الصمد عفی عنہ ، احقر الزمان گل محمد خان عفی عنہ ، بندہ محمد تقی احسن عفی عنہ ، کفایت اللہ گنگوہی ، اختر الطلحہ حسین احمد غفرلہ ، عبد الوحید عفی عنہ ، محمد قدرت اللہ غفرلہ ، عبد الرحمن کان اللہ ، ولوالدیہ وجميع المؤمنين ، احقر محمد انور عفا اللہ عنہ ، بندہ محمد فرغام الدین عفی عنہ ، عاشق الہی عفی عنہ میرٹھی ، بندہ عزیز الرحمن عفی عنہ دیوبندی ، شبیر احمد عفی عنہ ، حبیب الرحمن عفی عنہ ، احمد مہتمم مدرسہ دیوبند۔“

ان اسمائے گرامی کی فہرست میں جو اس میٹنگ میں شریک ہوئے مولانا عثمانی کے بھی دستخط موجود ہیں۔ ۱۱۔ ۱۲ محرم سے گذر کر یہ جلسہ ۱۳ محرم تک گذر گیا اور بقیہ کاروائی عمل میں لائی گئی۔ ۸ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو سیمر جلسہ ہوا جس میں

انباتے قدیم اور نواب محی الدین صاحب قاضی ریاست بھوپال، حاجی سعید صاحب
اتالیق نواب مالیر کو ٹلہ موہ سرپرست حضرات اور دستار بندی ہونے والے طلبہ
شامل تھے۔ اور اس روز مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جن کو رپورٹ میں مجلس کا
سرپرست لکھا گیا ہے، تقریر فرمائی اور یہی وہ مجلس ہے جس میں حضرت عثمانی کو
حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب نے خاص نوازش عارف بخشا۔ مولانا عبید اللہ
صاحب لکھتے ہیں :-

” حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب
مرحوم کی تصانیف کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولانا مولوی سید تقی حسن
صاحب سے فرمایا کہ مولوی شبیر احمد صاحب مدرس اول مدرسہ فتحپوری
دہلی کو چونکہ مولانا مرحوم کی کتابوں سے ایک خاص مناسبت ہے اس لئے
میں چاہتا ہوں کہ اپنا عمامہ ان کو دوں۔ آپ اس امر کا اعلان فرمادیں۔
مولوی مرتضیٰ حسن صاحب نے حضرت مولانا کی اس قدر افزائی کا اعلان
فرمایا اس کے بعد حضرت سلطان العلماء (مولانا محمود حسن صاحب
شیخ الہند) مدظلہم سے اجازت لیکر مولانا اشرف علی صاحب عم فیضہم
نے اپنا عمامہ مولوی شبیر احمد صاحب نے سر پر رکھا۔“ (رپورٹ صفحہ ۶)

یہ عزت افزائی کا واقعہ ہندوستان کے چیدہ علماء کے
دلیوں میں آمد

چاند لگا دئے۔ اس کے بعد ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو ایک اور میٹنگ ہوئی
جس میں جمعیت الانصار کے تیس ارکان کے علاوہ حضرت شیخ الہند، مولانا مسعود
صاحب گنگوہی صاحبزادہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب، مولانا عبد الرحیم صاحب
رائے پوری وغیرہم شریک ہوئے۔ اس میں بھی علامہ عثمانی شریک تھے۔ یہ سب

مجالس اس زمانے میں ہوئیں جبکہ آپ کا تعلق ابھی دہلی سے تھا۔ لیکن اس کے بعد موصوف شوال ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئے کیونکہ ان حالات میں کسی نے بھی آپ کا دہلی رہنا پسند نہ فرمایا وجہ یہ تھی کہ ان جیسے اہم کاموں کو انجام دینے کے لئے ایک قادر الکلام مقرر اور انشاء پرداز کی ضرورت تھی اور وہ ان دونوں باتوں میں پوری مہارت رکھتے تھے۔

بعد ازاں ۱۵ رذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو درجہ تکمیل شعبہ تکمیل تعلیم کا افتتاح | کا افتتاح ہوا۔ اب حضرت عثمانی دارالعلوم

کے پروفیسر کی حیثیت سے دیوبند میں موجود ہیں۔ اس میں بھی آپ نے شرکت کی بلکہ اس کی رپورٹ خود مرتب کی۔ مولانا عبید اللہ صاحب رپورٹ میں لکھتے ہیں:

” ۱۵ رذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو عام جلسے میں درجہ تکمیل کا افتتاح ہوا،

جس کی روداد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی معتمد جمعیت الانصار کی لکھی ہوئی درج کی جاتی ہے۔“ (رپورٹ ص ۶۲)

یہ پوری کی پوری درجہ تکمیل کی رپورٹ حضرت عثمانی کی تحریک کی ہوئی ہو تو مراد انصاری مراد آباد کی روئداد میں درج ہے۔ جس میں اس کلاس کا نصاب درج ہے اور یہ بھی کہ اس درجہ کے طلبہ کے لئے ادب، تاریخ، تفسیر و کلام وغیرہ علوم کی مستند کتابوں کا مطالعہ، اردو عربی لٹریچر کی مہارت اور مناظرہ یا تدریس وغیرہ کی مشق کرنا واجبات میں سے قرار دیا گیا جو اس سٹینڈ کے بعد ۲۸ رذیقعدہ ۱۳۲۸ھ میں ایک مختصر سا اجلاس ہوا تھا جس میں مختلف قواعد منظور کئے گئے تھے۔

مولانا عثمانی دارالعلوم میں فرائض نہیں

کے ساتھ کہ جس میں آپ کئی کئی گھنٹے مختلف

کلاسوں کے پڑھاتے تھے جمعیت الانصار

مؤتمر الانصار مراد آباد

۱۵-۱۶-۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ

کے کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ گویا علمی، مذہبی، قومی و ملی اور وطنی تمام ہی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تاآنکہ الانصار کے ماتحت ہر سال میں کسی خاص شہر میں جلسوں کا کیا جانا بھی مقاصد میں آتا تھا اس لئے شوال ۱۳۲۵ھ میں مراد آباد کے چند ذی وجاحت حضرات کی کھینچی کی تحریک سے ۱۵-۱۶-۱۷ اپریل کی تاریخیں موثر الانصار کے لئے مقرر کی گئیں اور مراد آباد میں ہی پہلا جلسہ ہونا طے پایا۔ اس جلسے میں علامہ عثمانی نے اپنا معرکہ آرا مضمون ”اسلام“ کے عنوان سے پڑھا۔ ناظم جمعیت الانصار موثر کے رپورٹر روداد میں لکھتے ہیں :-

”آٹھ بجے مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی کھڑے ہوئے

اور اسلام کے عنوان پر اپنی تقریر شروع کی۔ یہ وہ زبردست تقریر ہے کہ جس

کی کوئی بات دلائل عقلیہ سے خالی نہیں۔ فلسفہ و حکمت اور علم کلام کے

ذریعہ سے جو آجکل تعلیم یافتہ گروہ کا تختہ مشق ہیں ان تمام اعتراضات کو

اٹھایا گیا جس کی نسبت مولوی حالی نے عربی تعلیم یافتہ گروہ کو بیکار سمجھا کہ

اپنے مسدس میں کہا تھا کہ وہ دلائل سے حقیقت اسلام اور ضرورت نبوت

درسالت کو بھی ثابت نہیں کر سکتے اور نہ ان کے پاس اس کا ذخیرہ ہے“

(رپورٹ)

علامہ کا یہ مضمون ۱۵ اپریل کے تیسرے اجلاس میں صبح کے وقت آٹھ بجے پڑھا

گیا اور دس بجے ختم ہوا۔ اس جلسے میں علیگڑھ، ندوہ، دیوبند کے اکابر اور اعظم

رجال جمع ہوئے تھے، علامہ شبلی بھی موجود تھے۔ حضرت عثمانی کے اس مقالے کا

سب پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہندوستان کے عوام اور خواص طبقے میں ان کی عظمت

و شہرت نے اس مقالے سے ہی ملک میں شہرت حاصل کی۔ آپ کی تقریر کے اثر کا نقشہ مولانا

عبید اللہ صاحب رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں :-

”اکابر علماء نے اس تقریر کو جس ذوق و شوق سے سنا اس کا اندازہ

اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت مولانا محمد اشرف صاحب نے اپنا
وخط شروع کیا تبھی یہ بات فرمائی کہ جو دلائل عقلیہ وجود صالح حقیقی
اور ضرورت نبوت و رسالت پر مولوی شبیر احمد صاحب نے بیان فرمائے
ہیں میں اب ان سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا اشرف صاحب کا یہ
فرمانا اگرچہ انکسار پر مبنی تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ مولوی شبیر احمد صاحب
جس خوبی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہ تقریر فرمائی وہ تمام اہل علم حضرا
کے دل پر نقش کا لجر ہو گئی دس بجے یہ تقریر ختم ہوئی اور تمام حاضرین
جلسہ نے مولوی شبیر احمد صاحب کی دد ازی عمر کے واسطے دعا کی (صفحہ ۱)

مؤتمر الانصار کا یہ اجلاس مولانا عثمانی کی زندگی کو چمکانے کا سبب بن گیا۔
ملک کے زبردست اور جید علماء، لیڈر، رؤسا اور عوام سے تعارف کا موقع ملا
اور ہندوستان میں شہرت کا ذریعہ بنا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔
چوتھے اجلاس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر ایک خصوصی اجلاس اہل علم کا ہوا جس میں علامہ
عثمانی نے تقریر فرمائی۔ رپورٹر لکھتے ہیں :-

”بعد نماز عصر مولوی شبیر احمد صاحب کا خطاب وجود واجب الوجود اور بحث
خلق افعال وغیرہ سے متعلق بالکل فلسفیانہ رنگ میں ہوا جو مخصوص اہل علم
کے لئے تھا۔ اور انہوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کو سنا“ (رپورٹ صفحہ ۱۴)
اس تقریر سے اندازہ لگائیے کہ اتنے بڑے بڑے علماء میں ایک چوبیس سالہ
نوجوان عالم ایک خالص علمی اور فلسفیانہ تقریر کر کے اکابر سے داد لیا وقت لے رہا ہو۔
مؤتمر الانصار مراد آباد کے بعد

کراچی میں علامہ عثمانی کا آریوں کا مناظرہ
رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ اکتوبر ۱۹۱۱ء
علامہ آریوں سے مناظرہ کے لئے
تشریف لے گئے۔ القاسم شوال

۱۳۲۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۲ء میں اس مناظرے کی کارروائی کا حسب ذیل عبارت میں اظہار کیا گیا ہے۔ مدیر القاسم لکھتے ہیں :-

”کراچی میں آریہ جماعت کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا اور اس میں اہل اسلام سے مناظرہ کی قرارداد ہوئی۔ تب انجمن ضیاء الاسلام کراچی کی جانب سے مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی عثمانی مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند کی طلب میں تار آیا۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف ۲۲ رمضان کو کراچی روانہ ہوئے۔ اور وہاں محمد النثر مولوی صاحب کے نہایت مؤثر بیانات ہوئے جو بہت ہی دلچسپی سے سنے گئے۔ اور اہل کراچی پر ان بیانات کا گہرا اثر پڑا اور مولوی صاحب ہی کی موجودگی میں جمعیت الانصار کی شاخ قاسم المعارف کا یا ضابطہ انعقاد و افتتاح ہوا۔ ۲۸ رمضان ۱۳۲۹ھ کو عین تراویح کے وقت سیکرٹری صاحب انجمن ضیاء الاسلام کا تار بدیں مضمون موصول ہوا کہ مولوی شبیر احمد صاحب نے نہایت کامیابی حاصل کی اور آج کی میل سے روانہ دیوبند ہو گئے۔ ۳۰ رمضان کو دس بجے دن کے مولوی صاحب موصوف بخیریت تمام دیوبند پہنچے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک“

(القاسم شوال ۱۳۲۹ھ ص ۵)

آپ کی شہرت کے نتیجے میں اہل کراچی نے آپ ہی کو مناظرے کے لئے منتخب کیا۔ حالانکہ رمضان مبارک کا مہینہ تھا لیکن اس مشقت کو برداشت کیا اور فوراً برابر سفر میں رہے۔ اسی عبارت سے ظاہر ہے کہ آپ کی وجہ سے وہاں جمعیت الانصار کی شاخ قاسم المعارف قائم ہوئی۔

مراد آباد کے جلسے سے ٹھیک ایک سال بعد جمعیت الانصار کا ایک جلسہ

۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء

مؤتمر الانصار میرٹھ ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ اپریل

میرٹھ صدر میں ۱۷-۱۸-۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ مطابق ۶-۷-۸ مارچ ۱۹۱۲ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے کی کارروائی مولانا سراج احمد صاحب نائب ناظم جمعیت الانصار و نائب مدیر خیر سالہ القاسم جہادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ میں شائع کی ہے۔ یہ جلسہ تین دن رہا اور کل پانچ نشستوں میں ختم ہوا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جلسہ کے صدر تھے لیکن مولانا احمد حسن صاحب کا اس سے پہلے ہی ۱۳۳۰ھ میں انتقال ہو چکا تھا جنہوں نے مراد آباد کے مومنانصار کی صدارت بھی فرمائی تھی اور تقریر بھی کی۔ آپ کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی، مولانا تفضی احسن صاحب چاند پوری کی دوسرے اجلاس میں تقریریں ہوئیں۔ ۸ ربیع الثانی بروز اتوار ۱۳۳۲ھ اجلاس میں مولانا عثمانی کی تقریر ہوئی۔ مولانا سراج احمد صاحب لکھتے ہیں کہ

”مولوی قاری محمد رفیع بدھانوی کی تلاوت کلام مجید سے آغاز جلسہ ہوا۔ آپ نے قرأت سبعہ میں قرآن شریف۔ پھر مولوی قاری احمد موسیٰ صاحب امام جامع مسجد کلمتہ نے عربی لہجہ میں اور پھر حیدر طلبائے دارالعلوم دیوبند نے مختلف قراءتوں میں کلام مجید پڑھا جس سے اہل جلسہ پر ایک خاص اثر اور درافتگی کا عالم تھا۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی مدرس دارالعلوم دیوبند نے اپنا وہ تقریر شروع کی جس کا عنوان ”الدرار الآخرة“ ہے۔ عنوان بتلا رہا ہے کہ مضمون کیا کچھ دقیق ہوگا۔ ادھر مولانا کا طرز تقریر و تحریر فلسفیانہ بمشکل تھا کہ عوام اس مضمون سے متبع ہوتے۔ مگر جہاں مولانا کی تقریر فلسفیانہ ہے وہاں خدائے تعالیٰ کے فضل سے طرز ادا بھی ایسا عام فہم ہے کہ اس کی نظیر دوسری جگہ مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپ نے دارالآخرت کے ثبوت اور ضرورت پر تسکین بخش بحث فرمائی۔ اور درمیان میں بفرورست

اثبات مدعا ابطال تناسخ پر متحد دلائل قائم کئے۔ آپ کی تقریر سے مؤتمر الانصار اور دارالعلوم دیوبند کی ایک خاص شان ہویدا تھی اور سامعین محو حیرت تھے۔ اس کے بعد حضرت طیب الامت مولانا مولوی اشرف علی صاحب مدظلہم العالی کا وعظ شروع ہوا..... وعظ شروع کرنے سے پہلے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو اپنے برابر کھڑا کیا اور فرمایا "میں اپنے چھوٹوں کو بھی بڑا سمجھتا ہوں۔ اگر میرا کوئی معتقد نہ مانے تو وہ جانے میں تو یہی خیال کرتا ہوں۔ یہ مولوی شبیر احمد صاحب جن کی تقریر آپ نے سنی ہے میرے چھوٹے ہیں مگر میں ان کو بڑا سمجھتا ہوں۔ ان کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ یہ سب کچھ کر لیں گے۔ اب ہم کو موت کا ڈر نہیں باہر، کیونکہ ہماری جماعت میں کام کے آدمی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ بعد مولانا نے دعا کی۔ بعد خطبہ ماثورہ پڑھ کر وعظ شروع کیا کہ میرا یہ بیان گویا مولوی شبیر احمد کی تقریر کا تتمہ ہے۔"

(القاسم دیوبند جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء)

جمعیت الانصار کے سالانہ اجلاس میرٹھ صدر بھی علامہ موجود ہیں اور ان کے مقالے کا جواثر علماء و خواص و عوام اور بالخصوص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب پر ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ حضرت عثمانی کی یہ بڑی سعادت ہے کہ وہ ہر جلسے میں مولانا تھانوی سے داد اور دعا وصول کر رہے ہیں اور خواص و عوام میں مقبول ہو رہے ہیں۔ آپ کا یہ مقالہ رسالہ القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ اور القاسم ماہ رجب ۱۳۳۲ھ کے صفحات پر دو قسطوں میں شائع ہوا ہے، اور جس کے بعض اقتباسات ہم نے تجلیات عثمانی میں پیش کئے ہیں۔

ان جلسوں میں بعض اکابر کو چھوڑ کر جتنا مولانا عثمانی کو سراہا گیا ہے اتنا دیکھو

مؤتمر میں اور القاسم میں کسی اور کو نہیں سراہا گیا۔ ہر جلسے میں انہی کا طوطی بولتا نظر آتا ہے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمن صاحب مدیر القاسم نے آپ کے اس مقالے کے اول میں ناظرین القاسم سے مقالے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

”مضمون ذیل عزیز مولوی شبیر احمد سلمہ نے اجلاس مؤتمر الانصار میرٹھ

میں پڑھا تھا۔ چونکہ یہ ایک مفید اور کارآمد مضمون ہے اور بعض ہی خواہاں

قوم کا تقاضا بھی ہے اس لئے القاسم میں اس کا درج کرنا قرین مصلحت

معلوم ہوا۔“ (مدیر) (القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ ص ۹)

علامہ نے یہ مقالہ جلسے سے تین روز پہلے لکھا تھا۔ چنانچہ اس کی تمہید

میں لکھتے ہیں :

”ہمارے محترم بزرگ مولانا عبید اللہ ناظم جمعیت الانصار جنہوں نے

کسی نامعلوم مصلحت اور حسن ظن کی بنا پر یہ عنوان میرے سپرد کیا ہے اس

کے گواہ ہیں کہ میں نے اس مضمون کے لکھنے سے کس وقت تک اور کس حد

تک پہلو تہی کی ہے لیکن آخر مولائے موصوف کے تقاضے میرے تکاسل

اور تقاعد پر غالب آئے اور جلسے سے تین روز پہلے بنام خدا یہ تحریر

لکھنا شروع کی۔“

بہر حال ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان تاریخی جواہر پاروں کو میں ترتیب

کے ساتھ خبر بڑا ہوں کہ قارئین کو موصوف کے کارناموں اور مذہبی، علمی، دینی

اور قومی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔

جس طرح مراد آباد اور میرٹھ کے حضرات کی

خواہشات اور کوششوں سے ان دونوں

مقامات پر جمعیت الانصار کے جلسے منعقد ہوئے

جمعیت الانصار کا علمی جلسہ

شعبہ میں۔ ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء

اسی طرح اہل شملہ کی خواہشات پر جمعیت الانصار کا علمی جلسہ ۹-۱۰-۱۱ اگست ۱۹۱۳ء مطابق شعبان ۱۳۳۱ھ میں منعقد ہوا۔ مولانا مظہر الدین شیرکوٹی شہید سفیر جمعیت الانصار کی شملہ میں تقریریں ہوئیں۔ اور انہی کی مساعی سے علمائے دیوبند وہاں پہنچے۔

۸ اگست کو شملہ کے اسٹیشن پر وفد علمائے دیوبند کا اتنا زبردست استقبال ہوا کہ اس سے پہلے ایسا شاندار استقبال کسی کا نہ ہوا تھا۔ شملہ اسٹیشن بھرا ہوا تھا کہ دو بیکر دو منٹ پر کلمتہ میل اسٹیشن پہنچی۔ یہ وفد اتر کر میر نادر حسین صاحب رئیس شملہ کے یہاں ٹھہرا۔ سالار وفد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تھے۔ آپ کی گاڑی کو آدمیوں نے کھینچنا چاہا لیکن آپ نے منع فرمادیا۔ اس جلسے کے چھ اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس بعد نماز جمعہ ۹ اگست کو ۲ بجے سے پانچ بجے تک ہوا۔ پہلے خان بہادر کرنل عبد المجید خان نے دارالعلوم دیوبند کے برکات اور خدمات پر تقریر فرمائی۔ اس جلسے میں اتفاق سے شیخ الاسلام افغانستان بھی موجود تھے جو دیوبند کے فاضل تھے بعد ازاں حکیم الامت نے تقریر فرمائی جس نے لوگوں پر جادو کا کام کیا۔ دوسرے اجلاس میں مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے قرآن شریف کے اعجاز اور عربی زبان کی ضرورت پر تقریر فرمائی۔ تیسرے اجلاس میں مولانا مرتضیٰ احسن صاحب نے اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وعظ فرمایا اور ان کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے معجزات کی بحث پر ایک زبردست مدلل تقریر فرمائی جو تھے اجلاس میں مولانا محمد سہول صاحب نے علم کے فضائل اور مولانا مرتضیٰ احسن صاحب نے تعلیم نسواں پر تقریر فرمائی۔ پانچویں اجلاس میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے ”مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کی ضرورت“ پر تقریر فرمائی۔ بعد مولانا تھانوی نے ”تکمیل فلاح دارین کے وسائل“ پر وعظ فرمایا۔ عبد القادر صاحب جن کی مذکورہ بالا رپورٹ القاسم رمضان ۱۳۳۱ھ میں چھپی ہے وہ اپنی اسی رپورٹ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

”یہ (پانچواں) اجلاس آخری تھا اور اس کے بعد کوئی وقت پروگرام میں نہیں دیا گیا تھا لیکن سامعین کے بے حد اصرار پر مولانا منظر الدین صاحب نے ساڑھے نو بجے شب کے جلسے کا اعلان کیا جس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ پر نہایت پُر مغز اور موثر تقریر فرمائی۔ آپ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ عقلاً و نقلاً اگر کوئی مذہب حق ہو سکتا ہے تو وہ اسلام ہے۔ (القاسم رمضان ۱۳۲۲ھ ص ۷)

یہ جلسہ نہایت ہی عظمت اور کامیابی سے ختم ہوا اور علمائے دیوبند ۱۲ اگست کو شملے سے دیوبند واپس ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان اجلاسوں میں بعض حضرات کی اگرچہ دود و تقریریں ہوتیں لیکن پانچویں اجلاس پر پروگرام ختم ہو جانے کے باوجود اہل شملہ نے جس فاضل کی تقریر کے لئے دوبارہ پوری تمنا اور خواہش سے اصرار کیا وہ علامہ عثمانی تھے۔ یہاں مجھے پھر اطلاع دینی ہے کہ علامہ اس جلسے میں بھی برابر شریک ہیں اور لسانی جہاد میں مصروف ہیں اور وہ کبھی جلسے سے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جس سے ان کی سرگرمیاں اور محنت پسندیاں متضح ہوتی ہیں۔

جمعیۃ الانصار کا یہ جلسہ ۲۷-۲۸-۲۹ شعبان ۱۳۲۲ھ مطابق ۱-۲-۳ اگست ۱۹۱۳ء شملہ میں جمعیۃ الانصار کا ایک اور جلسہ شجیان ۱۳۲۲ھ اگست ۱۹۱۳ء

منعقد ہوا۔ اس وفد میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا عبد السمیع صاحب اور مولانا منظر الدین صاحب تھے۔ پہلا اجلاس یکم اگست کو بعد نماز جمعہ ہوا۔ دوسرا اجلاس رات کو جس میں مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا عبد السمیع صاحب نے تقریریں کیں۔ تیسرا اجلاس ہفتہ کو ۲ بجے ہوا اس میں علامہ عثمانی کی تقریر ہوئی۔ اس جلسے کے رپورٹر عبد القادر

صاحب نائب منیجر آرمی پریس شملہ تحریر فرماتے ہیں :-

”فصح الیام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا برکات رمضان شریف“

پر وعظ شروع ہوا۔ آپ کی تقریر نہایت دل فریب تھی اور ہر سرجیل سے فصاحت
ٹپکتی تھی۔ علمی نکات کا ذہن نشین کرنا آپ کا حصہ تھا۔ ۲۲ اگست کے جلسے
میں پہلے مولانا عبدالمسیح صاحب نے وعظ فرمایا اور بعد کو مولانا شبیر احمد
صاحب عثمانی نے ”حدوث عالم“ پر اپنی مدلل تقریر شروع کی۔ اگرچہ مضمون
فلسفی اور نہایت خشک تھا مگر آپ کی صاف بیانی نے مجمع پر وہ جادو
کیا کہ سب محو حیرت تھے۔ زور کلام سے سامعین نقش تصویر کی طرح خاموش
تھے۔ کہیں کہیں آپ کی تمثیلیں اس غضب کی تھیں کہ لوگ بھر پک اٹھتے
تھے۔ الحمد للہ کہ یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ لیکن سامعین کا شوق پورا نہ
ہوا۔ چنانچہ نو تعلیم یافتہ گروہ کی طرف سے یہ درخواست کی گئی کہ مولانا
شبیر احمد صاحب عثمانی ایک تقریر ہمارے تنزل و ترقی کے اسباب پر آج
بعد مغرب فرمائیں۔ مولانا نے اس کو منظور بھی فرمایا لیکن بعد میں خیال
آیا کہ آج ۲۹ شعبان ہے اور چاند ہونے کا احتمال ہے اس لئے یہ آرزو پوری
نہ ہو سکی۔ اور اگلے روز مسلمانان شملہ کو حضرات دیوبند سراپا حشرت و ارمان
بنا کر رخصت ہو گئے۔“

عبدالقادر نائب

منیجر آرمی پریس شملہ

تائب صاحب کی رپورٹ آپ کے سامنے ہے۔ اس سال کے جلسہ الانصار
بھی علامہ اپنی پوری شان امتیازی سے شریک تھے۔ آپ کی دو تقریریں ہو چکنے کے
باوجود اہل شملہ نے آپ سے ایک اور تقریر کرنے کی خواہش کی ہے۔ یہ بار بار کی

فرمائیں آپ کے علم، تقریر کی بلندی و ازی اور دلربائی کے نشانات بتلا رہی ہیں۔ لیکن اس وفد میں مولانا عبید اللہ صاحب ^{مفت} نظر نہیں آ رہے ہیں۔ خدا خیر کرے کہیں جمعیت الانصار نظر بد کا شکار ہوتی تو نظر نہیں آتی۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ تاہم انشا اللہ ابھی ظہور میں آیا جاتا ہے۔ اس راز سے پردہ اٹھانے سے پہلے مجھے یہ کہنا ہے کہ علامہ کے حالات کے سلسلے میں ترتیب وار بعض ذاتی سوانح اور بھی بیان کرنے تھے کہ بموت مر الانصار کے سن وار حالات کا سلسلہ توڑنا پسند نہ آیا اور بعض وہ حالات رہ گئے جن کو ۱۳۲۸ھ کے ماتحت پیش کیا جاتا تھا۔ کیونکہ جمعیت الانصار کے ساتھ علامہ عثمانی کی بقیہ کوششوں کو آخری تک بیان کرنے کی ضرورت پیش نظر ہے۔ اس لئے اے ختم کر لیں تو آگے بڑھیں۔ ان تو شملہ کے اس آخری جلسہ میں ناظم جمعیت الانصار برات کے دولہا، مولانا عبید اللہ غائب ہیں۔ اور پھر پورا سال ہو چکا کوئی سینک، کوئی مؤتمر الانصار اور کوئی اس کی کارروائی القاسم میں اور نہ روئداد میں نظر آئی۔ اتنی شوراشوری اور یاباں بے نمکی پر شبہات کا ہونا اور دوسو سوں کا گزرنالازمی امر ہے۔ آخر برات کا دولہا کہاں غائب ہوا۔ بالآخر ان کا پتہ چلا کہ دہلی میں موجود ہیں

جو بچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مولانا سندھی کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی

دیوبند سے مولانا سندھی دہلی چلے گئے۔ آپ کا ایک بیان اخبار الجمعیت دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اور پھر رسالہ قائد مراد آباد کے ربیع الاول کے پرچے میں

نکلا۔ یہ بیان آپ نے ہندوستان کی طویل جلاوطنی سے واپسی کے بعد دیا تھا جو حسب ذیل ہے :-

”سنہ ۱۳۲۶ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لئے حکم دیا۔ چار سال تک جمعیتہ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق سندھی اور مولانا ابومحمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ سنہ ۱۳۳۱ھ تا ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔“

حضرت شیخ الہندؒ نے اس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔ سنہ ۱۳۲۳ھ تا ۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان میں پہنچ گیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کاب جانا طے ہو چکا ہے انہوں نے بھی اپنا نمائندہ بنایا

مگر کوئی معقول پروگرام ذہ بھی نہ بتا سکے۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی تختوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تحصیل حکم کے لئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر ہر محسوس ہونے لگا۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کے حکم پر مولانا عبید اللہ دہلی چلے گئے۔ وہاں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں اور انقلاب و سیاست کا دھارا دوسری طرف کو بہنے لگا۔ جمعیت الانصار کی بجائے اب ”نظارۃ المحارف“ کی بنیاد ڈالی گئی مگر یہ انجمن سازیاں، یہ جمعیت الانصار کے جیسے، یہ ملک میں مذہبی بیداری کی روح نہیں بلکہ صورت کیوں بھونکا جا رہا ہے۔ اس کی کیفیت حکومت برطانیہ کی رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے سنئے۔ کمیٹی لکھتی ہے :-

ریشمی خطوط کی سازش یا تحریک :

”اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں ریشمی خطوط کی سازش کہلاتی ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لئے ایک شخص مولوی عبید اللہ نے اپنے تین رفقاء فتح محمد اور محمد علی وغیرہ کو ساتھ

لیکر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبید اللہ سیکھے مسلمان ہوا ہے اور صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی تھی وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے معلمہ مدرسہ کے خاص لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس نے اس پر اثر ڈالا وہ مولانا محمود الحسن تھا جو سکول میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکے تھے۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلا دے لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سدراہ ہوتے۔ انہوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔

رولٹ ایکٹ کھٹی کی مذکورہ بالا رپورٹ

رولٹ ایکٹ کا تجزیہ | میں یہ بتایا گیا ہے کہ مولانا عبید اللہ اس انقلاب کے بانی تھے، یہ غلط ہے بلکہ خود مولانا عبید اللہ صاحب کا بیان کہ شیخ الہند نے مجھے ۱۳۲۷ھ میں کام کرنے کے لئے بلایا تھا رولٹ ایکٹ کھٹی کی رپورٹ کی تغلیط کرتا ہے۔ کھٹی کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ مولانا عبید اللہ کو برخاست کیا گیا بلکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ تھے۔ ہاں دیوبند کے فاضل اور شیخ الہند کے جان نثار اور معتمد ہونے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور محرک خود شیخ الہند تھے۔ چنانچہ مولانا سندھی کو جب کابل بھیجا گیا تو انہیں اپنے پروگرام کا خود پتہ نہ تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچ گئے تو پھر ان کے سامنے وہ تمام سکیم آگئی جو شیخ الہند چلانا چاہتے تھے۔

شیخ الہند کی سکیم | رولٹ ایکٹ کھینٹی کا یہ بیان درست ہے کہ شیخ الہند ہندوستان
 سے حکومت برطانیہ کا بستر گول کرنا چاہتے تھے۔ اور اس
 کے لئے قبائلی علاقے کے چٹھانوں، کابل، ایران اور ترکی حکومت میں اتحاد پیدا کر کے
 ان کے تعاون سے انگریزوں کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں شیخ الہند
 ۱۹۱۶ء میں حج کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں مکہ معظمہ کے ترکی گورنر
 ۱۳۳۳ھ غالب پاشا سے ملے اور تمام سکیم سے ان کو آگاہ کیا۔ اور ان کی وساطت سے انورشا
 اور جمال پاشا سے مدینہ منورہ میں جبکہ وہ بعض جنگی ضروریات کے باعث اتفاقاً
 وہاں آئے تھے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے بھی شیخ کی تجویزوں سے اتفاق
 کیا تھا۔ ان حضرات کی رائے یہ تھی کہ شیخ الہند خود ترکستان، ایران اور کابل کے راستے
 قبائلی علاقے میں پہنچیں لیکن ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ کرنل لائرس نے شریف حسین
 والی سکیم کو ہوا کر لیا۔ حجاز میں اس وقت ترکی اقتدار تھا لیکن شریف حسین
 نے ترکوں سے غداری کی اور اس طرح انگریزی اقتدار نے حجاز میں پاؤں جمائے
 اور ترکوں کی حکومت حجاز سے ختم ہو گئی۔ حضرت شیخ الہند حجاز سے باہر نکلنے کی
 کوشش میں ناکام رہے اور بالآخر حکومت برطانیہ کے اشارے پر شریف مکہ نے
 ان کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ تفصیلات کے لئے حضرت مولانا
 حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سفر نامہ ”اسیر مالٹا“ اور ”مسلمانوں کا
 روشن مستقبل“ اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات
 شیخ الہند ملاحظہ فرمائیے۔ بالآخر شیخ الہند کو انگریزوں نے مالٹا میں اسیر کر دیا
 اور آپ پانچ سال تک نظر بند رہ کر پھر دیوبند تشریف لائے۔ اس تحریک کے
 ضمن میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ آزادی کے پہلے علمبردار شیخ الہند جن کے
 بنیادی تصورات پر مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور

مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے آزادی ہند کی تعمیر بندی کی۔

جمعیت الانصار نے علمائے دیوبند کے ذریعہ ہندوستان
جمعیت الانصار کا انجام | کے علماء، لیڈروں، عظام اور مقتدر طبقے میں ایک

اسلامی جوش برپا کر دیا۔ یہی وہ زمینہ تھا جس کے ذریعہ شیخ الہند بام آزادی پر
 چڑھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جمعیت الانصار کے چند جلسوں نے ہندوستان کے
 مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

ان جلسوں کے ضمن میں مختلف ریزولوشنوں کے ذریعہ گورنمنٹ برطانیہ
 کی وفاداری کا اظہار اور اس کے زیر سایہ مذہبی آزادی کے شکریے کے تاہیجے
 گئے جیسا کہ رونا دہنو ترمز الانصار اور رونا دہنو جلسہ ہائے شملہ کی تجویزوں میں یہ
 چیزیں موجود ہیں لیکن گورنمنٹ برطانیہ ان جلسوں سے چوکنی ضرور تھی۔ وہ
 جانتی تھی کہ اس مدرسے کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب انگریزی حکومت کے
 سخت مخالفین میں سے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی میں
 اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور انہیں کے نقش
 قدم پر شیخ الہند چل رہے تھے۔ چنانچہ مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے جب آپ کو
 قاہرہ لے جایا گیا اور وہاں شیخ الہند سے سوال وجواب کئے گئے تو ان میں سے ایک
 سوال یہ بھی تھا :-

سوال انگریز آفیسر : مولوی عبید اللہ نے دیوبند میں جمعیت الانصار
 کیوں قائم کی تھی۔

جواب شیخ الہند : مدرسہ کے مفاد کے لئے۔

سوال : پھر کیوں علیحدہ کیا گیا۔

جواب : آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

سوال : کیا اس کا مقصد اس جمعیت سے کوئی سیاسی تھا۔

جواب : نہیں۔

بہر حال جمعیت الانصار سے حکومت کے دل میں بے اطمینانی تھی۔ یہ معاملات آگے بڑھ رہے تھے کہ ہتم صاحبان نے بڑھتی ہوئی سیاسی کارروائیوں کی مخالفت تو نہیں کی لیکن مدرسہ کے بچاؤ کے لئے یہ ضرور چاہا کہ مدرسہ مسلمانوں کی متاع عزیز ہے اگر یہ بند ہو گیا تو پھر مسلمانوں میں دینی تعلیم پھیلانے کا سرخیمہ بند ہو جائے گا اس لئے مدرسہ کے اندر اس راہ سے آزادی کی سرمد جنگ کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ضرورت تھی۔ شیخ الہند بھی غلط راہ پر نہ تھے، وہ خیال کرتے تھے کہ استاد محترم مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد دیوبند کے مدرسہ سے جہاں تعلیم دین کی اشاعت تھا وہاں حضرت مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب دہلوی جیسے لوگوں کے جذبہ جہاد اور روح حریت کو برقرار رکھنا بھی تھا اس لئے ہتم صاحبان کے نزدیک مدرسہ کی حفاظت اور شیخ الہند کے نزدیک دین کے ساتھ جذبہ جہاد و آزادی کی روحانیت کے برقرار رکھنے میں ایک گونہ نظریاتی اختلاف پیدا ہونا لازمی بات تھی۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو دیوبند سے دہلی بھیج دیا اور جمعیت الانصار کو نظارہ المعارف میں تبدیل کر دیا۔ اس صورت کو رد و لٹ ایکٹ کھینچی کے ارکان نے مولانا عبید اللہ اور ان کے ساتھیوں کو دیوبند کی ملازمت سے برخاست کر دینے کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

جمعیت الانصار کے جلسوں کے مسلمانوں

مسلمانوں کا جمعیت الانصار سے تعلق | میں عام بیداری اور اسلامی جوش

پیدا ہو چکا تھا۔ مولانا عبید اللہ دیوبند سے جا چکے تھے۔ جلسے بھی رفتہ رفتہ بند

ہو گئے تھے۔ شملہ کے بعد جمعیت الانصار کا کوئی جلسہ نہ ہوا۔ یہ آخری جلسہ ۱۳۲۱ھ میں ہوا تھا اس لئے مسلمانوں کی ایک تعداد نے دیوبند خطوط بھیجے اور دریافت کیا کہ جمعیت الانصار کے جلسے کیوں نہیں ہوتے۔ مسلمانان ہندوستان کی طرف سے یہ استفسار یقیناً درست تھا۔ لیکن ذمہ داران دارالعلوم نے اس کا کیا جواب دیا اس کی حقیقت کا پتہ چلا نا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لئے دارالعلوم دیوبند کے رسالے ”القاسم“ کے پرچوں سے زیادہ اور کوئی چیز درہمبری نہیں کر سکتی چنانچہ جس اور ریسرچ سے ہمیں استاذ محترم مولانا سراج احمد صاحب مرحوم کا مضمون مل گیا جو اس وقت جمعیت الانصار کے نائب ناظم اور القاسم کے نائب مدیر دیوبند کے اعلیٰ مدرسین میں سے تھے۔ لکھتے ہیں :-

” مدت سے القاسم کے صفحات جمعیت الانصار کے تذکروں سے خالی ہیں۔ عرصہ سے اس کا کوئی کارنامہ مسلمانوں کے روبرو پیش نہیں ہوا سال گذشتہ میں مؤتمر الانصار کا اجلاس کہیں منعقد ہونے سے بہت سے دردمندوں کو اس کے وجود سے وساوس پیدا ہونے لگے۔ اس پر جناب مولوی عبید اللہ صاحب حبیب علی گان وساوس کی پیدائش کا کہا جاتا ہے اچھا خاصا ذریعہ بن گئی۔ یہاں سے علیحدگی کے بعد مولوی عبید اللہ صاحب کے دہلی میں اپنی نئی انجمن قائم کرنے سے اور دو غلط فہمیوں کا فتح باب ہوا۔ کبھی کو کبھی سے یہ خبر ملی کہ جمعیت الانصار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی بجائے دہلی میں ”نظارۃ المعارف“ قائم ہو گئی۔ کسی کو یہ اطلاع پہنچی کہ نظارۃ جمعیت کا ایک شعبہ ہے جو بعض مصلح کی بنا پر دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔ بعض احباب نے بزرگان دارالعلوم سے مل کر زبانی طمانیت حاصل کر لی اور بعض دوستوں نے مراسلات کے ذریعہ سے تحریک اہلیتہ معلوم کی مگر عام مسلمانوں کو رفع غلط فہمی کا کوئی

موقع نہیں ملا ادھر استفسارات بھی زائد ہیں مصلحت ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔

جمعیت الانصارِ خدا کے فضل سے زندہ ہے۔ سال گذشتہ میں چونکہ جنگ بلقان کی وجہ سے ترک مظلوموں کی اولاد کی طرف عامہ مسلمین متوجہ تھے۔ ہر شہر، قصبہ اور اکثر دیہات میں ہلالِ احمر کی انجمنیں قائم تھیں، وفود جا بجا پھرتے تھے اور خود دارِ العلوم دیوبند اور اس کی جماعت کے اجزاء اس کا رخیرہ کرتے وقف تھے اس لئے قرین مصلحت نہ تھا کہ عامہ مسلمین کو دوسرے کسی خیال کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور درحقیقت جو حضرات مؤتمرا الانصار کے کارکن ہوتے ان کو اتنی فرصت کہاں تھی اور مظلوم ترکوں کی مرثیہ خوانی کے سوا کوئی دوسرا خیال کب ان کے دلوں میں خطور کر سکتا تھا چنانچہ چند اخباروں میں مؤتمرا الانصار کے جلسہ ہونے کا موجب اعلان کر دیا گیا تھا۔ کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی آمدنی ایک مدت تک بند رہی اور جمعیت کے سفر کے روزناموں اور پیسوں میں بجائے رقوم اور ہندسوں کے صفر لگایا۔ بد قسمتی سے اسی پُر آشوب زمانے میں جناب مولوی عبید اللہ صاحب جمعیت کی نظامت سے علیحدہ ہوئے اور نہ صرف نظامت سے علیحدہ بلکہ اپنی جماعت سے مفارقت گوارا فرما کر اور ایسے نازک وقت میں جمعیت کو زیر بار چھوڑ کر دہلی میں نظارتہ المعارف قائم کر لی۔ اِنَّا لِلّٰہِ
وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید

جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جمعیت کے اراکین مجلس انتظامیہ نے اپنا جلسہ منعقد کیا اور بہت گفت و

شنید کے بعد یہ طے کیا کہ جمعیت دارالعلوم کی فرع (شاخ) ہے اور اصل کی بقا سے فرع باقی رہ سکتی ہے۔ نیز دارالعلوم کی مالی امداد کرنا جمعیت کا اولین فرض ہے اس لئے مناسب ہے کہ ططراق اور ناظم صاحب کی اولوالعزمیوں سے قطع نظر کر کے ان تجاویز پر عمل پیرا ہونا چاہیے جن سے دارالعلوم انجی امتیازی شان کے ساتھ اپنے مالی نقصانات کی جبر و مکافات کر سکے اور جمعیت کا وجود باقی رہے چنانچہ اراکین انتظامیہ اور قائم مقام ناظم نے حضرات سرپرستانِ جمعیت کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی کہ ہم خدام دارالعلوم چاہتے ہیں کہ ہم کو برائے چندے تعلیمی خدمات سے سبکدوش فرمایا جائے کہ ہم اپنا وفد لیکر چند مقامات کا سفر کریں اور دارالعلوم کے نقصانات کی کچھ مکافات کر سکیں چونکہ زمانہ امتحان سالانہ قریب تھا اس لئے سب کو تو اجازت نہ مل سکی مگر جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب، مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا مولوی عبدالسیح صاحب، مولانا مولوی مظہر الدین صاحب اور قائم مقام ناظم (یعنی راقم الحروف مولانا سراج احمد صاحب) اس خدمت پر مار ہوئے۔

ہم نے اس زمانے میں مؤخر کا جلسہ منعقد نہیں کیا۔ کبھی گریجواریٹ کو وظیفہ نہیں دیا کوئی دھوم دھام کا کام ہم سے نہ ہو سکا مگر ہم سے جو کچھ ہو سکا اس کو ہم جمعیت کی تاریخ میں آبِ زند سے لکھنے کے قابل سمجھتے ہیں اور ہم خدام کی یہ سچی کسی درجے میں بارگاہِ حضرت رب العزت میں قبول ہو گئی تو پھر سب کچھ پالیا۔

علی مجالس کا انعقاد جمعیت کی مفید اور نمایاں مقاصد سے ہے ہم نے

تا بمقدور اس کو ترک نہیں کیا۔ ستولی اور شملہ و خوجہ وغیرہ میں متعدد
 جلے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ کسی اہلکار کی علیحدگی یا عزل سے کیا کوئی
 محکمہ کوئی سرشتہ کوئی مدرسہ کوئی انجمن محروم ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے
 کالجوں میں بڑے بڑے پروفیسر، پرنسپل، ناظم، سیکرٹری علیحدہ ہو جاتے
 ہیں اور معزول کر دیے جاتے ہیں اور محض ایک دوسرا ان کا جانشین
 ہو جاتا ہے۔ ہم ہمیشہ سمجھتے کہ جمعیت الانصار سے جناب مولوی عبید اللہ
 صاحب کی علیحدگی پر یہ خطور دلوں میں کیوں پیدا ہوا۔

برائے کار خدا رہے ہی آید

کچھ بھی رود و دیگر بھی آید

بلاشبک جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی مفارقت کا صدمہ ہے
 اور بہت بڑا صدمہ ہے مگر ان کی علیحدگی سے جمعیت کی موت آجائے
 خدا نہ کرے۔

کل کی بات ہے کہ حضرت شبلی نظامت ندوہ سے علیحدہ ہوئے کیا
 خدا نخواستہ ندوہ کا خاتمہ ہو گیا۔ علی گڑھ کالج سے بھی کبھی کبھی بعض
 جلیل القدر علمبردار جدا ہوئے ہیں۔ کیا کالج برباد ہو گیا۔ ہم نہیں
 سمجھتے کہ جمعیت کے متعلق ان بے معنی رساوس کی پیداوار کا مادہ کیوں
 ہیجان میں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ جمعیت الانصار برباد ہو گئی اور یہ بھی
 بالکل غلط ہے کہ جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی دہلی کی انجمن جمعیت
 الانصار کا شعبہ ہے یا دارالعلوم کی ساختہ اور ماتحت ہے اور یہ بھی
 بالکل غلط ہے کہ دارالعلوم کی جمعیت الانصار نے انگریزی داں طلبہ کی
 دینی تعلیم و تربیت سے انکار کر دیا۔ مولوی عبید اللہ صاحب دارالعلوم

میں تعلیمی از سر تدریسی جماعت کے جزا اور رکن نہیں سمجھے کہ ان کے چلے جانے سے یہ دقت پیش آئی ہو۔ بعض انگریزی داں طلبہ اس وقت بھی دارالعلوم میں تعلیم پا رہے ہیں اور دارالعلوم ہر وقت نہایت مسرت اور خندہ پیشانی کے ساتھ گریجویٹ حضرات کی دینی تربیت کی کفالت کے لئے مستعد ہے۔ مگر جیسے کہ عربی خواں طلبہ اپنے خورد و نوش کی خود کفالت کرتے ہیں یا دارالعلوم کی معمولی کفالت پر قناعت کرتے ہیں ایسے ہی اگر گریجویٹوں کا طریق عمل ہو تو پھر کوئی دقت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جمعیت الانصار کے پاس اب نہ مالی رُوح باقی ہے اور نہ وظائف میں ایسا امتیاز مناسب ہے اور مشاہد کے بعد اب کسی میں یہ حرأت بھی باقی نہیں ہے۔

جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی علیحدگی کا مسئلہ گوجیو نہیں ہے مگر تفصیل طلب ضرور ہے اور القاسم کے بقیہ صفحات اس کے لئے یقیناً کافی نہیں ہیں اور ہمارے موضوع سخن کے اتمام میں بہیم و شریک بھی نہیں اس لئے اگر ضرورت ہوئی تو پھر کبھی اس کی بحث معرض بیان میں آجائے گی۔

جمعیت الانصار کا شعبہ الارشاد مجددہ تعالیٰ اعتدال کے ساتھ منظر اور تقریر و تحریر میں تدریجی ترقی کر رہا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ القاسم و الرشید کے صفحات میں آپ کو جمعیت الارشاد کی ترقیاں برابر نظر آیا کریں گی۔ جمعیت کا قانون نظر ثانی ہونے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ شائع کیا جائے گا اور اس کے مفید شعبوں کی ترقی میں سر مو کو تا ہی نہ ہوگی۔ اراکین جمعیت الانصار القاسم اور الرشید کے ذریعے تالیف و اشاعت کا موقت الشروع سلسلہ جاری رکھیں گے اور مسلمانوں کی آگاہی کے لئے مفید مضامین کے

ذخائر جمع کستے رہیں گے۔ اور اکین جمعیت الانصار کی خدمت میں بطور یاد دہانی
 عرض کیا جاتا ہے کہ جن حضرات کے فے چندہ دوامی جمعیت کا باقی ہے وہ
 مہربانی سے جلد برحمت فرمائیں اور جمعیت کے لئے مالی ذرائع پیدا
 کرنے میں نمایاں حصہ لیں اور نیک مشوروں سے دریغ نہ فرمائیں۔ والسلام
 خاکسار سراج احمد رشیدی قائم مقام ناظم جمعیت الانصار
 دارالعلوم دیوبند (القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ ۲۲/۲/۳۲)

تحریہ بیان
 از مؤلف، انوار اکسن

جناب مولانا سراج احمد صاحب کا بیان آپ کے
 سامنے ہے۔ ہمیں ان کی اس طویل تحریر میں جو کچھ نظر
 آیا وہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب جمعیت الانصار
 کو خود چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ انہوں نے جمعیت سے بے وفائی کی اور انجمن کو زیر بار
 کر کے سدھا گئے۔ نیز جمعیت الانصار کے جلسے نہ ہونے کی وجہ جنگ بلقان میں علما کی
 غیر معمولی مصروفیت اور جنگ کے لئے چندے کی شدید طلب، ترکوں کے ساتھ تعاون
 دیوبند کے خزانے کا خالی ہوجانا، الانصار کی طرف توجہ دینے کی بجائے اصل اور
 بنیاد کو قوت پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۱۳ء میں بلقان کی ریاستوں کے ترکوں کے خلاف
 اعلان جنگ نے نہ صرف ترکوں کو بلکہ مسلمانان ہند کو بھی مجروح کر دیا تھا۔ اس
 کا اثر دارالعلوم دیوبند پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ نہ صرف مسلمانان ہند کی توجہ
 ترکوں کی اعانت پر تھی بلکہ علمائے دیوبند بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے
 تھے۔ تاآنکہ دارالعلوم کو کچھ عرصہ کے لئے بند کر کے مدرسین اور طلبہ تک چندے
 کے حصول میں دیوبند سے باہر جا کر مصروف رہے۔

چنانچہ القاسم ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ میں ”چندہ ہلال احمر اور دارالعلوم دیوبند“

کے عنوان کے ماتحت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، جو ابھی دارالعلوم میں تھے، لکھتے ہیں :-

”دارالعلوم کافتویٰ (جو گذشتہ نمبر میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) اب تک مختلف طور پر ایک لاکھ سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ دارالعلوم اور اس کے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلبہ کے وفود و قصبات اور دیہات ہند کے تمام اطراف میں دورہ کر کے رؤساء و علماء اور مشائخ اور عوام کو متوجہ کرتے رہے ہیں۔ محض ان لوگوں کے مواعظ اور اس جماعت کے مساعی جیلہ سے ایک بڑی مقدار جس کا تخمینہ تین لاکھ روپیہ سے کم نہیں کیا جاتا مساعی انجمنوں اور اخبارات کے ذریعے سے بھیجا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اراکین دارالعلوم کی معرفت بھی پچھتر ہزار سے زیادہ جمع ہو چکا ہے اور یہ روپیہ عموماً نیشنل بینک کے توسط سے پریزنڈنٹ ہلال احمد قسطنطنیہ کے نام سے بھیجا یا گیا ہے۔ وفود دارالعلوم کے دورے اور خاص دیوبند میں جو روپیہ جمع ہو کر براہ راست قسطنطنیہ بھیجا گیا یا اراکین دارالعلوم کی کوششوں سے جمع ہو کر بھیجا گیا ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسری اشاعت میں درج کریں گے۔ مگر اس قدر ذکر کرنا بے عمل نہ ہو گا کہ ضلع سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب (مدیر اول مدرسہ مظاہر العلوم) صدر انجمن ہلال احمد سہارنپور و مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری و مولانا اشرف علی صاحب تھانوی و مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی و حکیم محمد یوسف گنگوہی و مولانا حکیم محمد احمد رام پوری کے مساعی جیلہ سے جس قدر روپیہ جمع ہوا، غریب اور متوسط الحال لوگوں سے اتنی رقم جمع کر لیا آسان نہیں۔ مولانا خلیل احمد صاحب خالص سہارنپور سے زائد از بیس ہزار روپیہ اب

تک بھیج چکے ہیں۔ (القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ سے ۲۰۱۹ء)

حضرت مولانا حسین احمد صاحب ”سفرنامہ شیخ الہند“ میں لکھتے ہیں:-

”بلقان کے خونخوار اور ظالموں کے سنگین واقعے نے مولانا (محمود حسن

صاحب) کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کن اثر ڈالا.....

مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی، فتوے چھپوائے،

مدرسہ کو بند کر دیا، طلبہ کے وفد بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے،

چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی۔“

ان بیانات کی روشنی میں مولانا سراج احمد صاحب کا یہ بیان درست ہے کہ جنگ بلقان کے باعث جمعیت الانصار کے رکن حضرات مصروف رہے۔ یہ بھی درست کہ مدرسے کا خزانہ خالی ہو گیا تھا، یہ بھی صحیح کہ جمعیت الانصار کا چندہ صفر پر پہنچ گیا تھا لیکن ان وجوہات کے علاوہ منتظمین مدرسہ اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے خیالات اور آئندہ کے سیاسی نقشوں اور طریق کار نیز بعض مذہبی مسائل میں کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ جمعیت الانصار سے بھی گورنمنٹ جو کئی ہو چکی تھی۔ ادھر جنگ بلقان ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۳ء سے گذر کر جنگ عظیم تک نوبت پہنچ چکی تھی، جرمن اور ترک دونوں برطانیہ سے برسرِ پیکار تھے۔ ترکوں کی مدد انگریز کی دشمنی کے مترادف تھی۔ علمائے دیوبند نے لاکھوں روپیہ سے ترکوں کی مدد کی تھی، انہی حالات میں شیخ الہند مجاہد روانہ ہوئے تھے ادھر ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کا بل پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے انہوں نے ایک ریشمی کرتے پرواں کے حالات لکھ کر مولوی عبد الرحیم صاحب سندھی کے ذریعہ راج کے بہانے شیخ الہند کو بھیجے تھے۔ اس تحریک کا انکشان اگرچہ پورے طور پر ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا لیکن مدرسہ دیوبند گورنمنٹ برطانیہ کی نظروں میں کھٹک رہا تھا اس لئے ارکان و ذمہ داران مدرسہ کے لئے اس صورت

حال سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت تھی اس لئے سر دست جمعیت الانصار سے مولانا عبید اللہ کا علیحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ اگرچہ ان کی چلائی ہوئی سکیم مسلمانوں میں آزادی کی روح بھونک چکی تھی۔ شیخ الہند کے حج کو روانہ ہونے کے بعد مذکورہ حالات میں لنڈن کی پارلیمنٹ میں دارالعلوم کو بند کرنے کی تجویز بھی پیش ہو چکی تھی۔ جب یہ مسئلہ لنڈن کے دارالعوام میں لفٹیننٹ کرنل جمیس نے اٹھایا تو ہندوستان کے مسلم اخبار اور رسالے چیخ اٹھے۔ اخبار تحلیل بنجور نے حسب ذیل ادارہ سپرد قلم کیا جو القاسم شعبان ۱۳۳۵ھ میں بھی شائع ہوا۔ تحلیل نے لکھا :-

”دارالعلوم دیوبند کا ذکر پارلیمنٹ میں“

جواب ایک سوال کے جو لفٹیننٹ کرنل جمیس نے کیا دارالعوام میں مسٹر مائیکو وزیر ہند نے فرمایا ”جب سے کہ حجاز گورنمنٹ نے دارالعلوم دیوبند کے علامہ کو گرفتار کیا تھا جو مانٹا میں نظر بند کئے گئے تھے اس وقت سے اور جب تک کہ وہ مانٹا سے روانہ ہوئے مدرسہ عربیہ دیوبند کی باغیانہ تبلیغ کی شکایت جہاں تک انہیں علم ہے نہیں ہوئی اور اس لئے اس تجویز پر عمل کرنے کی کہ مدرسہ موصوف بند کر دیا جائے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی؟“ اس سوال کے ساتھ بالشویک تحریک کے متعلق بھی ایک سوال تھا جس کا جواب دیا گیا کہ گورنمنٹ ہند اس کے متعلق سرگرم کار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے آئرن ہیل ممبران ہندوستان میں کسی بڑے پیمانے پر انقلاب عظیم کا خواب دیکھ رہے ہیں حالانکہ یہاں روز بروز سکون ہو چلا تھا۔ مگر خود انگلستان کی عیسائی آبادی نے

صلیبی جنگ کا سوال چھیڑ کر اور مسٹر لارڈ جارج نے اپنے صریح اعلان کے خلاف اور نہایت بے انصافی کے ساتھ ٹرکی پر الزامات قائم کر کے اس کو مٹانا چاہا ہے جس سے ہندوستان کی مسلم آبادی قدرتی طور پر بھرپور اٹھی ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ مدرسۃ العلوم دیوبند مسلمان بھی رہتا اور اس سے متاثر بھی نہ رہتا پھر بھی کارکنان مدرسہ دیوبند نے اس میں حصہ لیا ہے اس سے وہ بمشکل اپنی اسلامی پوزیشن کو قائم رکھ سکے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ یا اور کوئی مسلمان ہونے کا مدعی ایسے موقع پر ہو اور وہ اسلامی معاملات سے جدا رہے۔ مگر آرمیل لفٹیننٹ کرنل جیمس نے مدرسہ (دیوبند) بند کر دینے کی جو بنا قرار دی ہے یعنی مولانا محمد حسن صاحب کی ذات گرامی صفات، وہ عرصہ ہو اگر اس سے قطع تعلق کر چکے تھے اور گورنمنٹ کا یہ تحقیقاتی ریکارڈ بھی موجود ہو گا جس سے مدرسہ کی بے تعلق ثابت ہو چکی ہے۔ نیز مولانا کی نظر بندی کسی باضابطہ اس وقت کی انگریزی عدالتی تحقیقات سے ہرگز عمل میں نہیں آئی بلکہ وہ کھلی ہوئی یکطرفہ کارروائی تھی۔ اگر وہ انگریزی درخواست پر بیت احرام سے گرفتار کر آئے گئے تھے اور اگر شاہ حجاز نے انہیں از خود گرفتار کر کے برطانیہ کے سپرد کیا ہے تاکہ وہ نظر بند رکھے جائیں تو اس کی وجہ صرف ایک ہی تھی کہ مولانا نے اس قوت پر دستخط کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی جس میں بغیر کسی مؤثر قطعی شرعی وجہ کے تمام ترکوں کے کفر کا فتویٰ ان سے چاہا تھا اور انہوں نے جائزہ طور پر خاموشی کو ترجیح دی۔

پارلیمنٹ میں مسٹر مانشنگو کے معلومات اس سوال و جواب کے زمانے تک ممکن ہے کہ مدرسۃ العلوم کے متعلق ناقص ہوں کیونکہ بعض کارکنان مدرسۃ العلوم نے خلافت کے متعلق جو حصہ لیا وہ اس کے بعد کا ہے۔ لیکن اگر یہ

اس سے قبل کا بھی ہو تو یہاں اس سے زیادہ بڑھے ہوئے خیالات دوسرے مسلمانوں کے ہیں اور جس قدر عربی مدارس ہندوستان میں ہیں سب ایک رشتہ مذہبی میں منسلک ہیں تو مدرسۃ العلوم دیوبند ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ مدرسۃ العلوم دیوبند بھی اغدزر کے لئے قائم نہیں ہے وہ ایک اسلامی مدرسہ ہے اگر گورنمنٹ اسے بند بھی کر دے گی تو بحیثیت ایک مسلمان کے وہ چار و ناچار اسے برداشت کریں گے لیکن کیا یہ تدبیر ہوگا؟ نہیں بلکہ ہزار ہا مسلمان طلبہ اور استادوں کو جو خاموشی کے ساتھ ایک بے ضرر مذہبی شغل میں لگے ہوئے ہیں اس لئے منتشر کر دینا ہوگا کہ وہ سلطنت کے خلاف تمام ملک میں پروپیگنڈا پھیلاتے پھریں۔ ایسے ہی ذریعوں نے موجود تکلیف دہ حالت پیدا کی ہے اور ایسے ہی نا عاقبت اندیش آئندہ اس کو مزید ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس تذکرے سے دیوبند میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوگی اور وہ جہاں ہے بے خوف وہیں کھڑا رہے گا جو اس امر کی علامت ہوگی کہ ”آئرا کہ حساب پاک است از محتسب چہ باک“ اور یہ کہ اسلامی سچی تعلیم صرف ایک خدائے قادر مطلق سے ہی ڈرنا سکھلاتی ہے اور اسی پر بھروسہ رکھتی ہے۔“ ایڈیٹر انجیل

(القاسم شعبان ۱۳۳۸ھ صفحہ ۷۷)

انجیل اخبار بخینور کے ایڈیٹر نے یہ ایڈیٹوریل (مقالہ ادارہ) ۳۰ رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے اس کو نے اس کو نے تک بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی۔ دارالعلوم نے اگرچہ اس کی چندا پر دانہ کی جیسا کہ مذکورہ ماہ کے القاسم میں دارالعلوم کی طرف سے حضرت مولانا اعجاز علی صاحب مرحوم نے صرف ایک صفحہ کا نوٹ لکھا ہے جس میں

دہ لکھتے ہیں ۱۔

”ہم اس سے نہیں گھبراتے ہیں کہ ممبران پارلیمنٹ نے اس مدرسہ کو کس نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے وہ جس نظر سے چاہیں اس کو دیکھیں مگر ہم تو اس پر بھی سی کہیں گے۔“

وان ساءنی ان تلتقی بمساء
لقد سرنی انی خطرت میالک

جس کا ترجمہ بقول غالب یہ ہے :

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے ہاں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

یہ تھے وہ حالات جن کی پیش نظری و پیش بینی مہتمم صاحبان کو مولانا علیہ الرحمہ صاحب کے متعلق فیصلہ کن نتیجہ کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ یہ تیور جب شیخ الہند اور ان کے جان نثار سندھی شاگرد نے دیکھے تو خود بھی انہوں نے کارکنان مدرسہ کے ساتھ اشتراک عمل کو مناسب نہ سمجھا چنانچہ دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور دوسرے قسم کے جاں بازوں یعنی مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنی تجویز حریت میں شامل کر لیا۔ کہتے ہیں کہ شیخ الہند کی زبان پر یہ شعر اکثر آجاتا تھا۔
کامل اس فرقہ زہاد سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

میرے خیال میں دونوں جانب اپنے اپنے مقام پر مستقیم
اختلاف نظریات | تھے۔ لیکن ایک چیز اور بھی تھی جو مولانا سندھی کے متعلق
حلقہ دیوبند میں اختلاف کی خلیج وسیع کر رہی تھی وہ تھی مولانا سندھی کی آزاد خیالی
اور مجتہدانہ رنگ۔ یہ بھی افواہیں تھیں کہ وہ نماز کی پابندی میں ڈھیلے اور غیر محتاط ہیں۔

یہ افراد ہیں ایسے لوگ اڑاتے تھے جو غالباً گورنمنٹ برطانیہ کے بازار میں ہوتیں اور شہر شدہ مدرسے تک پہنچتیں۔ مگر یہ صرف پراسپیکٹ تھا اور بس۔

نظر باقی اختلاف کے متعلق ہم آپ کو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے ایک مضمون کی طرف لئے چلتے ہیں جو رسالہ دارالعلوم میں ”احاطہ دارالعلوم میں بیٹے ہوتے دن“ کے عنوان سے دس بارہ قسطوں میں نکلا گیا۔ موصوف لکھتے ہیں۔

”خاکسار جس زمانے میں پڑھنے کے لئے دارالعلوم میں داخل ہوا یہ وہ

زمانہ تھا جب مولانا سندھی اور دارالعلوم کے ارباب حل و عقد کے درمیان تلخیاں بڑھتی ہوئی اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ دیوبند سے کنارہ کش ہو کر دلی کو

مولانا سندھی نے اپنا مستقر بنالیا تھا اور ”نظارۃ المعارف القرآنیہ“ کے نام سے ایک خاص نوعیت کا تعلیمی ادارہ قائم کر کے چند مخصوص طلبہ کو قرآن کا

درس اپنے مخصوص نقطہ نظر پر دیتے تھے۔ ان طلبہ میں دارالعلوم کے سند یافتہ

بھی تھے اور غالباً کچھ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات بھی شریک تھے۔ اس عرصے

میں کبھی کبھی مولانا سندھی مرحوم دیوبند بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ غرض ملی

تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوتی تھی اور موقع ملتا تو ایک چکر

دارالعلوم کا بھی کر لیتے۔..... میں مولانا عبید اللہ کے نام ہی نہیں

بلکہ ایک حد تک ان کے کام سے بھی ایک گونہ واقف تھا۔ دل میں ان کی عظمت

سبھی تھی ان کے علم کی تعریفیں بھی سُن چکا تھا اس لئے موجب وہ دارالعلوم کے

احاطے میں نظر آتے تو بے ساختہ ان سے ملنے کا تقاضہ دل میں پیدا ہوتا لیکن

پھر سوچ کر کہ کہیں مدرسے کے ارباب لبست و کشادہ تک خبر نہ پہنچ جائے

دلی کا ولولہ دل ہی میں بچھ کر رہ گیا۔ بمشکل ایک دن جب مولانا سندھی مسجد

والے احاطے کے آخری مشرقی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اس زمانے ہمارے

ہمارے مرحوم شہید دوست مولوی منظر الدین شیر کوٹی مدیر (الامان) کی قیام گاہ بھی وہ حجرہ تھا مدرسہ میں کچھ تدریسی خدمت انجام دیتے تھے اسی احاطہ میں عرض کر چکا ہوں کہ فقیر کا حجرہ قبرہ بھی تھا مولانا سندھی کو وہاں پا کر دبے پاؤں فیران کی خدمت میں حاضر ہوا چند منٹ میں میری ملاقات مولانا سے ختم ہو گئی۔ اس دفعہ تو وہ واپس ہو گئے اور زیادہ وقفہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پھر دیوبند پہنچے۔ ہم تو طلبہ کے جھیلے میں تھے انوائڈھر اُدھر سے خبریں ملتی رہیں کہ آج کل دارالمشورہ میں مولوی عبداللہ کا مقدمہ پیش ہے۔ دارالعلوم کے اساتذہ ان سے ایک خاص مسئلہ میں بحث و مباحثہ کر رہے ہیں لیکن اختلافی مسئلہ کیا جو صحیح تعبیر پہنچانے والے مجھ تک نہیں پہنچا سکے۔ تبلیغ کے مسئلے میں اختلاف ہے پس اس سے زیادہ اور کچھ پتہ نہ چل سکا کہ اچانک دارالعلوم کی مسجد میں دیکھا مدرسے کے بست و کشاد جمع ہو رہے ہیں اساتذہ میں جہاں تک خیال آتا ہے بجز شیخ البند رحمۃ اللہ علیہ کے سب ہی موجود تھے۔ طلبہ کی بھی کافی تعداد اُدھر اُدھر سے بطور متاثرینوں کے جمع ہو گئی۔

اب ترتیب تو صحیح طور پر یاد نہ رہی | غلام عثمانی اور مولانا سندھی | لیکن یکے بعد دیگرے کھڑے ہونے والوں میں ایک تو مولانا شبیر احمد عثمانی اور خود مولانا سندھی تھے۔ اور تیسرے مقرر غالباً مولوی غلام رسول مرحوم (استاذ فلسفہ و منطق) بھی تھے۔

مولوی عبداللہ صاحب | (مولانا عبداللہ کا نظریہ سلسلہ تبلیغ) | نے کھڑے ہو کر جہاں تک

خیال آتا ہے یہ فرمایا کہ قرآنی آیت لَا تُذَكِّرْهُ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ
(تاکہ میں ڈراؤں تم کو لوگوں کو اور ان لوگوں کو جن تک بات پہنچی) اسی سے
میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بنی آدم میں جن لوگوں تک قرآن کا پیغام نہیں
پہنچا ہے ان سے مؤاخذہ اسلام کے نہ قبول کرنے پر نہ ہو گا؟ اب آگے بڑھے
طور پر یاد نہیں رہا کہ انہوں نے کیا کہا۔ کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ اپنے اس
خیال کے متعلق یہ کہتے ہوئے کہ عام علما کی رائے یہ نہیں ہے بلکہ ان کے
نزدیک تبلیغ عام ہر فرد تک پہنچ چکی ہے۔ اس لئے عدم تبلیغ کا عذر کسی
قوم یا فرد کو لئے باقی نہیں رہتا ہے۔ اب واللہ اعلم انہوں نے اپنے خاں
خیال سے رجوع کا اعلان کیا یا نہیں کیا؟ لیکن دیکھا کہ مولانا شبیر احمد
صاحب مرحوم غصے میں ان کے خیال کی تنقید فرما رہے ہیں۔ ان کی تقریر
تو یاد نہ رہی لیکن ان کے بعد مولوی غلام رسول صاحب مرحوم نے تقریر کی
تھی ان کی تقریر کا یہ فقرہ بھولا نہیں جاتا تھا، کہا تھا :-

”کہ یہ مولوی عبید اللہ سندھی اگرچہ ہماری جماعت کے
ایک فرد ہیں لیکن جب کوئی عضو سڑ جاتا ہے تو کاٹ دیا
جاتا ہے، اسی طرح ہماری جماعت سے یہ الگ کر دیئے
گئے ہیں“

قریب قریب کچھ اسی نوعیت کے الفاظ تھے۔ میرا دل بھی اس وقت
بھرا آیا تھا اور یاد پڑتا ہے کہ مولوی عبید اللہ صاحب جس وقت تقریر
فرما رہے تھے تو کچھ آبدیدہ سے تھے۔

جلسہ برخواست ہو گئی اس مجلس میں جو کیفیت گذری تھی میرا دل
اس سے سجدہ متاثر تھا۔ غالباً دوسرے دن یا ایک دو دن بعد جب

الحمد للہ برفض شریفی محمد شفیع خاں صاحب نے مولانا شبیر احمد صاحب کی تقریر پر

ترمذی شریف کا درس حضرت شیخ الہندؒ کے حلقہ میں ہو رہا تھا ہمت کہ کے اس فقیر نے اس مسئلہ کو اٹھایا کہ مسئلہ تبلیغ میں جو اختلاف اس وقت رونما ہوا ہے حضرت والا کا خیال اس باب میں کیا ہے..... بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے جلسے کی تقریروں کی خبریں حضرت تک بھی پہنچی تھیں جن سے متاثر تھے اور خلاف دستور دیکھا کہ ذرا سنبھل کر منہ بچھڑ ہو گئے اور ایک ایسی شستہ و رفته تقریر اس مسئلہ پر فرمائی جو خاکسار کے نزدیک حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی کتاب ”الدین القیم“ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اور عام خیالات کے سوا حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص نظریہ کو درج کر کے آخری فیصلہ حضرت والا کی اسی درسی تقریر کو اپنی کتاب میں قرار دیا ہے..... اس وقت جو تقریر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ

خلاصہ تقریر شیخ الہند | تبلیغ اور مواخذہ ان دونوں کی حیثیت کلی مسلک جیسی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تبلیغ جس رنگ میں ہوئی تھی ظاہر ہے کہ وہی رنگ اس تبلیغ کا نہیں ہو سکتا جو ہمارا اور آپ کا ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ براہ راست نبوت گبریٰ کے محرم اسرار تھے۔ جو قریب ان کو حاصل تھا یقیناً آج کل کے ایک عامی مسلمان کو وہ میسر نہیں۔

اسی طرح حق تعالیٰ کے مواخذہ و گرفت کی نوعیت بھی ایک جیسی نہیں آخر ابو جہل پر محبت جس طرح پوری ہوئی تھی اور اسی بنیاد پر مواخذہ کا وہ مستحق ہوا۔ یہی نوعیت ان لوگوں کے مواخذہ کی کیسے ہو سکتی ہے جنہیں

ابو جہل کی آسانیاں میسر نہیں ہیں۔

اس تہسیدی مقدمہ کو سمجھانے کے بعد فرمایا گیا تھا کہ بس اجمالی عقیدہ یہ رکھنا چاہیے کہ ہر شخص کا مواخذہ اس کی تبلیغ کی نوعیت کے ساتھ و البتہ ہے۔ جسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہے اسی حد تک اس سے مواخذہ بھی ہوگا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص ہندوستان یا عرب میں ہی رہتا ہو لیکن اپنے خاص حالات کی وجہ سے ”دین حق“ کا پیغام اس شخص تک نہ پہنچے جس رنگ میں امریکی یا یورپ کے کسی ایسے شخص تک پہنچا ہو جس نے باضابطہ اسلام اور اسلامی تعلیمات، اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو۔ الغرض انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کسے کس درجے کی ہوئی ہے حق سبحانہ تعالیٰ ہی اسے جانتے ہیں اور مواخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے تفصیلی علم تو اس کا خدا ہی کو ہے۔ ہمارے لئے اتنی اجمالی بات کافی ہے کہ جسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہو اسی حد تک اس سے مواخذہ بھی ہوگا۔ اشخاص کو متعین کر کر کے یہ بتانا انسان کے لئے ناممکن ہے کہ کسے کس درجے کی تبلیغ ہوئی ہے۔ اور جب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہو سکتا تو مواخذہ کی تفصیل بھی ہم کیسے کر سکتے ہیں۔“

درس اس دن کافی پُر جوش اور گرم تھا۔ پہنچنے والوں نے یہ خبر دار المشورہ (مہتمم صاحبان اور ان کے حامیوں) تک پہنچائی کہ فلاں طالب علم نے آج شیخ الہند کے حلقہ درس میں فلاں مسئلہ کو چھیڑا جس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔ کافی شور و غوغا ہوا۔ نودہ میں ایک جلسہ بھی طلب کیا گیا اور اس غلط فہمی کے پھیلنے کا جو اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ آج کل اس اختلافی مسئلہ میں حضرت شیخ الہند نے ایسی تقریر فرمائی ہے جس سے

مولوی عبید اللہ سندھی کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس اندیشے کا ازالہ کیا گیا درانحالیکہ دونوں خیالوں میں فرق تھا کیونکہ جہاں تک خیال آتا ہے، مولوی عبید اللہ صاحب یورپ و امریکہ کے باشندوں کو متعین کر کے دعویٰ کرتے تھے کہ ان کو دین حق کی صحیح تبلیغ ہی پسند ہوتی ہے اور حضرت شیخ الہند کی تقریر اصولی تھی۔ شاید اس جلسے سے اسی فرق کو ظاہر کرنا منظور تھا۔ بہر حال یہ تو عقلی بات تھی جو اپنی طالب علمی کے دنوں میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے میرے کانوں میں پہنچی۔

دوسری بات جسے اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے یعنی مولوی عبید اللہ سندھی اور ارباب مدرسہ کی کشیدگی پھر بھی باقی ہی رہی اور یہ مسئلہ بھی واقع ہوتا چلا گیا کہ حضرت شیخ الہند اور مولوی عبید اللہ دونوں کا زادیہ خیال مدرسہ کے ارباب بےست و کشادہ سے جدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ تبلیغ والا مسئلہ تو خیر ایک علمی مسئلہ تھا درحقیقت ان دونوں صفوں میں حقیقی اختلاف ”سیاسی طریقہ عمل“ کے متعلق تھا۔ اب پوری بات تو یاد نہیں رہی لیکن ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ مولانا حبیب الرحمن عثمانی (نائب مہتمم) نے فقیر کو یاد فرمایا اور کہا کہ تم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ملکر دریافت کرو کہ واقعی ”سیاسیات“ میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے..... شاید ظہر کی نماز کے بعد کا واقعہ ہے مسجد کے احاطے میں ایک کمرہ تھا جسے اس زمانے میں ”دارالتصنیف“ کا نام دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی کے آخری

مشغل یعنی ترجمہ قرآن مجید کا کام کچھ دیر کیا کرتے تھے۔ فقیر تو اسی احاطہ کا باشندہ ہی تھا۔ نماز کے بعد حضرت اپنی تصنیف و ترجمہ کے اسی کمرے میں تشریف لے گئے۔ تنہا تھے موقع پا کر فقیر بھی پیچھے سے حاضر ہو کر عرض رسا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ جیسا کہ قاعدہ تھا خندہ جبین سے فرمایا گیا کہ آؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟ بیٹھ گیا اور جو پیغام میرے سپرد کیا گیا تھا اُسے پہنچا دیا گیا۔ سنتے رہے اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے اور اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم جن کو وہ حضرت الاستاذ کے لفظ سے یاد کرتے تھے ان ہی کا نام لیکر فرمایا :

”حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۶ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۶ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ تعلیم و تعلم، درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا..... فرائض الہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا اب آخری کام بھی رہ گیا ہے جسے اپنی حد تک تو میں کر گذروں گا۔“

مولانا مناظر احسن کی مذکورہ تحریر آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اس طویل

بیان کو مجبوراً نقل کیا ہے کہ اس سے حضرت شیخ الہند، مولانا عبید اللہ سندھی اور کارکنان و ذمہ دارانِ دارالعلوم کے تعلقات اور سیاسی نظریات کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ حقیقت واقعہ بھی یہی ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اور حضرت شیخ الہند سے منتظمین مدرسہ کا اختلاف ”نظارتہ المعارف“ دہلی کے وجود میں آنے اور ”جمعیت الانصار“ کا ہمیشہ کی نیند سو جانے کا باعث ہوا۔ دنیا کی پوری تاریخ پر نظر دوڑا جائیے آپ کو اقتدار و انتظام اور

محکمہ انقلاب و اصلاح میں دست و گریباں ہوتے ہوئے دیکھنا قدم قدم پر پیش آئے گا۔

جہاں انقلاب پسندوں کو انقلاب لانے اور اصلاح کرنے کا دلولہ ہوتا ہے وہاں اقتدار پسندوں اور ذمہ داروں کو زمانے کی نزاکتوں اور ماحول کی نساگاریوں کا دغہ رہتا ہے۔ غرض کہ اسی کشمکش سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس کشمکش کی گتھی کا سلجھاؤ عہد بردار تو اس گفت و بہ منبر نہ تو اس گفت

مولانا عبید اللہ صاحب کچھ بھولے ہوئے منتظمین

جمعیت الانصار کے ثمرات کا نظریہ کچھ ہوا اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جمعیت الانصار نے علماء اور قوم کو ایک راستے پر لگایا، اس نے ملک میں عام اسلامی بیداری پیدا کی اور دارالعلوم کے لئے ایک تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی اور انقلابی پروگرام دیا، اس نے ان قوتوں کو جگایا اور جھوڑا تھا جو مردہ، نیم مردہ یا خفتہ تھیں اور جن میں ہر فن کی طرح کا جمود اور ریخ کی طرح کی نمود تھی۔ جمعیت الانصار نے ان منجمد مادوں کو گھلایا اور ٹھٹھری ہوئی قوتوں کو گرمایا جو ناامیدی و کسالت کا شکار ہو چکی تھیں۔ وہ خون جو رگوں میں رُک رُک کر چلتا تھا اس کو صاف کر کے

بہایا، جو چراغ ہمارا ہے تھے ان کو بھڑکایا اور جو مہیں جھللا رہی تھیں ان کو
ابھارا، زندہ دلان اسلام کے نقشہ ہائے کہن کو جو مٹے جا رہے تھے چمکایا اور
مجاہدین علمائے ربانی کے کارناموں کو اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا، قاسمی اور
سیدی افکار میں تازہ روح پھونکنے کا پیغام دیا اور قوم سے تحسین و آفرین کا
سلام لیا۔ لیکن افسوس کہ یہ

پھول تو درودن بہار جاں فسزاد کھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

آمد مبرسر مطلب | علامہ شبیر احمد عثمانی نے جمعیت الانصار کے پورے کے
پورے پروگرام میں ایک جامع منصوبے کے ساتھ

بھرپور کوشش سے کام لیا۔ وہ اس جمعیت کے نصاب میں ترمیم و تیشخ اور اس
کی تجدید میں سرگرم نظر آتے ہیں، جمعیت الانصار کے شعبہ قاسم المعارف میں
مصرف عمل دکھائی دیتے ہیں، موتر الانصار میں مقالے پڑھتے اور اپنی تقریریں
سے مسلمانوں کے دلوں کو مراد آباد، میرٹھ، شملہ وغیرہ میں گرماتے نظر آتے
ہیں۔ کراچی میں آریہ سماج سے سرگرم مناظرہ ہو کر کامیاب و کامران لوٹے ہیں لیکن
جمعیت کی مغفرت ہو جانے کے بعد وہ اس طرف سے ہٹ چکے ہیں۔ لیکن کام کرنے
والے کے سامنے دنیا وسیع ہوتی ہے۔ جو ہر قابل تھا اس لئے اس کی ہر جگہ مانگ
تھی۔ اب جہاں جمعیت الانصار نے دم توڑا ہے ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء کا زمانہ
ہے۔ اس سنہ تک حضرت عثمانی آسمان شہرت پر پہنچ چکے ہیں اور میں سمجھتا
ہوں کہ اس میں جمعیت الانصار کے وہ ممنون ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی
سابق ہستم ۱۳۳۳ھ کی روداد دارالعلوم میں لکھتے ہیں :

”مولوی (شبیر احمد) صاحب امدان کے بیانات اور تقریروں کا ملک

میں عام اثر ہے۔ اسی بنا پر اکثر مشہور جلسوں میں آپ کو باصرہ بلا تے ہیں
مگر بوجہ نقصان تعلیم سوائے مخصوص مقامات کے اکثر جگہ غور رکھ دیا جاتا
ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم اس نوجوان کے علم اور عمر میں برکت عطا
فرمائے۔ آمین" (رونداد صفحہ ۲)

دارالعلوم کی خدمات جلیلہ

دیوبند کی اس دینی یونیورسٹی پر غور کی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ عثمانی
مادر علمی کے اس تمام دور کو اپنی پلیٹ میں لئے ہوئے ہیں جس میں انہوں نے عہد طفلی و
طالب علمی کے وقت سے ہوش سنبھالا تھا۔ بلکہ قاسمی دور کی بھی وہ یادگار ہیں کہ انہوں
نے اس عہد کی نشأت کو پورے طور پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اچھالا تھا۔
اب ہم ذرا اپنی غنائِ قلم کو پیچھے موڑ کر ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کی طرف لئے چلتے ہیں۔
کیونکہ جمعیت الانصار کے ترمیمی واقعات کے باعث ہم ان کے ۱۳۲۲ھ مطابق
۱۹۱۵ء تک پہنچنے کی وجہ سے بعض دیگر حالات بیان کرنے سے قاصر رہ گئے تھے۔
ہمارا خیال ہے کہ جس طرح حضرت عمرؓ کی شہرت و عظمت اسلام کی ممنون ہے اور
اسلام حضرت عمرؓ کا ممنون ہے اسی طرح حضرت عثمانیؓ بھی جس طرح دارالعلوم دیوبند
کے ممنون ہیں اسی طرح دارالعلوم بھی ان کا بے حد ممنون ہے۔ ان کی خدمات جلیلہ
میں دارالحدیث کی بھی نمایاں خدمت ہے۔

دارالعلوم کی تعمیر میں دارالحدیث
دارالحدیث دارالعلوم دیوبند ۱۳۲۰ھ
اور دارالتفسیر کو وہی مقام حاصل

ہے جس طرح اعضاء انسانی میں دل کو کسی اسلامی یونیورسٹی میں علم حدیث اور
تفسیر کے لئے عظیم الشان عمارت اس کی عظمت شان کا نشان ہوتا ہے دارالعلوم

بھی ایسی عمارت کے بغیر عظیم الشان نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ کارکنان مدرسہ کی طرف سے دارالحدیث کی تحریک القاسم کے ذریعہ کی گئی اور ۱۳۲۹ھ میں جناب مہتمم صاحبان کی طرف سے اس کا اعلان ہوا چنانچہ ملک نے اس آواز پر دلی خلوص اور عقیدت سے لبیک کہا۔ اور ملک کے اطراف و جوانب سے دارالعلوم میں روپیہ آنا شروع ہوا۔ ۱۳۲۹ھ کے بعد کے القاسم رسالوں میں باقاعدہ چندہ دہندگان کے اسمائے گرامی اور رقمیں شائع ہوتی رہی ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے بھی گزری ہیں جس طرح دارالعلوم دیوبند کی مشہور دارالحدیث دیوبند پر حضور پر نور کی توجہ در سگاہ نودرہ کے متعلق حضرت

مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے خواب دیکھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے خطوط کھینچ کر بتائے کہ ان نشانات پر نودرہ کی تعمیر کی جائے اسی طرح سرونج ریاست ٹونک میں مولوی سید مبارک علی کی دارالحدیث کی طرف توجہ دلانے سے سید یوسف علی صاحب وکیل کی زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ اس مبارک کام کے لئے گداگری کریں گے چنانچہ انہوں نے اور ان کے چچا زاد بھائی منشی محمد زکریا صاحب نے خاص سرونج سے چندہ شروع کیا۔ ابھی باسٹھ روپیہ ہوئے تھے کہ یوسف علی صاحب نے خواب دیکھا جو یہ ہے :

” نصف شب گزشتہ کے بعد میں نے بعالم خواب دیکھا کہ میں بسواری ریل

ٹونک جا رہا ہوں۔ ایک خاص مقام پر جو کف دست میدان ریگستانی ہے کالیک ریل ٹھہر گئی اسی وقت ایک شخص میرے پاس آئے۔ کہا اتر حضور رسول کیم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہیں۔ میں بحال شوق ان کے ہمراہ گیا ایک جگہ چند مکان سر کی کے اور دو تین خیمے کپڑے کے، غلاف خیمہ یہاں کے، مکانیت کے طور پر قائم ہیں۔ اوّل میں مکان سر کی والے میں گیا جہاں

چند صاحب شریف فرماتے تھے۔ ایک کسی قدر فریب اندام کچھ سیاہ فام پیشانی پر
 سجدے کا نشان گرتے کی گھنٹی کھلی جن کے پاس چند کتابیں جلد بچرم رکھی
 ہیں۔ باقی کا حلیہ قوت متخیلہ نے فراموش کیا۔ فرمایا کہ اول حضور نبی کریم کے
 حضور جاؤ۔ میں نے عرض کیا، کیا حضور مجھ کو اندر خیمے میں بلا لیں گے؟ فرمایا
 ہاں۔ میں سلام علیک کر کے رخصت ہوا۔ خیمہ مبارک پر پہنچا۔ دروازہ مخیمہ پر
 نہ معلوم پردہ تھا یا کیا چنانچہ وہ علیحدہ ہو گیا مجھ کو بار یا بی نصیب ہوئی۔
 حضور نے مسکرا کے میری جانب ہر دو دست مبارک بڑھائے۔ میں نے دونوں
 ہاتھوں میں لیکر بوسہ دیا اور روتا رہا۔ حکم بیٹھنے کا صادر ہوا۔ میں بیٹھ گیا۔
 ہنس کر فرمایا کہ کس قدر چند تو نے وصول کیا۔ عرض کیا با شکر روپیہ ۵۰
 ارشاد ہوا سرونج کا اہتمام زکریا کے ذمے ہے۔ میں عرض کیا وہ میرا بھائی ہے
 ارشاد ہوا کہ اس کا اہتمام کا بار زکریا کو لینا چاہیے۔ پھر ارشاد ہوا کچھ پڑھ
 میں نے سورۃ فاتحہ شریف سنائی۔ ارشاد ہوا قرآن شریف صحیح پڑھا کر حضور
 کے قریب دو صاحب ادرتھے۔ ایک پورے قد کے قد آور جوان۔ ڈاڑھی
 سینے تک۔ بال سیاہ و سفید۔ سرخ و سفید رنگ، خوبصورت چہرہ۔
 دوسرے صاحب لالہ لاغر جسم، ان کا پورا حلیہ یاد نہ رہا۔

(القاسم ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ ص ۷)

بہر حال اس خواب سے دارالحدیث کی مقبولیت کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ ریاست
 خیر پور سندھ کے وزیر اعظم آنر بیل خان بہادر شیخ صادق علی صاحب منتظہین مدرسہ کی
 استاد عابد الزمر ۱۹۱۱ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کو دہلی سے دارالعلوم دیوبند شریف لائے،
 مدرسہ عالیہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دارالحدیث کے لئے ایک ہزار روپیہ کا نوٹ عطا
 فرمایا اور پچاس روپیہ طلبہ کی مٹھائی کے لئے عنایت فرمائے۔ مدرسے کی امداد کا

بھی و عذہ فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ القاسم میں دارالحدیث کا ذکر دیکھ کر میرا خیال ہوا تھا کہ اس قدر رقم بھیجوں جواب تک دارالحدیث میں نہیں آئی۔

چندہ دہندگان کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف صاحب دکیل کے خواب کو القاسم میں پڑھ کر بہت سے لوگوں نے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اہلبیت کی طرف سے بھی چندہ دیا۔ چنانچہ ماہ شوال ۱۳۲۹ھ کے چندے کی فہرست جو القاسم ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئی ہے اس میں بعض چندہ دہندگان کی کیفیت چندہ حسب ذیل ہے :

- ۱۔ یکے از خدام مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
- منجانب حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ ۲۰ روپیہ
- ۲۔ منشی بشیر احمد از جانب مولانا علی گڑھی صاحب
- منشی بشیر احمد ۵ روپیہ
- ۳۔ زویرہ منشی فرید محمد خان صاحب زمیندار گنگوہی
- صلح مین پوری تفصیل ذیل :-

- (۱) منجانب حضور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ ۲۰ روپیہ
- (۲) منجانب حضرت ابو بکر و حضرت عمر حضرت عثمان و حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین مبلغ ۴ روپیہ
- (۳) منجانب حضرت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما مبلغ ۲ روپیہ
- (۴) منجانب حاجی امداد اللہ صاحب و مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی مبلغ ۵ روپیہ

مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے دارالحدیث کے چندے کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی تعمیر کی مدد میں لوگوں نے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے اس کثرت سے چندہ دیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔

در اصل اس کی مقبولیت کا لازمی ہے کہ
اس کی بنیاد جن بزرگ ہاتھوں سے رکھی
گئی ہے وہ خود خدا کے مقبول بندے تھے۔
چنانچہ دارالعلوم میں دارالحدیث کی بنیاد

بنیاد دارالحدیث دارالعلوم دیوبند
۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۲ء - بدست
مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

رکھنے کی تقریب میں ۲۰ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ کو ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں بیرون دیوبند
سے بھی ممتاز ہستیاں شریک ہوئیں۔ طلبہ نے خود بنیادیں کھودیں حضرت حکیم الامت
مولانا اشرف علی صاحب نے اس کی بنیاد رکھی اور پھر فرمایا کہ سب صاحبان دودوائیں
رکھیں نہ معلوم کس کی انٹیں شرف قبولیت حاصل کریں۔ پھر حال دیوبند کے تمام علما اور
طلبہ نے بنیاد میں حصہ لیا۔ پھر یہی عمارت مقبول نہ ہوتی تو اور کوئی ہوتی۔

ہم نے دارالحدیث کے تاریخی پس منظر کو چھپرے تحریر کو طویل و ضرور بنادیا لیکن
جیسا کہ میں نے عرض کیا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے سوانح زندگی میں دارالعلوم کی تاریخ
بھی لپٹی ہوئی ہے اس لئے بات میں بات چھپرے لکھی اور اس طرح دارالحدیث کی عمارت کا
ایک خاکہ سامنے آگیا۔

دارالحدیث کے لئے علامہ عثمانی
سفر خوجہ ضلع بلند شہر
علامہ مرحوم کے مختلف سفروں کے اسباب
میں بڑھانہ ضلع مظفرنگر اور خوجہ ضلع
بلند شہر کے اسفار کا سبب آپ کے مخلص

اور قلبی دوست مولانا الحاج محمد عماد الدین صاحب انصاری شیرکوٹی کا ان دونوں
مواضع میں بسلسلہ مدد سی قیام بھی ہے۔ مولانا شیرکوٹی دارالعلوم سے فارغ ہو کر
شیخ الہند کے حکم کے مطابق ۱۳۲۳ھ کے لگ بھگ بڑھانہ ضلع مظفرنگر کے
اسلامی مدرسے میں مدرس مقرر ہوئے تو حضرت عثمانی دیوبند سے اکثر مظفرنگر جاتے
اور وہاں سے بیل گاڑی میں بڑھانہ مولانا شیرکوٹی سے ملنے جاتے۔ آپ کے یہاں

کئی کئی روز قیام فرماتے اور اکثر بلکہ روزانہ تربوز اور خربوزوں کا لطف اٹھاتے۔ مولانا انصاری مدظلہ نے مجھ سے فرمایا کہ ہم دونوں اکثر فالیزوں پر چلے جاتے اور وہیں بیٹھ کر کھیتوں پر تربوز خربوزے کھاتے اور فالیزوں کے مالک اسے اپنی عزت افزائی اور فخر سمجھتے اور دعوتیں کرتے۔ مظفر نگر اور بڈھانے کے درمیان ایک ندی تھی علامہ اسے پیدل عبور کرتے اور کبھی پیدل چل کر بھی پہنچتے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب مولانا انصاری مدرسہ خازن العلوم خوجہ ضلع بلنہ شہر کے صدر مدرس بن کر تشریف لے گئے تو علامہ عثمانی اکثر وہاں تشریف لے جاتے اور بندرہ بندرہ روز قیام فرماتے۔ مولانا انصاری کا بیان ہے کہ وہاں آپ کی تقریریں ہوتیں اور لوگ محبت کے پھول آپ پر قربان کرتے۔ دعوتیں اتنی کثرت سے ہوتی تھیں کہ پروگرام بنانے پڑتے تھے۔ وہاں کی آمد و رفت نے حضرت عثمانی کو اہل خوجہ کی آنکھوں کا تارا بنا دیا۔

جب دارالحدیث کی تحریک ہندوستان میں جاری ہوئی اور لوگوں میں اس کی طرف قلبی شوق کی فراوانی ہوئی تو مولانا انصاری نے خود بھی دارالحدیث کے لئے بہت ساچندہ فراہم کیا اور مولانا عثمانی کو مہتمم صاحب دارالعلوم کی معرفت خوجہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ مہتمم صاحب تحریر فرماتے ہیں :

”خوجہ میں القام کے ذریعہ بنائے دارالحدیث کی خبر پہنچ چکی تھی اور

بعض مخیر و نیک دل اصحاب معقول مقدار میں امداد فرما بھی چکے تھے مگر

شروع سوال (۱۳۲۹ھ) میں وہاں کے بعض مخلصین کے اصرار سے مولوی

شبیر احمد صاحب کے خوجہ پہنچنے پر ایک عام جوش پھیل گیا۔ نہایت تقاضا

اور اصرار سے وعظا کہلائے گئے اور مولوی صاحب کی بہت سی بااثر اور

موثر تقریریں ہوئیں۔ ان تقریروں کا عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں پر ایسا گہرا

رنگ چڑھا کہ لوگوں میں چندہ کی ایک عام تحریک پیدا ہو گئی۔ اور ہر ایک قوم نے دارالحدیث میں حسب حیثیت شرکت کی۔ اور وہاں کے معزز حضرات نے نہایت مستعدی اور فراخ دلی سے چندہ بھی دیا۔ اور اپنا عزیز وقت صرف کر کے جگہ جگہ سے چندہ وصول کرایا۔ اور تین چار یوم میں ربا و جوئے وغریب وہاں کے مسلمان کئی چندوں میں اپنی جیبیں خالی کر چکے تھے۔ ساٹھ پانسو روپیہ نقد جمع ہو گیا اور توقع کی جاتی ہے کہ بہت جلد مقدار چندہ ایک ہزار روپیہ تک پہنچ جائے گی جو اس سے پہلے کبھی کسی مدرسہ کے لئے نہیں ہو سکی :- (انعام شوال ۱۳۲۹ھ ص ۳۲)

اس عبارت سے مولانا کی ان خدمات کا پتہ چلتا ہے جو دارالعلوم کی تعمیر سے متعلق ہیں۔ جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت ایک ہزار کا چندہ خاص وقت رکھتا تھا۔ درانحالیکہ بعض چندوں کی وجہ سے وہاں کے لوگوں نے اپنی جیبیں خالی کر دی تھیں۔ اس عبارت سے ان کی تقریروں کے اثر اور جوش کا بھی پتہ چلتا ہے۔

کئی سال تک دارالحدیث کی بنیادیں پھری پھری رہیں،
تعمیر دارالطلبہ | اور چندے آتے رہے لیکن مدرسہ کے قریب گندے نالے کو پیچھے ہٹانے کی کوشش بھی ہو رہی تھی جس کے بغیر اس عمارت کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی۔ جناب مولانا حبیب الرحمن عثمانی مرحوم اس کی برابر کوشش میں تھے تاہم مسٹر میسٹن گورنریو: پی کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی اور ہتم صاحب کامیاب ہوئے تب کہیں جا کر بدقت بسیار نالہ دور ہٹا کر لے جایا گیا اور عمارت کو بلند کیا جانے لگا لیکن روپیہ پھر بھی ناکافی تھا اُدھر تاخیر کے سبب قوم میں بدگمانی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ مولانا عثمانی کا قوم پر اثر تھا اس لئے ہتم صاحب نے دارالحدیث کے چندے کے لئے علامہ سے ایک نہایت ہی ادبی اور مؤثر مضمون لکھایا جو واقعی اثر

میں ڈوبا ہوا اور ادب پارہ ہے۔ ذیل میں ہم مضمون بعینہ درج کرتے ہیں کہ ان کے زور قلم کی یادگار ہے اور جو رسالہ القاسم ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں شائع ہوا ہے۔ رسالے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ کا رسالہ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم نے مرتب کیا تھا :-

مضمون حضرة الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

مدرس دارالعلوم دیوبند

عشق و محبت کی بحث میں تم نے مجنون و لیلیٰ کے تذکرے پڑھے۔ قیس و فراد کی داستانیں اور یہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ رات کے وقت جب شمع روشن ہوتی ہے تو ہزاروں پروانے اپنی چھوٹی چھوٹی ہستیتوں کو کس اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ شمع کی کوہ پر نثار کرتے اور تن من کو جلا ڈالتے ہیں۔ لیکن تم کو غالباً کبھی ایسے پروانوں کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو گا جنہوں نے شمع کی آگ میں اپنے کو اس لئے جلا یا ہو کہ وہ جلنے سے بچ جائیں اور اس لئے فنا کیا ہو کہ وہ پھر کبھی فنا نہ ہوں۔ چین میں خاموش پھولوں کے ارد گرد سینکڑوں دفعہ بلبلوں کے پیچھے سے ہوں گے پراسیا ایک دفعہ بھی نہ سنا ہو گا کہ شاید گل تو خود چھپا رہا ہو اور شور مچانے والی بلبلیں ساکت و صامت رہ کر اس کے ایک ایک لفظ کو چن رہی ہوں۔

پس آؤ کہ تم کو حجاز کی سرزمین میں کے نور سے روشن کی ہوئی وہ شمع محمدیؐ دکھلائیں جس پر لاکھوں پروانوں نے اپنی ہستیتوں کو محض اس لئے جلا ڈالا کہ وہ خدا کی سب سے بڑی دہکتی ہوئی آگ کی لپٹ سے محفوظ ہو جائیں اور اپنی چند روزہ حیات کو اس کے قدموں پر اس لئے قربان کر دیا کہ ان کو دائمی زندگی حاصل ہو۔

عرب کے خشک ریگستانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں (خدا کی قدرت دیکھو)

ایک غنچے میں چٹنگ پیدا ہوئی اور ایک ایسا پھول کھلا جس کی مست کر دینے والی
 جھلک کے سامنے مشک و گلاب کی بھی حقیقت نہ رہ گئی۔ اور جب بلبوں کے دماغوں
 میں اس کی مدہوش کر دینے والی خوشبو پہنچی تو انہوں نے جمع ہو کر خوب شور مچانا شروع
 کیا۔ اس پر چغتستان نبوت کا وہ گل سرسبد گویا ہوا اور اپنے نغمہ طرب افزا سے سب
 کی زبانیں خاموش کر دیں۔ پھر کیا تھا بلبیں اُس کا لحن راؤ دی سُننے کے لئے گردنیں
 جھکا جھکا کر ادبِ سمیٹ سمیٹ کر بیٹھ گئیں۔ اور جو لفظ بھی اس کی زبان سے نکلا
 اس کو اٹھالیا اور جو کلمہ بھی سنا اس کو فوراً دل کی تختی پر لکھ لیا۔

میرے اس بیان کو تم محض شاعریت مت سمجھو بلکہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی سیرت پڑھو اور آپ کے ساتھ ان کے شغف اور تعلق کا اندازہ لگاؤ
 تو تم کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ آپ کے اصحاب بھی تھے اور شاگرد بھی۔ عاشق
 جاں نثار بھی تھے اور دردم ناخزیدہ غلام بھی۔ مؤدب بھی تھے اور بے تکلف بھی۔ آپ
 کو اپنا محبوب بھی سمجھتے تھے اور بادشاہ بھی۔ نبی بھی مانتے تھے پدر بزرگوار بھی۔ پھر ایسی
 حالت میں یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کے آثار اور روایت میں سے کسی ایک کو بھی
 ضائع کر دیتے۔ یا ان کے نشر و اشاعت میں ادنیٰ بے اعتنائی کو کام میں لاتے صرف
 ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبادلہ ثلاثہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم
 اجمعین کی روایات کا تتبع ہی ہم کو یہ جتلانے کے لئے کافی ہے کہ آپ نے شاید کس برس
 کے عرصے میں کوئی سانس نہیں لی اور ایک قدم نہیں اٹھایا اور کبھی لبوں کو حرکت نہیں
 مگر آپ کے اصحاب نے اس کو پورے اہتمام کے ساتھ قلم بند کر لیا اور یا کاغذ کے
 اوراق سے بھی زیادہ پائیدار یادداشت میں محفوظ رکھا۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں
 نے زندگی کے ہر شعبہ میں آپ ہی کی ذات بابرکات کو اسوہ حسنہ ٹھہرا لیا تھا۔ اور
 دین و دنیا کے ہر ایک کام میں وہ آپ ہی کے اقوال و احوال کو (جن پر ان ہُوَ

اَلَا دَعْنِي وَيَوْمَئِذٍ اَكُنْ مِنَ الْمُنْجَيْنِ (دلیل راہ مان چکے تھے ۔

بعدہ انہوں نے تمام دنیا کو اسی ایک مقصد (عَلَىٰ بَصِيرَةٍ اَنَا وَمَنْ يَتَّبِعُنِي) کی طرف دعوت دی جس کے لبیک کہنے کے لئے مشارق و مغارب سے لوگ اسٹڈ پیسے اور کسی صحابی سے ایک حدیث سُن لینے کو انہوں نے کل دنیا اور مافیہا سے زیادہ قیمتی سمجھا ۔ اور پھر ان لوگوں کی راہ طلب میں نہ تو سمندر کی موجیں حائل ہو سکیں اور نہ پہاڑوں کی بھاری بھاری چٹانیں ۔ جنگل و بیابان قطع کرتے ہوئے اور پہاڑوں کو پھلانگتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک سے آنکھیں روشن کرنے والے موجود تھے ۔ مکہ ، مدینہ ، کوفہ ، بصرہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے پڑھانے والوں سے بھر گیا اور کل دشت و جبل نعرۂ حدیث سے گونج اٹھے ۔ اسی طرح یہ سلسلہ خلفاء عن سلف چلا اور بیسیوں علوم خاص فن حدیث کے لئے مدوّن ہو گئے ۔ یہاں تک کہ ثریا تک پر فائز کرنے والوں عجیبوں کی ایک جماعت نے روایات اور الفاظ حدیث کا ایک چھانا اور تایا ہوا صحیح و صاف ذخیرہ جس میں وضّاعین اور کذا بین کے بطلالت انگیز مکائد کی ذرّہ برابر بھی آمیزش نہ تھی ہمارے ہاتھوں میں قیامت تک کے لئے چھوڑ دیا اور ایک دوسرے گروہ نے (جو لعلمہ السّٰنِیْنَ یَسْتَسْطِیْوْنَہٗ مِنْہٗ) میں شامل تھا) ان احادیث کے اسرار و معارف اور اصول و فروع منضبط کر کے سینکڑوں علوم اسلامیہ کی بنیاد ڈالی ۔ انہوں نے یہ بخوبی ثابت کر دکھایا کہ نہ تو دنیا کا کوئی فلسفہ ان تعلیمات کا مقابلہ کر سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو دی ہیں اور نہ مصریوں کا بلغریہ تمدن اور یہ حکمت یونان کی عظام ریم (گلی سٹری ہڈیاں) سے

فریب رائے عزیزاں چیرا خورم کہ مرا

حدیث سید کونین ہر زبان باقیست

اس زمانے کے ملوک و سلاطین کی توجہ اور حوصلہ افزائی بھی داد دینے کے قابل ہے کہ انہوں نے علمائے حدیث کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا۔ خود محدث بنے اور لوگوں کو اس طرف رغبت دلائی حتیٰ کہ دمشق اور قاہرہ وغیرہ میں خاص دارالحدیث کے نام سے عمارتیں بنوا کر آئندہ نسلوں کے لئے نیک مثالیں قائم کیں۔ گویا اس طرح وہ امانت جو قلم نے بطون و اوراق میں جمع کی تھی مدارس کے کمرؤں کے سپرد کر گئی۔

تاریخ کی ضخیم جلدیں اس چھوٹے سے اشتہار میں نہیں سما سکتیں جن سے تم کو یہ معلوم ہوتا کہ اب سے چند صدی پہلے کس طرح مسلمانوں کی غفلت اور کم ہمتی یا ہل انکاری سے بالخصوص ہندوستان میں علم حدیث (اور صحیح معنوں میں علم حدیث) قریباً ناپید رہا۔ اور پھر کس طرح دہلی کے ایک حکیم امت نے مدینہ منورہ سے ایک ہرکات کر نئی روانی اور حیرت انگیز آب و تاب کے ساتھ ہندوستان کی بنجر زمین میں جاری کی اور پھر کس صورت میں اس کے حقیقی وارثوں نے اس کو خشک ہونے سے بچایا۔

میرے نزدیک آپ کو تاریخ کے سارے دفتر کو الٹ پلٹ کرنے کی ضرورت نہیں دیوبندی تہجد اور قاسمی رشیدی بلکہ ولی اللہی دارالعلوم کو دیکھ لو وہ خود فن حدیث و فقہ کی ایک مجسم تاریخ ہے۔ کیونکہ اسی نے آج اس کساد بازاری کے زمانے میں اس متاع گرانمایہ کو رواج دیا جس کو مسلمان اپنی بد قسمتی سے کھو بیٹھے تھے۔ یہاں پہنچ کر تم دیکھو گے کہ حدیث کی تعلیم کس طرح ہوا کرتی ہے۔ اور کس طرح ہونی چاہئے۔ اور کس طرح آج بھی اعناق، مطایا کو قطع کر کے طالبین حدیث کے جوق در جوق مختلف اقطار و کثاف سے چلے آ رہے ہیں۔ اور کس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم وطن آج دیوبند کے دارالعلوم سے ان کے قدیم ترکہ کو بخارا پہنچانے میں سرگرم ہیں۔ اور کس طرح اس نہر کے چند قطرے مدینہ طیبہ پہنچ کر اپنے اصلی حشر میں جا ملے ہیں۔

مشتاقان حدیث اور عاشقان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ہجوم کو دیکھ کر

منتظمین دارالعلوم بھی تنگ مکانی سے گھبراٹھے اور تقریباً چھ سال ہوئے کہ انہوں نے
تاسیس دارالحدیث کے متعلق آواز بلند کی۔ مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس کو مستاد اور ایسے
قبول عام کے ساتھ سنا کہ جس کی نظیر کم از کم میری نگاہ سے تاریخ میں نہیں گذری۔ میں
نے کسی دارالحدیث بلکہ کسی درسگاہ کی نسبت نہیں بڑھا کہ اس میں جناب رسالت مآب
صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور مشائخ عظام رضی اللہ عنہم کی طرف
سے نیراروں آدمیوں نے چندے بھیجے ہوں اور ایسی مبشرات بیان کی ہوں جو دارالحدیث
دیوبند کی نسبت بیان کی گئیں۔ زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن میں اتنا کہنے پر نہیں
رہ سکتا کہ جو دارالحدیث عہد ماضی میں بناتے گئے ان کے بانی سلاطین اور فرمانروا
تھے اور اس کے محرک و ساعی عموماً فقرار اور متوسط الحال لوگوں کی ایک جماعت
بہر حال چھ سال ہوئے یہ غلغلہ اٹھا اور ایک نہایت معقول رقم جس کی تفصیل
کسی دوسری اشاعت میں معلوم ہو سکے گی چند یوم میں بغیر کسی معتد بہ مادی شے
کے اس میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد یکایک وہ پھر خاموشی سے بدل گیا جس کی بہت
سی وجوہ عوام نے طبعاً اختراع کر لیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ایک سرکاری
گندے نلے کے حائل ہونے کی وجہ سے بڑے عرصے تک یہ مقدس کام رکرا رہا۔
پیہم مساعی کے بعد خداوند تعالیٰ نے گورنمنٹ عالیہ کو اس طرف متوجہ کیا اور موجودہ
نیرانہ رواب لفٹیننٹ گورنر بہادر کی قابل شکریہ عنایات خاصہ سے دارالعلوم کے
ارباب حل و عقد اس مشکل پر غالب آئے۔ یہاں تک کہ پاکی نے ناپاکی کو دور
کر دیا اور آفتاب قدس کی شعاعوں کو نجاست کے چھلنے گندہ نہ بنا سکے اور
اَمَّا السَّابِقُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي
الْاَرْضِ کی مثل پوری صادق ہوئی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِكَ۔
اب جماعت اسلام اور اخوان صدق و صفا کی اطلاع کے لئے یہ اعلان

شائع کیا جاتا ہے کہ بحمد اللہ دارالحدیث کی عالیشان بنیادیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی
 ہیں بھری گئیں اور عمارت کا نقشہ زمین پر قائم ہو گیا اور نہایت سرعت کے ساتھ
 کام جاری ہے۔ لیکن یہ سرعت جب ہی قائم رہ سکتی ہے جبکہ ہماری قوم زائد از زائد توجہ
 سے کام لے کیونکہ یہ لاکھ سوا لاکھ روپیہ کا تحفہ اولیٰ الخد کے فضل و رحمت اور ثانیاً مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ کی
 توجہ سے انجام پا سکتا ہے، مسلمانان ہندوستان کی ہمت و سعی نے یہ کام کر دکھایا اور رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم اور آپ کی امت کے اولیاء و علماء کی یہ رفیع المنزلت یادگار سرزمین ہند
 پر قائم ہو گئی تو انشاء اللہ العزیز یہ ایک ایسی یادگار ہوگی جو دنیا میں تابدیر مسلمانوں
 کی عطا ہو وقت کو زندہ رکھے گی اور آخرت میں ذخائر حسنات ان کے ساتھ ہوگی۔
 خداوند رب العزت کے فضل و کرم سے جس کی مہربانی ہمیشہ اپنے تمام بندوں
 پر مبذول رہتی ہے، یقین ہے کہ اگر ہم سب اس کے سامنے گردن جھکا کر اور
 خالص اس کے افضال پر بھروسہ کر کے اور اپنی غفلت شعار یوں کو چھوڑ کر کوشش
 کریں گے تو وہ ضرور اپنی رحمت کی بارش ہم پر کرے گا جس سے امیدوں کی تمام
 کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی اور کوئی مشکل ایسی نہ رہے گی جو آسانی سے نہ بدل جائیگی۔
 فضل کس حال میں شامل رہا ایک دم بھی کبھی لطف سے غافل نہ رہا
 حال اپنا ہی کسی کام کے قابل نہ رہا در نہ سخت غلط ہے کہ وہ مائل نہ رہا
 اے کہ خواہی بچھاں اشرف ممتاز آئی
 می نشانہ کہ زیندار بہ پرواز آئی

پس اے خدائے قدیر

موجو عقدہ دشوار ہیں آساں کر دے

سر بسر درد کی تصویریں درماں کر دے

خوگر گریہ اندوہ کو خنداں کر دے

تجھ میں قدرت ہے کہ کانٹے کو گلستاں کر دے
 شد فراغ و خوش جہاں قصہ پارینہ ما
 باز نقدے برواج آرزو گنجینہ ما
 (القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ صفحہ ۵۵ سے ۶۱ تک)

رقم زدہ

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

مدرس دارالعلوم دیوبند

مورخہ ۲۲ محرم الحرام ۱۳۳۵ھ

دارالحدیث سے متعلق علامہ کا یہ مضمون، حدیث کی عظمت، مدارالحدیث کی تاریخی شوکت اور زبان کی طلاقت کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کے اس مضمون کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ القاسم کے اوراق سے اس کے رد عمل اور تعاون کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے اس سلسلے میں اور کوئی قدم اٹھایا یا نہیں نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ تعمیر کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ پورے طور پر اس کی تکمیل ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ جس کا طول اڑسٹھ فٹ اور عرض پینتیس فٹ ہے۔ اور جس کا نقشہ سید عاشق حسین صاحب ریاست انجینئر بہاولپور نے بنایا۔ مجھے تو اس سلسلے میں یہ کہنا تھا کہ القاسم کے اوراق میں دارالعلوم کی علمی اور عملی خدمات میں علامہ عثمانی کے حالات جا بجا ملتے ہیں، اور اسی سلسلے کی ایک کڑی دارالحدیث کے لئے علمی اقدام مضمون کی صورت میں اور عملی قدم غور و جہ سے پہنچنے اور اس کے لئے مالی امداد کے لئے اٹھایا۔

دارالحدیث کے علاوہ علامہ نے دارالعلوم کے جدید
تعمیر دارالطلبہ جدید | بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لئے بھی قدم اٹھایا تھا۔
 آپ نے اس سلسلے میں ضلع بینور کا دورہ کیا۔ مولانا مفتی حسن صاحب چاند پوری ظم

تعلیمات دارالعلوم، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بھی ہمراہ تھے۔ دہلی سے مولانا احمد سعید صاحب بھی پہنچ گئے تھے۔ اس سفر میں راقم الحروف خادم سفر کے طور پر ساتھ تھا۔ سب سے پہلے یہ وفد نہٹور ضلع بجنور گیا۔ وہاں علامہ کی تقریر ہوئی، بعد ازاں ہالہ ضلع بجنور میں تقریر فرمائی۔ دھام پور سے تین میل کے فاصلے پر میں اپنے وطن شیرکوٹ چلا گیا اور یہ حضرات یاد پڑتا ہے کہ بجنور اور رنگینہ تشریف لے گئے اور علامہ نے وہاں بھی تقریریں کیں۔ یہ سفر خالص دارالعلوم کے لئے تھا۔

دیکھو دارالعلوم دیوبند | حضرت عثمانی چونکہ اپنی تحریر و تقریر کے باعث ہندوستان میں بلند پایہ شہرت کے مالک ہو

چکے تھے اور لوگوں میں آپ کا اثر تھا اس لئے دارالعلوم کی وکالت بھی آپ ہی کے سپرد تھی۔ ہر وہ جملہ جوارالعلوم دیوبند یا مجلس انتظامیہ یا تعلیمی و انتظامی امور کسی کا ہوتا آپ کو ہی اس کے جواب میں دیکھ لیا اور نمائندہ بنایا جاتا۔ گویا آپ مادری کے لئے سپر کا کام دیتے تھے۔

دارالحدیث کے مضمون میں یہ اشارہ آپ کی نظر سے ابھی گذرا ہے کہ سرکاری گندہ نالے کی وجہ سے دارالحدیث کی بنیادوں کا کام رکا پڑا تھا۔ تاآنکہ یہ رکاوٹ دور ہوئی اور برطانیہ کی حکومت نے اس کو اس جگہ سے دور ہٹانے کا حکم دیدیا جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب جن کو راقم الحروف تدبیر و سیاست میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عکس (پر تو سمجھتا ہے) انہوں نے اس زمانے کے صوبہ آگرہ و اودھ کے گورنر سر جیمس میسٹن کو اس سلسلے میں نواب عبدالصمد خان صاحب ٹکس طالب نگر اور نواب حافظ احمد سعید خان صاحب چھتاری کے ذریعہ دعوت دی۔ چنانچہ گورنر صاحب نے دعوت کو قبول کر لیا لیکن تاریخ کا تعین نہ ہو سکا۔ جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم کسی مدرسے کی ضرورت سے

۲۶ جنوری ۱۹۱۵ء کو دہلی تشریف لے گئے اور گورنر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تاریخ آمد کے متعلق کہا کہ ہم نواب عبدالصمد صاحب سے ملاقات کے بعد مقرر کریں گے۔ ۲ فروری ۱۹۱۵ء کو ہر دو نواب صاحبان مشورے کے لئے دیوبند پہنچے۔ رائے طے پائی کہ نصف فروری تک اگر وہ میں دربار ہوگا اس وقت تاریخ کے تعین پر گفتگو کر لی جائے گی۔ ۲۴ فروری کو اطلاع ملی کہ گورنر صاحب یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو دیوبند پہنچیں گے۔ چنانچہ خاص گاڑی (اسپیشل ٹرین) ۸ بجے صبح کے بعد دیوبند پہنچی۔ سٹیشن پر دونوں نواب صاحبان نے استقبال کیا اور دس بجے کے بعد گورنر صاحب دارالعلوم میں پہنچے۔ صدر دروازے پر مہتمم صاحبان اور اراکین مدرسہ نے استقبال کیا۔ دو گھنٹے تک گورنر صاحب نے دارالعلوم کی تمام عمارتوں کا معائنہ کیا۔ مہتمم صاحب مولانا حبیب الرحمن مرحوم القاسم میں لکھتے ہیں :-

”دو گھنٹے قیام فرما کر دارالعلوم کے احاطوں کو اندر باہر سے ملاحظہ فرمایا اور گندہ نالہ سرکاری و تالاب عقب مدرسہ پر تشریف لے جا کر دیر تک نالے کے مٹلاتے جانے کے بابت جس کے ہشادینے کی بابت ہزاروں خواہش کی گئی تھی گفتگو فرماتے رہے۔“ (القاسم جامی الاولیٰ ۳۳۲ ص ۷۱)

یہ وہ ”بدتھا جس کے لئے حضرت مہتمم صاحب نے تارگر گورنر صاحب کو بلایا تھا۔ بہر حال ایڈریس پڑھ گئے، کتب خانہ دیکھا گیا، جلسہ ہوا۔ ایڈریس کا جواب گورنر صاحب نے دیا جس کی تمام اجمالی اور تفصیلی کیفیت مذکورہ بالا رسالہ القاسم اور رولڈ میں موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ صوبے کی سب سے بڑی حاکمانہ شخصیت کی آمد پر دارالعلوم کو سب جانا ناگزیر تھا۔ ان کی آمد اور استقبال پر اہتمام کیا گیا۔ جھنڈیاں بھی لگائی گئیں۔ کچھ فرش فروش بھی ہوا۔ اور اس جلسے جلوس کے بعد جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب

گو گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے ایک ماہ کے بعد شمس العلماء کا خطاب بھی مل گیا۔ جلسے میں شہری اور معزز حکام، ہندو مسلمان سب ہی تھے۔ گورنر صاحب کے ایڈریس پر ان بیرون مدرسہ کے لوگوں نے خوشی اور احترام میں حسب دستور زمانہ تالیاں بجاتیں۔ علمائے دیوبند کے لئے یہ صورت معذوری کی سی تھی۔ یہ حالات باہر بھی پہنچے۔ بات کا بتنگڑ بن گیا۔ کارکنان مدرسہ کی پوزیشن اور دارالعلوم کی بیہودی کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی صاحب نے مدرسہ کے خلاف زمیندار میں معترضانہ مضمون شائع کرایا۔ یہ مضمون مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے تھا لیکن مضمون نگار کا نام نہ تھا۔ تاہم پتہ چلانے والوں نے پتہ چلا لیا۔ اس مقام پر یہ بھی واضح کر دوں کہ مولانا عبداللہ صاحب دیوبند سے الانصار کے بعد چلے گئے تھے۔ اور دہلی کی دوسری جماعت یعنی ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام سے جا ملے تھے۔ یہ سارے دور ابھی ختم ہو چکے تھے اور پانی سر سے گذر گیا تھا۔ گورنمنٹ میں دیوبند کی انصاریہ سیاسی سرگرمیوں سے بدگمانی سی ہو گئی تھی۔ کارکنان مدرسہ اپنی پوزیشن کو بھی صاف کرنا چاہتے تھے اور اپنا کام بھی نکالنا چاہتے تھے۔ گورنر کی آمد پر شیخ الہند مدرسہ میں موجود تھے۔ مولانا عبید اللہ اپنی دہلی کی انجمن نظارۃ المعارف میں کام کر رہے تھے۔ اور جو اسی سال اگست ۱۹۱۵ء میں کابل چلے گئے تھے اور شیخ الہند بھی گورنر صاحب کی آمد سے کئی ماہ بعد شوال ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں حجاز کو روانہ ہونے والے تھے اور ہوئے تھے۔ جنگ یورپ چھڑی ہوئی تھی اسی دور میں مسیٹن دیوبند آئے تھے۔

ان حالات میں مدرسہ عالیہ اور اس کے کارکنوں پر اعتراضات کا ہونا بالکل قرینہ فیاں تھا دراصل ایک گورنر کی آمد کے بعد جناب مہتمم صاحب کو شمس العلماء صاحب بھی مل چکا تھا۔ حالانکہ یہ زمانہ انگریزوں سے نفرت کا زمانہ تھا۔ ان اعتراضات، درجہوں سے بچانے کے لئے علامہ شہیر احمد صاحب کو وزیر دفاع بنایا گیا

اور انہوں نے اپنے ایک زبردست جوابی مضمون میں جو زمیندار ۱۳ جولائی ۱۹۱۵ء میں بھی چھپا اور علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہوا اور القاسم رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ مطابق اگست ۱۹۱۵ء میں ”تشریح واقعہ دیوبند“ اور ”عطائے اعزاز کی حقیقت“ کے عنوانات کے ماتحت چھپا۔ اس مضمون میں اپنے جہان دار العلوم کی حمایت میں قلم اٹھایا وہاں مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوزیشن کو بھی صاف کیا۔ بہر حال مولانا آزاد نے جو اعتراضات کئے ہیں وہ اور علامہ عثمانی کے جوابات ہدیہ ناظرین ہیں :-

معترض مولانا ابوالکلام آزاد :- جس طرح سرآمد خدام ہند، شیخ الاحرار، قبلہ فداکاران و سرفروشان عصر مسٹر گاندھی کو بایں ہمہ ملت پرستی و حریت کاری خطاب کا ملنا تعجب انگیز ہے، ایسا ہی یہ واقعہ بھی تعجب انگیز ہے کہ مولانا محمد احمد صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔

(۲) عام طور پر آج تک جو طرز عمل عطائے خطابات و مناصب میں رہا ہے یعنی بالعموم ان لوگوں کو خطاب دینا جو مقام عالیہ کے لئے میرا یا علنا خدمات انجام دے چکے ہوں یا ان سے اس طرح کے خدمات توقع ہوں، اس کے لحاظ سے مولانا موصوف کو شمس العلماء بنانا تعجب انگیز یا اقلًا خلاف توقع ہے۔

(۳) اس لئے کہ مولانا کی آزاد شخصیت اور بے باکانہ صداقت جلسہ سہارنپور میں ظاہر ہو چکی ہے۔

(۴) مولانا کی اعلیٰ شخصیت کو نہ کبھی پہلے خطاب کی ضرورت تھی اور نہ (فدا نا خواستہ) کبھی ہو۔ ع

”بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت دوئے زیبا را“

مجیب علامہ شبیر احمد عثمانی بر امور مذکورہ بالا میں سے امر اول پر نظر ڈالتے ہوئے حقیقت نگار موصوف کا یہاں نہ جوش چمک پڑا اور انہوں نے سخت فعل وراثت ہو کر ایڈیٹر ہمدرد سے یہ مؤاخذہ کیا ہے کہ ”مشہور وطن پرست گاندھی اور مدرستہ دیوبند کے تنخواہ دار ہتم مولا نا محمد احمد صاحب دونوں کو ایک صف میں کھڑا کرنے کا آپ کو کیا استحقاق تھا جبکہ موخر الذکر کو کسی قسم کے ایثار قومی اور فداکاری کے دکھلانے کا موقعہ نہیں ملا۔ اور برخلاف اس کے مسٹر گاندھی نے جو کچھ کیا وہ تاریخ صداقت و وطن پرستی میں محفوظ ہے۔

بلاشبہ حقیقت نگار موصوف کی طرح ہمارے لئے بھی اس امر کا احساس سخت تکلیف دہ ہے کہ شیریشہ مذہب اور ایک آزاد پولیٹیکل یونٹ کو ایک نگل میں اتار دیا جائے یا کسی سادہ اور روشن ضمیر خدا پرست کو کسی معروف و مصطلح وطن پرست کی صف سیاست میں لا کر کھڑا کر دیا جائے۔ کیونکہ

صلاح کار کجا و من خراب کجا بسیں تفاوت رہ از کجاست تا کجا
چہ نسبت است بزدی صلاح و تقویٰ را سماع و عطا کجا، نغمہ رباب کجا
لیکن ہم جانتے ہیں کہ فی الحقیقت معزز ایڈیٹر ہمدرد پر کسی ایسی صف آرائی کا الزام رکھنا محض بے بنیاد ہے جس میں مسٹر گاندھی اور مولا نا محمد احمد صاحب کو دوش بدوش کھڑا کیا گیا ہو۔

ہمدرد کے ان الفاظ سے کہ ”دیوبند کے ایک سید سے سادے غیر شہرت پسند بزرگ ہتم دار العلوم الاسلامیہ کو بے مانگے شمس العلماء کا خطاب ملنا

ایسا ہی خلاف توقع اور غیر متوقع ہے جیسا کہ مسٹر گاندھی کی جنوبی افریقہ کی خدمت کا صلہ ہندوستان میں بصورت خطاب دیا جانا؟ میں نہیں سمجھتا کہ کس منطق کی بنیاد دونوں کے کارناموں کی مساوات اور ان کی پوزیشنوں کے عدم امتیاز کا نتیجہ نکال لیا گیا۔ ہمدرد خود دونوں کی خدمات کی طرف اشارہ کر کے ہر ایک کی نوعیت کو اپنے مختصر جملوں میں واضح کر رہا ہے لیکن آپ ہیں کہ نہیں دیکھتے اور نہیں سنتے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ دارالعلوم دیوبند (جس کے اہتمام کی ذمہ داری مولانا محمد احمد صاحب کو لوگوں میں ممتاز بناتی ہے) کوئی معمولی مکتب یا انجمن نہیں ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی یادگار ہے جس کے بانی جس کے فیض یافتہ طلبہ، جس کے مدرسین، جس کا نصاب تعلیم اور جس کا سارا سٹاف خالص مذہب کی روح اپنے اندر رکھتا ہے اس نے ہمیشہ اپنی خاموش، پُر امن، بے ضرر مگر پائدار ناممکن انقلاب اور نہایت ہی غیر متزلزل رفتار میں مذہب کی تعلیم کو عام کیا اور سچے اسلامی جذبات کو عوام و خواص اور مشرق و مغرب تک پہنچایا۔

وہ اپنی آواز پر کان دھرنے والوں کو، اس وقت بھی جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بڑے بھاری لیڈر کانگریس کے مقاصد میں شرکت کرنے کو حماقت اور گمراہی سمجھتے تھے، اور جبکہ ”قرآن کریم میں سے بہت ساری گرم خوش آیات کو لفظاً یا معنائاً نکال ڈالنے کا مسودہ پیش ہو رہا تھا“ اسی قرآن اور اسی دفترِ احادیث کے تمام ابواب کی بے کم و کاست اور آزادانہ تعلیم دے رہا تھا جس کی آج اس زمانے میں دے رہا ہے جبکہ مسلم لیگ اور کانگریس کو مدغم کئے جانے کی کوشش جاری ہے۔ اور جبکہ پُر خوش جذبات کی نمائش کرنے والے ان ہی مولویوں کو جن کو وہ دس بیس سال پہلے مذہبِ نبی کی

دیوانہ ، نا عاقبت اندیش کہا کرتے تھے ، اب نہایت کمزور ، بزدل اور مصلحت ساز خوشامدی بتلاتے ہیں ۔

انقلاب لیل و نہار کو دیکھو اور بغور دیکھو کہ ایک وہ حالت تھی جبکہ دارالعلوم کی تعلیم کو مغویانہ اور برہم زن امن و اماں اور مفسد ملک و ملت سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ ایک مطبوعہ اشتہار میں ” قابل غور گورنمنٹ “ کے عنوان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ” سرحد ، کابل اور دوسری جگہ کے مسلمان ، جہاں کہیں نصاریٰ سے جنگ کرتے ہیں ان سب کی سکیم دیوبند کا مدرسہ تیار کر رہا ہے “ اور آج یہ کیفیت ہے کہ ان ہی سکیم تیار کرنے والوں کو (در انحالیکہ ہم ثابت کریں گے کہ وہ ابھی تک اپنے اکابرین کے قدم بقدم چل رہے ہیں) خوشامدی اور دین فروش یا اس کا مراد فترار دیا جا رہا ہے ۔

لیکن آپ خوب یاد رکھیں کہ جس طرح دارالعلوم کے ارکان کے قدم بحمد اللہ مقدم الذکر حملوں سے نہیں ڈگمگائے اسی طرح ان دوسری قسم کے ہتھکوں سے بھی کوئی وجہ نہیں کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑیں ۔

عنقا شکار کس نشو ودام باز چیں کا نجا ہمیشہ باد بدست دماں را

.....

فضائل و مناقب کی لائنوں کو آپ نے پوری طرح سمجھا ہی نہیں ورنہ آپ ہر ایک کو اس کی صنف کمال کی لائن میں کھڑا کرنے کے خواہشمند ہوتے ۔

دیکھ لو ، صحابہ کرام میں بحمد اللہ ایک سے ایک اعلیٰ افراد موجود تھے لیکن زہد و فقر میں ابو ذر کو ، امانت میں ابو عبیدہ کو ، اتباع سنت میں ابن عمر کو ، تفقہ دینی میں ابن مسعود کو ، تاویل و تفسیر میں ابن عباس کو ،

رحمت میں صدیق اکبر کو، صلابت و شدت فی الدین میں فاروق اعظم کو،
حیا میں عثمان غنی کو اور فصل قضا یا میں حضرت علی کو امام طائفہ سمجھا گیا
(رضی اللہ عنہم اجمعین ورضوا عنہ)

پس اگر فرض کر لو کہ مولانا محمد احمد صاحب میں آپ کا فرضی ایثار یا جذبہ
وطن پرستی نہیں پایا جاتا تو کیا ان کے تمام مناقب سے بھی چشم پوشی کی جاسکتی
ہے جن میں وہ ممتاز ہیں۔ اور جن کے چمکتے ہوئے آثار ہندوستان کی اسلامی
سوسائٹی کے واحد مرکز (دارالعلوم دیوبند) کی پچھلی بست سالہ تاریخ میں محفوظ
ہو چکے ہیں۔

دوسرے اعتراض کا جواب | اہل مردم کی نسبت ہم حقیقت نگار سے اس
از علامہ عثمانی۔

خطابات کے متعلق گورنمنٹ کا جو طرز عمل آج تک آپ نے بتلایا ہے.....
..... تو کیا حضرت مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالحق
صاحب خیر آبادی مرحوم (جن کو خطاب دے جانے کا آپ بھی اقرار کرتے ہیں)
اس عام کلیہ کے ماتحت داخل تھے یا نہیں۔ اور جن استحقاقات کی بنا پر آپ کے
نزدیک یہ خلعت عظمت مستحقین محترمین (مولانا عبدالحی اور مولانا عبدالحق) کے
دوش خدمت پر راست آتا ہے۔ اس کے لحاظ سے ان دونوں بزرگوار کے درجہ
ریا جانا تعجب انگیز اور خلاف توقع تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو اس پر کیا سبب
کہ گورنمنٹ آپ کے نزدیک جو غلطی دو دفعہ کر چکی ہے وہ ہی اس نے تیسری دفعہ

یہ یعنی جس طرح ان دونوں صاحبان نے گورنمنٹ کے خطابات کو واپس کر دیا تھا اس
طرح مولانا محمد احمد صاحب بھی خطاب واپس کر دیں۔ چنانچہ موصوف نے شمس العاد
کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ آثار

مولانا محمد احمد صاحب کے معاملہ میں بھی کی ہو۔

آپ نے بہت زور لگا کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ”مولانا محمد احمد صاحب کو خطاب دیا جانا سرجمیں میٹن کے دیوبند تشریف لانے کے ساتھ وابستہ ہے“ ممکن ہے کہ ایسا ہو لیکن مولانا محمد احمد صاحب کو ۱۹۰۵ء میں سرجمیں لاٹوس کی تشریف آوری سے چونکہ یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ کسی لفٹیننٹ گورنر کا دیوبند میں آنا خطاب ملنے کے مرادفی نہیں ہے ”اس لئے مولانا کا اس قسم کے خیال اور نیت سے خالی الذہن رہنا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔“

۶ جنوری ۱۹۰۵ء کو آپ ہی کے الفاظ میں :-

”دارالعلمائے والمتوکلین میں (سرجمیں لاٹوس کا) نزولِ حلال“

مولانا محمد احمد صاحب کی سرگرمی، درمیانی حضرات کی جدوجہد اور اس کے تمام کلیات و جزئیات کا مرقع، مدرسہ کے اندر عقیدت مندانہ انتظامات، دورو یہ جھنڈیوں کا تسلسل، مواردین و زائرین کا شد الرحال اور عرض نیاز کی عقیدت کشی یا جواب لطف کی پذیرائی“ (انتباس از مضمون مولانا ابوالکلام آزاد)

وغیرہ وغیرہ جو کچھ دیکھا گیا وہ اس سے ہرگز کم نہ تھا جو آپ کے اور آپ کے زہری اور سالم وغیرہ نے یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو دیکھا مگر حیرت ہے کہ اس وقت سے آج تک نہ تو کسی نے اس پر کوئی نکتہ چینی کی اور نہ کوئی پیشین گوئی

۶ جنوری ۱۹۰۵ء میں سرجمیں لاٹوس گورنریو۔ بی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی سرپرستی دارالعلوم کے زمانے میں دیوبند آئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی اس جلسے میں شرکت کی تھی لیکن ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ جس پر مولانا ابوالکلام مرحوم نے ایک ادیبانہ مضمون لکھ کر مخالفت کی تھی جس کے چند جملے علامہ عثمانی نے اپنی تحریر میں نقل کئے ہیں۔

یہاں تک ہم نے حقیقت نگار موصوف کی معلومات پر جو کچھ ریمارک کیا وہ اصولی اور کلی طور پر تھا۔ جزئی غلط بیانیوں یا مبالغہ آمیزیوں کے متعلق جو حقیقت نگار سے سرزد ہوئیں مثلاً

”سٹیشن سے مدرسہ تک دور وچھنڈیوں کا تسلسل، اس زور سے چیز کی گونج کہ علیگڑھ کا اسٹریچی بال ماند پڑ گیا، اور علمائے کرام اور فقہائے عظام پر ایسا عالم تواجہ و ترائفی طاری ہوا کہ بے اختیار عقدہ تشبہ کی پجاء سالہ تعقید خود بخود حل ہو گئی۔“

(اقتباس مضمون مولانا آزاد)

میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ اگر واقعی آپ نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر ایسا لکھا ہے تو ہزاروں اشخاص کے مشاہدات اس کی تکذیب کر سکتے ہیں اور اگر آپ نے خود بلا واسطہ ایسا نہیں دیکھا تو میں معاف کیا جاؤں اگر یہ کہوں کہ آپ کے وہ زہری کے ہم پایہ روایت جن کے ذریعہ سے آپ کو اس قسم کی روایات دستیاب ہوئی ہیں، جابر جعفی سے بھی زیادہ کذاب ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ سہ ماہی میں سرجمیں لائوس نے اثنائے اسٹیج میں خود بھی اور ان کے مین ویسار دونوں طرف کے لوگوں نے بااستننائے مہتم دارکان دارالعلوم، متحدہ حیرزد سے اور اس دفعہ سرجمیں میسٹن کی تشریف آوری کے موقع پر خود ہزار آئینے اور ان کی داہنی طرف کے لوگوں نے جن میں عموماً علمائے کرام اور منتظمین دارالعلوم تھے اور طلباء سے مدرسہ نے ایک مرتبہ بھی چیز نہیں دیا۔ ان اصحاب شمال نے جن میں بکثرت شہر کے برادران ہندو تھے خاتمہ تقریر پر حیرزدیا۔

اس اعتبار سے اگر حقیقت نگار کو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۵ء کا مجمع واقعہ معلوم ہوتا تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ۱۹۰۵ء میں عقدہ تشبیہ کی جو گریہ ذرا سی دھیلی ہو گئی تھی علمائے کرام ۱۹۱۵ء میں اس کو پھر کس دیا.....

تیسرے اعتراض (۳) امر سویم یعنی جلسہ سنہار پور کی جو اصلیت کا جواب ؛ آپ نے زہری عن سالم عن امیہ کی سند سے بیان

کی ہے اس کو دیکھ کر میں یہ کہنے میں محذور ہوں کہ تنقیح روایات اور نقد رجال کا فن ایک نیا ہیئت مشکل فن ہے اور اسی لئے غالباً اس کے دقائق تک ہمارے حقیقت نگار کی دسترس نہ ہو سکی.....

حدیث میں آیا ہے کہ شیطن دجی الہی کے سننے کے واسطے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں اور جو ایک بات دلوں سے اچک لیتے ہیں اس کے ساتھ جو جھوٹا ملا کر اپنے اتباع کے روبرو پیش کر دیتے ہیں۔ تو دیکھ لو کہ ان کی روایت کا اصل ماخذ کس قدر پاک و صاف ہے لیکن خود ان کے توسط نے خبر کو کس قدر گندہ اور بے اعتبار بنا دیا ہے۔

نفس واقعہ کی تحقیق جس کی سند پر آپ نے خواہ مخواہ اتنا زور دیا بالکل آسان تھی۔ اخبار مشرق گورکھ پور میں اس واقعہ کی مختصر سی اصلیت خود جناب ہتھم صاحب کی طرف سے ظاہر کر دی گئی تھی۔ بلاشبہ ممکن ہے کہ حضرت ہتھم صاحب نے جو تقریر جلسہ سنہار پور میں ایک حاکم وقت کے سامنے کی اور ترکی کے ساتھ اپنی ہمدردی اور اخوت اسلامیہ کا پُر زور لہجے میں اظہار کیا اور ان کی تکلیف و راحت کے ساتھ اپنی تکلیف و راحت کو وابستہ بتلایا اس میں وہ ہندوستان بھر کے اندر منفرد (تنہا) نہ ہوں لیکن ان میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ اس مجمع میں کہ جس میں عام طور پر گورنمنٹ کے ضرورت سے زیادہ خیر خواہ، برکات

سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کر کے حکام کو متاثر بنا رہے تھے جناب مہتمم صاحب ایسی صداقت کے اظہار میں ضرور مستغفرتھے۔ لیکن اس میں تو آپ کو بھی شبہ نہیں کہ مولانا نے ایک سچی بات کہی اور حجب وہ بھی بات ایک مذہبی مرکز کے ذمہ دار کی زبان سے ادا ہوئی تو قدرتی طور پر اہم ہو گئی۔

امر چہارم | امر چہارم کے ضمن میں حقیقت نگار نے خطاب قبول کرنے سے اس پر استدلال کیا ہے کہ ”مولانا محمد احمد صاحب کو بیشک خطاب کی

ضرورت و خواہش تھی۔ حالانکہ ایک عالم دین کی سب سے بڑی عزت انقطاع (عن الخلق) میں ہے بلکہ عالم دین ہونے کے لئے سب سے بڑی شرط یہ ہے ان کو دنیا کے ظواہر سے کیا سروکار؟.....

یہ بالکل درست ہے کہ ایک عالم دین کی اصلی عزت دنیا سے علیحدہ رہنے ہی میں ہے اور علماء کے جو حالات آپ نے احیاء العلوم میں پڑھے ہیں وہ بھی سب درست ہیں مگر مولانا محمد احمد صاحب فقط عالم دین ہی نہیں بلکہ وہ ایک دارالعلوم کے مہتمم بھی ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مولانا جامی قدس سرہ نے اپنے شیخ خواجہ عبید اللہ احرار کے شاہانہ ٹھاٹھ کو دیکھ کر جب یہ کہا تھا کہ نہ مراد است آنکہ دنیا دوست دارد

تو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں یوں فرمایا تھا اگر دارد برائے دوست دارد ،

دارالعلوم میں ایسے لوگ بھی آئے جو ”دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بکیر“ رکھنے کی راتے دیتے تھے انہوں نے گورنمنٹ کی رعایا بن کر دارالعلوم کے احاطے میں اس سے بائیکاٹ کرنے کی تحریک کی۔ اور وہاں کے ارکان کو

رؤسائے تعلقات اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے اس اصول سے کہ ”مہتمم اور ارکان مدرسہ کا سب سے بڑا فرض تکثیر چندہ کی کوشش ہے“ کس طرح بے نیاز بنا سکتی ہے۔ دراصل ایک آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب مرحوم کے طرز عمل سے دارالعلوم نے کیا ترقیات حاصل کیں اور ان حضرات کے نقش قدم پر چلنے سے کیا۔

التراف

شیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از

دارالعلوم دیوبند

۳۱ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ

مذکورہ بالا مضمون علامہ عثمانی کے سترہ صفحات میں سے انہی کی اصل عبارت کا اختصار ہے کیونکہ تمام مضمون کا یہاں پر نقل کرنا طوالت سے خالی نہ تھا۔ اس مضمون کو ہم نہایت ہی تاریخی مضمون سمجھتے ہیں جس میں نہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اعتراضات کا جواب ہے بلکہ ایک گونہ بزرگان و اکابر دیوبند کے اجمالی حالات بھی اس میں آگئے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے باعث ہم نے اپنے مضمون کی سرخی ”وکیل دیوبند“ رکھی ہے۔ دراصل علامہ عثمانی نے اس جیسے نازک مواقع پر ہمیشہ دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کی حمایت پر قلم اٹھا کر وکالت کے فرائض انجام دئے ہیں۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب والمخترم مولانا محمد طیب صاحب موجودہ مہتمم دارالعلوم کی جس قدر حمایت علامہ عثمانی نے کی ہے اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے زبردست مضمون کا جواب جو انہوں نے ہمدردی اخبار

جاری کردہ مولانا محمد علی جوہر کے جواب میں شائع کرایا تھا، اگر کوئی دے سکتا تھا تو وہ علمائے دیوبند میں صرف حضرت عثمانی کی ہستی ہو سکتی تھی۔

محکم دلائل | مولانا آزاد نے جو اعتراضات دارالعلوم جیسے مرکز کے مہتمم صاحب پر کئے ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے نقطہ نگاہ سے ٹھیک ہوں لیکن

علامہ عثمانی نے ایک جملہ لکھ کر ساری پوزیشن کو صاف کر دیا ہے اور وہ جملہ یہ ہے کہ ”مولانا محمد احمد صاحب صرف عالم ہی نہیں بلکہ وہ مہتمم بھی ہیں“ اس لئے جو آرائی دیگر حضرات کو ہو سکتی ہے وہ مہتمم جیسے ذمہ دار کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہر مہتمم کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تدبیر سے کسی ادارے کو خطرات سے بچا کر لے جائے وہی اس دور میں جناب مہتمم صاحب نے کیا۔ دوسری جانب جنگ عظیم کے باعث ترک زبردست بحران سے دوچار تھے اس لئے مجاہدین اسلام کی جماعت دشمنان دین کے وجود کو مقدس اداروں میں آنے اور ان کے لئے عقیدہ بندی سے انتظامات فراہم کرنے کو گوارا نہیں کر سکتے یہی پارٹ جو مہتمم صاحب نے ادا کیا خلافت کے عدم تعاون اور انگریزی حکومت سے بائیکاٹ کے دور میں ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے کیا اور میرے نزدیک درست کیا۔

رہا انگریزوں کا دارالعلوم میں بلایا جانا یہ بھی علمائے دیوبند کی ہمیشہ سیاست فاضلہ رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد تقی صاحب کے زمانے میں اس عہد کے انٹینڈ گورنر کے سیکریٹری آئے تھے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے زمانے میں آرڈن صاحب کلکٹر سہارنپور زندہ عو کئے گئے تھے۔ اور مولانا رشید احمد صاحب کی سرپرستی کے دور میں سرحسین لاٹس گورنر یوپی آئے تھے اس لئے یہ امور قابل اعتراض نہیں۔ میرے نزدیک ان کا دیوبند میں آنا اور ذمہ داران دارالعلوم کا شاندار انتظامات کرنا مدرسے کی خاطر ایک سیاسی آنکھ چولی تھی۔

بہر حال راقم الحروف نے اتنی طویل تحریر نقل کر کے اپنے موضوع کتاب یعنی عسلاّم
شبیر احمد عثمانی کی گذشتہ سرگزشت پر روشنی ڈالی ہے کہ وہ ہمیشہ دیوبند کے بہترین و کیل
رہے ہیں۔ ہم آخر میں تغض طبع اور تفریح قلبی کے لئے اس موقع پر سید اکبر حسین الہ آبادی
کی وہ غزل مسلسل تحریر کرتے ہیں جو انہوں نے جناب مہتمم صاحب کو ملیں صاحب گورنر
کے جوابی لیکچر کے مضمون سے متاثر ہو کر لکھ کر بھیجی تھی۔ اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں سہ

ہزار حضرت سٹن نے سچ مہربانی کی ۶ ہماری ہی زبان میں اپنے گہر فشان کی
ثنائے عالمانہ دیوبند اس طرح فرمائی ۶ ہوتی روح اس کشادہ دل کے نیک بانی کی
یہ فرمایا کہ خالص مہربانی علم ہوتی ہے ۶ نہیں ہر فکر کچھ بول لیکل ریشہ دوانی کی
طریقہ نسب ہی پر ایسے ارالہ علم عالی کی ۶ ہوا تک لگ نہیں سکتی ہوا اس کو بیگانی کی
حیات چند روزہ ہی کی فکر آخرت ہے سب کے ۶ بہت کم فکر کھتے ہیں حیات جاودانی کی
فقط لذات جسمانی کا شیرازہ مانہ ہے ۶ خبر ان کو نہیں ہر طرح کے راز نہانی کی
ضروری ہر کپیدایوں پہاڑی علم ایسے ہی ۶ کہ جو کچھ دشمن پھیلائے عقیقے کے عالی کی
دلی راحت مسلمانوں اس ارشاد پاک کی ۶ دوا ان کو میرا آئی دینی ناتوانی کی
بہتر اند کے ادائے مشکوٰۃ کی سچ شامل ۶ زبان میں دے رہی ہیں ادائیگی حق بیانی کی
یہ گوشگل ہر حاکم کو کہ درویش بن جائے ۶ بہت خوشوار ہو چیدہ ہے منزل حکمرانی کی
مگر ہے صاف ظاہر حامی مذہب ہیں ہزار آنر

حقیقت منکشف ان پر بھی ہے دنیا کے فانی کی

(القائم جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ ص ۱۶)

لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم کو دارالعلوم دیوبند سے بہت محبت تھی لیکن
اس کے برعکس سر سید مرحوم سے تو کاچوک رہتی تھی۔ دیوبند کے مدرسہ عالیہ کے متعلق
انہوں نے ہی یہ لکھا تھا سہ

ہے دل روشن مثال دیوبند ؛ اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
اب علیگڑھ کی بھی اک تشبیہ لو ؛ اک مقدس پیٹ بس اس کو کہو
یہ تو پرانی باتیں ہیں لیکن کچھ بھی ہوتیوں اداروں نے مسلمانوں کے دین
زبان اور پیٹ کی بڑی خدمت کی ۔

دارالعلوم گئی مالی اعانت | گذشتہ اوراق میں ہم نے ابھی واضح کیا تھا
اور علامہ عثمانی، سفر ڈھاکہ | کہ مولانا عثمانی نے نہ صرف ایک شیخ المدین
جمادی الاخریٰ ۱۳۳۲ھ | کی حیثیت میں دارالعلوم کی خدمات انجام

دیں بلکہ وہ دارالعلوم کے تعمیری اور عمارتی امور کی ترقی اور سیودی کے لئے بھی
دارالعلوم دیوبند سے باہر نکلے ہیں ۔ چنانچہ دارالحدیث اور دارالافتاء جڑ (بونگ)
ہاؤس کے متعلق آپ نے ابھی پڑھا ہے ۔ اب ہم آپ کے سامنے ڈھاکہ (بنگال)
کے سفر کا حال بیان کرتے ہیں جس میں دارالعلوم کے موقر وفد کے ساتھ آپ بھی ایک
ممتاز رکن کی حیثیت سے شریک ہیں ۔ اس سفر کی پوری کیفیت رسالہ القاسم ماہ جمادی
الآخریٰ ۱۳۳۲ھ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے جس کا مقصد دارالحدیث کی تعمیر اور
دارالعلوم کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیش نظر حیدرے کی فراوانی مقصود تھی ۔ دارالعلوم
دیوبند کی تاریخ میں اس مرکز علم کے لئے اس جیسا وفد اپنی نظیر آپ ہے ۔

دراصل نواب سرخواجہ سلیم اللہ خاں صاحب نے دارالعلوم کے ساتھ عقیدہ ترمذی
کے ماتحت ہتھ صاحبان کو بنگال کے سفر کی طرف توجہ دلائی کہ ڈھاکہ اور کلکتہ کی طرف
وہاں کے علما کا کوئی خاص وفد آئے اور یہاں کے مسلمانوں کو دارالعلوم کی امداد کے
لئے متوجہ کرے ۔ چنانچہ نواب صاحب نے اس مقصد کے لئے اپنا خاص مہتمم لایا
جناب مولانا محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمن صاحب ہتھمان دارالعلوم کے
پاس بھیجا اور یہ بھی کہلا کر ہتھ صاحب کی محبت میں چند خوش بیان علما کا ہونا بھی

یہ وفد اپنی تاریخ کا کتنا عظیم الشان وفد تھا جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی بھی موجود ہیں۔
 بہر حال القاسم کی اطلاع کے مطابق ۴ اپریل ۱۹۱۴ء کو چھ بجے ایکسپریس میں یہ وفد
 کلکتہ روانہ ہوا۔ ۵ اپریل کا ظہرانہ مولوی عبدالباقی صاحب نے الہ آباد کے سٹیشن کے
 وسیع مکان میں تمام وفد کو دیا۔ گاڑی کے پہنچنے پر کھانے پینے ہوئے موجود تھے۔ سب نے
 کھانے سے فراغت حاصل کی اور سوار ہو گئے۔ ۶ اپریل کی صبح کو وفد کلکتہ پہنچ گیا۔
 سٹیشن پر نواب صاحب اور مسلمانان کلکتہ کی طرف سے شاندار استقبال ہوا۔ ہر قسم کے
 طبقے کے لوگوں سے سٹیشن کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ طلبہ کے پاس استقبال انیٹیں تھیں۔ وفد
 نواب سلیم اللہ خاں صاحب کی کوٹھی چورنگھی پڑھرا۔ چھ روز قیام رہا جس میں لانا تھانوی
 مولانا تفتی حسن صاحب اور مولانا محمد احمد صاحب کی تقریریں ہوئیں، ممبران وفد کی
 تحریک پر نوسو روپیہ کی رقم اسی وقت فراہم ہو گئی۔

۱۱ اپریل کو وفد ڈھاکہ روانہ ہوا اور ۱۲ اپریل کو ڈھاکہ پہنچا، نواب صاحب
 مع اعزاء و خاندان و اراکین ریاست نے اسٹیشن پر استقبال کیا۔ مہتمم صاحب لکھتے ہیں:-
 ”ڈھاکہ میں اس وقت تعلیم و تہذیب، لیگ اور علماء کا نفوس کے متعلق
 جلے تھے۔ تین روز تک لیگ کے جلے ہوئے، اس لئے کوئی سنا من وذر دانی نہیں تھی۔
 بعد ازاں پندرہ اپریل کی شام کو جلسہ ہوا۔ دارالعلوم کے وفد کی طرف سے ایک تحریر تیار
 کی گئی تھی کہ اس کو سنایا جائے۔ مہتمم صاحب لکھتے ہیں:-

”نواب صاحب نے پہلے اپنی تحریر سنائی اور اس کے بعد مولانا شبیر احمد
 صاحب نے دارالعلوم کی تحریر سنائی۔ اور سنانے کے بعد اس کو آپ کی خدمت
 میں پیش کر دیا گیا۔ آپ نے کھڑے ہو کر نہایت لبلاشت و مسرت کے ساتھ
 اس کو لیا اور سر پر رکھا۔ چاروں طرف سے مسلمانوں نے آپ کو مبارک باد دی
 اسی وقت مولوی سید عاشق حسین صاحب انجمن نے دارالحدیث کے نقشہ دکھائی

..... اس کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے کھڑے ہو کر عربی میں بڑبڑتہ تقریر شکریری کی فرمائی۔ اور ازاں بعد مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے نہایت فصیح و بلیغ زبان عربی زبان میں تقریر فرمائی۔ جس میں اعجاز قرآن کو نہایت خوبی و وضاحت سے ثابت کیا تھا۔ ان تقریروں کا سامعین خصوصاً علماء پر نہایت گہرا اثر ہوا آئیں بل سطرغز نوی بھی اس مجلس میں موجود تھے چونکہ آپ اسی سال سفر حجاز سے واپس آئے ہیں آپ کو ان تقریروں میں خاص لطف آیا۔ جس کا اظہار آپ نے اس مجلس میں فرمایا۔

دھاکے میں نواب سلیم اللہ کے یہاں | اس کے بعد مولوی شبیر احمد صاحب
علامہ شبیر احمد عثمانی کی تقریر | کھڑے ہوئے۔ اول تو آپ نے

دارالعلوم کے حالات ذکر فرمائے اور پھر آیت شریفہ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ کا بیان شروع کیا۔ مولوی صاحب موصوف کو آیت مذکورہ کے ضمن میں عجیب و غریب نکات و لطائف قرآنی، تعلیم کتاب و حکمت کا فرق بیان کرنا تھا تقریباً ایک گھنٹہ تمہیدی مضمون بیان کیا تھا کہ دوران سرادر اختلاف قلب کا دورہ ہو گیا جو اس سے پہلے ایک دو موقع پر ہو چکا تھا۔ مجبوراً اپنے بیان کو درمیان ہی میں چھوڑ کر بیٹھ گئے جس کا بے حد افسوس اہل مجلس کو ہوا۔ جناب نواب صاحب نے بھی اظہار تأسف فرمایا۔

نواب صاحب نے اس مجلس میں مبلغ پانچ ہزار دو سو اسی روپیہ اور ایک ملائی ارڈنزی تقریباً بیس تولہ کا عطا فرمائے۔ اور دس ہزار کا وعدہ

اپنے اور اپنے خاندان کی طرف سے اس کے علاوہ فرمایا۔ اور تعمیر دارالحديث کے لئے ایک کمیٹی مقرر فرمادی جس کے سکریٹری خود نواب صاحب ہیں۔ یہ کمیٹی دارالحديث کے لئے جس قدر رقم مطلوب ہے اس کا تخمینہ اسی ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے ہم پہنچائے گی۔“

(القاسم جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ ص ۴۵-۶)

۱۶ اپریل کو یہ وفد ڈھاکے سے کلکتہ اور وہاں سے نہایت کامیابی کے ساتھ دیوبند واپس ہوا۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل بھی قابل ذکر ہیں لیکن تحریر کو مختصر کرنے اور سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اجمال سے کام لینے میں واقعات کی پوری پوزیشن آنکھوں کے سامنے نہیں آتی اس لئے پوری بات کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس وفد میں علامہ شبیر احمد، حضرت مولانا تھانوی رحمہما اللہ خصوصی طور پر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا عبید اللہ صاحب اور حضرت شیخ الہند کا ان واقعات میں کالے کوسوں دور تک کچھ تہ نہیں ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جس میں اختلاف رونما ہو چکا ہے اور دلوں میں کدورت پیدا ہو چکی ہے۔

میں ایک دارالعلوم کا دائرۃ المعارف مرتب ہونے کی ضرورت ہے جس میں ان فہمی
یونیورسٹی کی پوری تاریخ لکھی جائے۔

علامہ عثمانی کی کلکتہ میں | جب علماء کا یہ وفد ڈھاکے سے کلکتہ واپس
نصاب تعلیم پر تقریریں | ہوا تو آرمیل مولانا شمس الہدیٰ نے دو وقت

دفد کو ہمان رکھا۔ اور چونکہ آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے زبردست ورکر تھے اس
لئے آپ نے وفد سے خیال ظاہر کیا کہ آج کل مدرسہ عالیہ کلکتہ کا نصاب جدید ترتیب
دیا گیا ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ اس کے لئے ۱۸ اپریل کو ایک جلسہ منعقد کروں
چنانچہ مولانا شمس الہدیٰ کی کوٹھی پر جلسہ ہوا جس میں پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ،
اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعلیم بنگال، مدرسین مدرسہ عالیہ، علمائے کلکتہ شریک ہوئے۔
مولانا حبیب الرحمن صاحب اس جلسے کے متعلق لکھتے ہیں :-

”ہتم (مولانا محمد احمد) صاحب کی محبت میں مولانا عزیز الرحمن
صاحب مفتی مدرسہ عالیہ دیوبند، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولوی
شبیر احمد صاحب اور مولوی فضل حق صاحب تھے۔ جلسے میں اولاً جناب
مؤمن (مولوی شمس الہدیٰ) نے اپنی جانب سے اور نیز گورنمنٹ بنگال
کی جانب سے ہتم صاحب اور علمائے دیوبند کا شکریہ ادا فرمایا۔ ہتم
صاحب کی جانب سے مولانا شبیر احمد صاحب مدرس دارالعلوم نے
مبسوط تقریر فرمائی اور نصاب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرمایا جس
کو سن کر نواب صاحب، صدر مدرس صاحب و پرنسپل صاحب نے پسند فرمایا۔“
(القاسم رجب ۱۳۳۶ھ صفحہ ۸)

دیکھئے اس نصاب تعلیم کی کمیٹی میں بھی دارالعلوم کی طرف سے علامہ شبیر احمد
نے جو نمائندگی کی ہے وہ علمائے دیوبند کے لئے باعث فخر ہے۔ اب تک برابر اور

مسلل دارالعلوم کی تاریخ میں عثمانی موصوف کی انتھک محنتیں، تقریریں، مناظرے، تبلیغی جلسے، دارالعلوم کے امدادی سفر اور پھر درس و تدریس، مضمون اور مقالہ نگاری سب ہی کچھ ہیں جن سے موصوف کی جانفشانی، محنت طلبی اور مستقل مزاجی کا پورا پورا ثبوت مل رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ نہ صرف دارالعلوم کی ہر معاملے میں وکالت کر رہے ہیں بلکہ حافظ مولانا محمد احمد صاحب کی بھی ہوا باندھ رہے ہیں۔

ہم نے اب تک قارئین کے سامنے علامہ کے وہی حالات
دفاع اسلام پیش کئے ہیں جو تحریری طور پر پورے یقین کے ساتھ ہمارے

سامنے دستاویزات کے طور پر موجود ہیں۔ انہی یقینات کے سلسلے میں وہ چشم دید واقعات بھی شامل ہیں جو عوام و خواص مسلمانوں کی اصلاح عقائد و اعمال اور باطل فرقوں سے بچانے اور ان کے جراثیم پھیلنے کو روکنے کی کوششوں سے متعلق ہیں۔ گذشتہ اوراق میں آپ نے کراچی کے اس سفر کا حال پڑھ ہے جو علامہ نے آریوں سے مناظرہ کے لئے اور اسلام کی حقانیت اور صداقت واضح کرنے کے لئے کیا تھا۔ آئیے آپ کے ایک اور طوفانی تبلیغی اور دفاعی دورے کا چشم دید منظر پیش کریں جو استاذ محترم مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ نے حیات انور کے ایک مقالے میں جس میں انہوں نے اپنے فیروز پور جانے اور قادیانیوں سے مناظرہ کرنے کے سلسلے میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:-

” اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا۔ ابھی شروع ہوا ہی تھا

کہ عین مجلس مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما مع چند دیگر علماء کے تشریف لائے ہیں۔ مناظرے کے بعد شہر میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں حضرت

شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دحل کے شکار ہو گئے تھے۔ اس مناظرے اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے۔ (حیات انور صفحہ ۲۶)

اس کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ فیروز پور کے مناظرے اور تقریروں کے بعد حضرت شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور قادیانیوں کے فریب و مکر کے جال کے تاروں کو بکھیر دیا۔ اس طرح بے شمار بندگان خدا کو اسلام کا صحیح راستہ نظر آیا۔

میدان تحریر میں

حضرت عثمانی کی تقریروں اور فصیح و بلیغ لیکچروں کا تحریری دستاویزوں کے ذریعے ایک تفصیلی جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ دراصل اہل علم کا فیضان دوسروں تک پہنچنے کے لئے یا تقریری طور پر ہوتا ہے جیسا کہ آپ کا فیض اہل ہند پر اس ذریعے سے بہت کچھ ہوا۔ یا تحریری طور پر جس کا تفصیلی طور پر ذکر ہم علامہ کی ”خالص علمی سوانح“ تجلیات میں پیش کر چکے ہیں۔ تاہم بعض بعض تصنیفی و تقریری واقعات کا ذکر ترتیب سوانح کے اعتبار سے ”حیات عثمانی“ میں مکرر بیان کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ آپ کی تصنیفات و مقالات حسب ذیل ہیں:-

الاسلام، العقل والنقل، اعجاز القرآن،	تصنیفات اور رسالے
الشہاب، تفسیر عثمانی، فتح الملہم شرح	

مسلم سہ جلد، تقریر بخاری۔

معارف القرآن ، لطائف الحديث ، الدار الآخرہ
منضامین اور مقالے | بدیع السنہ ، قرآن مجید میں تکرار کیوں ہے تحقیق
 خطبہ جمعہ تشریح و اقعہ دیوبند (جوابی انداز میں) حجاب شرعی ، سجدۂ اشمس ،
 خوارق عادات ، الروح فی القرآن ، سینا مینی ۔

تقریظیں اور خطبے | جہاں تک تقریظوں اور خطبوں کا تعلق ہے ان میں ائمہ اربعہ
 کی تحقیقات میں جو خطبے آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

خطبہ ترک شوالات ، خطبہ جمعیتہ علمائے مملکت (ریاسیہ) خطبہ مسلم لیگ کانفرنس
 میرٹھ خطبہ جمعیتہ العلماء لاہور ، خطبہ صدارت ڈھاکہ ، بیان خطبہ تبرک اسلامی
 کراچی (زبان عربی)

لیکن تقریظیں مختلف کتابوں پر میری نظر سے گذریں ۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمن
 صاحب سابق ہتھم دارالعلوم دیوبند کے قصیدہ لامیۃ المعجزات پر ، مولانا محمد
 عماد الدین صاحب شیرکوٹی کے رسائل گلدستہ تعلیم الاسلام پر ، مولانا محمد ادریس صاحب
 کاندھلوی کے مقامات تحریری کے حواشی پر ، نیز بعض تصانیف پر جن پر تبصرہ القام
 کے بعض پرچوں میں موجود ہے ۔

حائزہ | آپ کے تحریری ورک (کام) کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت
 یہ ہے کہ تحریری کام میں بھی آپ کی خدمات بہت کچھ ہیں جو زمانے کی وقتی ضروریات
 کے تقاضوں کے باعث معرض وجود میں آئیں ۔ لہذا علامہ کی حسب ذیل تصنیفات
 نظر سے ڈالئے :-

تصنیفات :

۱۔ الاسلام :- ۱۳۲۸ھ مطابق اپریل ۱۹۱۱ء میں لکھا گیا جس کو آپ
 نے مراد آباد کے ”مؤتمر الانصار“ میں پڑھ کر سنایا ۔

۲۔ العقل والنقل۔ یہ بھی زمانے کے ماحول نے آپ سے لکھایا تھا یہیہیہ
الاخلاق علیکدھ کے پرچے ملک میں جس قسم کے عقلی اور فلسفی مضامین کے ذریعہ
اسلام کے صاف اور سچے معجزات وغیرہ کے خلاف جراثیم پھیلا رہے تھے علامہ نے ”العقل
والنقل“ لکھ کر اثباتی رنگ میں یہ ثابت کیا ہے کہ عقل صحیح اور نقل صحیح میں کبھی مخالفت
نہیں ہو سکتی۔

یہ سلسلہ مضمون القاسم میں کچھ مسلسل نمبروں میں چھپا ہے جس کی تفصیل ”تجلیات
عثمانی“ میں تاریخی طور پر ہم لکھ چکے ہیں۔ تاہم یہ سلسلہ القاسم کے اجلا ۱۳۲۸ھ مطابق
۱۹۱۱ء ہی سے شروع ہوا ہے۔ العقل والنقل کا مقالہ القاسم کے دس نمبروں میں
شائع ہوا اور اس کی آخری قسط ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوئی جبکہ الانصار کا
آخری جلسہ شملہ میں ہوا تھا۔

اس مضمون سے علامہ کی اہل علم میں دھوم مچ گئی۔ دارالعلوم کے دفتر میں بہت
سے خطوط ان مضامین کی تحسین میں آئے۔

۳۔ اعجاز القرآن :- یہ مقالہ دراصل دارالعلوم میں ان تقریروں کی تحریری شکل
ہے جو موصوف نے طلباء کے سامنے کی تھیں۔ آپ طلباء کو مناظرے اور تقریروں کے لئے
تیار کرنے کے لئے ایسے عنوانات پر تقریریں فرمایا کرتے تھے جو اسلام کے اہم اور نازک
مسائل سمجھے جاتے ہیں۔ ان ہی مسائل میں یہ بھی مسئلہ نہایت اہم ہے کہ قرآن کریم خدا کا
کلام کیونکر ہے۔ موصوف نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم خدا کا ہی کلام ہے۔

۴۔ الشہاب :- نعمت اللہ قادیاںی کو جب ۳۱ اگست ۱۹۲۶ء کو کابل میں شاہ
امان اللہ کے حکم سے سگسار کیا گیا تو قادیاںیوں کی طرف سے بہت شور مچا کہ اسلام میں
مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔ آپ نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل
ہے۔ یہ رسالہ چھپوا کر شاہ امان اللہ خاں کے پاس بھیجا گیا تھا جو ۱۸ صفر ۱۳۴۴ھ

مطابق ستمبر ۱۹۲۷ء کو لکھا گیا تھا۔

۵۔ تفسیر عثمانی :- علامہ کے مایہ ناز تفسیری فوائد میں جو شیخ الہند کے اردو ترجمہ قرآن پر لکھے گئے ہیں۔ اس تفسیر کی ہندوستان اور بیرون ہند میں جس قدر قدر ہوئی اس سے زیادہ اور نہ کسی تفسیر کی ہوئی اور نہ اور کسی کے فوائد کی۔ بہت سے ایڈیشن چھپے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ ۹ رزی الحجہ ۱۳۵۵ھ کو لکھ کر ختم ہوئے۔

۶۔ فتح الملہم :- صحیح مسلم کی شرح ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ نہایت محققانہ نہایت مبصرانہ، نہایت عالمانہ۔ دنیائے اسلام بالخصوص علماء کے لئے علم حدیث کا زبردست شاہکار ہے۔ مزید تفصیلات تجلیات عثمانی میں ملاحظہ فرمائیے۔

۷۔ شرح اردو بخاری شریف :- ایک اور بڑا کارنامہ آپ کا بخاری شریف پر درس کے سلسلے میں بخاری شریف کی وہ اردو کی شرح ہے جو اپنے مضامین کے اعتبار سے علوم حدیث کا سمندر ہے۔

خطبات اور دیگر مضامین کی تفصیلات بھی تجلیات میں موجود ہیں۔ اگر اس تحریری کام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی بڑی خدمت ہے جو قلمی طور پر آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی کی ہے۔ پھر قرآن کریم کے فوائد تفسیری نہ صرف ہندوستان ہی میں پڑھے جاتے ہیں بلکہ کابل، ایران میں بزبان فارسی ترجمہ ہو کر عوام و خواص کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ بعض اور زبانوں میں بھی آپ کے تفسیری فوائد کا ترجمہ ہو چکا ہے، اور مسلسل مقبولیت ہو رہی ہے۔

۸۔ لطائف الحدیث اور معارف القرآن کے نام سے جو مضامین القاسم میں چھپے انہوں نے بھی ملک سے خراج تحسین لیا۔ القاسم کی تحریروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی فرمائشیں اکثر و بیشتر علامہ عثمانی کے مضامین کے متعلق آ کر تھیں۔

لہٰذا یہ شرح کراچی سے ”فضل الباری“ کے نام سے حال ہی میں چھپی ہے۔ نچیت

راقم الحروف کے نزدیک القاسم میں اصلاحی مضامین کے اعتبار سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب اور تاریخی و اخلاقی اعتبار سے مولانا حبیب الرحمن صاحب اور فلسفی اور علمی اعتبار سے مولانا شبیر احمد صاحب کے مضامین نہایت ہی قابل قدر ہوتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب کا مضمون ”دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا“ اور ”تعلیمات اسلام“ کے مضامین لاجواب تھے۔

القاسم کی قلمی خدمات | علامہ نے جہاں اپنے قیمتی مضامین سے القاسم کو مالا مال کیا وہاں اس کی بعض دفاعی خدمات بھی انجام دیں۔ بعض اقتضائے شہرے بھی لکھے۔ لیکن باقاعدہ ذمہ داری کبھی نہیں لی۔ باقاعدہ ذمہ داری میں مولانا حبیب الرحمن صاحب بروم مستقل طور پر رسالے کے مدیر تھے۔ لیکن آپ کے معاونین میں پہلے معتمد مدیر مولانا سراج احمد صاحب، بعد ازاں میاں اصغر حسین صاحب اور پھر مولانا اعجاز علی صاحب رہے۔ بہر حال اگر القاسم کی خدمات کا تجزیہ کیا جائے تو مولانا عثمانی کا مقام بہت بلند ہے۔ ان حضرات کے بعد پھر مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی رسالے کی بہت خدمت انجام دی۔ بلکہ بعض مہینوں کے رسالے تو پورے کے پورے انہی کے مضامین سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ رسالہ تقریباً ۱۹۲۲ء میں دم توڑ چکا۔

دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے | میں نے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں جب القاسم کے پرچوں کی فائلوں کو دیکھا تو مجھے اس میں بہت سے کوہ نور اور دیارے نور

چمکتے ہوئے نظر آئے۔ لیکن سب گمنامی کے پردوں میں چھپے پڑے ہیں۔ القاسم الرشید کے پرچوں اور روزناموں سے دارالعلوم دیوبند کی پوری انسائیکلو پیڈیا یا سولجی ڈالاجوم تیار ہو سکتی ہے اور جیسا کہ میں نے اپنی اس تمنا کا بار بار اظہار کیا ہے۔ دارالعلوم کے

کتب خانے میں بیٹھ کر یہ کام بڑی خوش اسلوبی، سنجیدگی اور خموشی سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ”تاریخ تعمیر دارالعلوم“ اور اسی طرح دیگر شعبہ جات پر مشتمل یہ دائرۃ المعارف دارالعلوم کا نہایت شاندار کارنامہ ہو سکتا ہے جس کا اس ناچیز نے ارادہ کیا ہے لیکن اختلاف داریں نے پاکستان سے تجارت جانے کی سہولتوں میں بہت رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں جس سے یہ فحیم کام دشوار نظر آ رہا ہے۔

الحاصل اب تک کی میری ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ علامہ عثمانی نے دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس پر بیٹھ کر اپنی عالمانہ شان کو چمکایا دوسری طرف الانصار کے جلسوں میں اپنے عالمانہ مقالوں اور تقریروں سے ہندوستان کے اہل علم و فضل لوگوں میں اپنا وقار اور مقام پیدا کیا۔ مزید برآں اپنے مضافین سے القاسم کو شرف بخش کر علماء و فضلا، عوام و خواص میں نام پیدا کیا اور نقبول مولانا حبیب الرحمن صاحب بہت سے مقامات پر اپنے مودعظ حسنہ سے لوگوں میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا۔

مدرسہ عربیہ فتحپوری دہلی دارالعلوم دیوبند میں سب سے پہلے مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد، ۱۳۲۶ھ میں درس دیا۔ بعد ازاں دو سال فتحپوری مدرسہ دہلی میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کیا ۱۳۲۸ھ میں یہ صاحب فضیلت عالم پھر دارالعلوم کے مرکز کی طرف لوٹا اور چھوٹی بڑی معقول اور منقول کی اکثر کتابیں پڑھائیں۔ اسی طرح ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء تک علامہ کا یہ دور گزر رہا۔

متخواہ اس مقام پر پہنچ کر وہ بات جو مجھے ابتداء میں بیان کرنی چاہئے تھی، میں یہاں بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ جب آپ ۱۳۲۸ھ میں دہلی سے دارالعلوم والپس تشریف لائے تو اس وقت آپ کا تقریباً پچیس روپیہ ماہوار پرورش

ششم کی جگہ ہوا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۳ء کی رونداد میں آپ کی تنخواہ پینتیس روپیہ لکھی ہوئی ہے۔ لیکن ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۶ء کی رونداد کے گوشوارہ کے ضمن میں مولانا شبیر احمد صاحب کی تنخواہ ساٹھ روپیہ لکھی ہے۔ ساتھ ہی رونداد میں ایک نوٹ بھی درج ہے کہ یکم محرم ۱۳۳۲ھ سے (مولانا شبیر احمد صاحب کی تنخواہ میں) پچیس روپیہ کا اضافہ ہوا۔ یعنی کل تنخواہ ساٹھ روپیہ ماہوار ہو گئی۔ ۱۳۳۲ھ کے سینئر سدرین کے گوشوارہ تنخواہ کی تفصیل حسب تحریر مہتمم صاحب یہ ہے :-

شاہ (مولانا نور شاہ) صاحب	۷۰ روپیہ
مولانا محمد احمد صاحب مہتمم	۸۵ روپیہ
مفتی عزیز الرحمن صاحب	۶۵ روپیہ
حکیم محمد حسن صاحب	۶۰ روپیہ
مولانا غلام رسول صاحب	۶۰ روپیہ
مولانا حبیب الرحمن صاحب	۶۰ روپیہ
مولانا شبیر احمد عثمانی یکم محرم ۱۳۳۲ھ سے	۶۰ روپیہ

اس زمانے میں دارالعلوم کے احاطے میں ساٹھ روپیہ تنخواہ بڑی محقول تنخواہ سمجھی جاتی تھی حالانکہ یہ حضرات وہ آفتاب و ماہتاب علم و فضل تھے کہ ان کو ہزار ہزار روپیہ ماہوار کی تنخواہوں پر دعوتیں آئیں لیکن یہ حضرات خدمات دینی کے مقابلے میں کثرتِ زہر کو نظر میں نہ لائے۔

بلا تنخواہ | بہر حال ۱۳۳۲ھ میں آپ کی تنخواہ ساٹھ روپیہ تو ہو گئی لیکن آپ پر (نوٹ) حضرت مولانا محمود حسن صاحب ان ایام میں مالٹا تشریف فرما ہیں۔ کیونکہ آپ شوال ۱۳۳۳ھ میں سفر حجاز پر تشریف لے گئے تھے۔

توکل کا غلبہ طاری ہوا اور احتیاط نے مجبور کر کے ۱۳۳۵ھ سے بلا تخواہ پڑھانے پر مجبور کر دیا۔ اور ۱۳۳۴ھ تک فی سبیل اللہ نو سال کے ایک لمبے پیرہ تک بغیر کسی معاوضے کے پڑھا کروہ مالی قربانی پیش کی جو اس سے پہلے اور کوئی پیش نہ کر سکا۔ اگر حساب لگایا جائے تو ساٹھ روپیہ ماہوار کے حساب سے نو سال کی تخواہ چھ ہزار چار سو اسی روپیہ ہوتے ہیں۔ علامہ عثمانی کی یہ قربانی کوئی معمولی قربانی نہیں۔ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے کہ موصوف نے جن مادر علمی سے مفت تربیت حاصل کی تھی اس مادر ہربان و مشفق کی خدمت کا اس نے کتنا بڑا حق ادا کیا ہے۔ آپ نے بلا تخواہ کام کرنے کا جب فیصلہ کیا تو اساتذہ اور احباب میں سے کسی نے آپ کی تائید نہیں کی البتہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رانپوری نے ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا اور آپ کے خیال کو سراہا جیسا کہ خود علامہ عثمانی نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا اور مولوی محمد شریف صاحب جالندھری نے جو علامہ کے جاں نثار خادم ہیں اس صورت حال کو مجھ سے بیان کیا ہے۔

یہ تو ۱۳۳۵ھ سے ۱۳۳۴ھ تک نو سال کا عرصہ تھا لیکن جب آپ صدر مہتمم کی حیثیت سے آئے تو ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء سے ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۲ء تک دارالعلوم کی بلا تخواہ نو سال تک مزید خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دور میں اگر آپ کی صدارت کی حیثیت سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہی تخواہ تجویز کی جائے تو نو سال کی تخواہ سولہ ہزار دو سو روپیہ ہوتی ہے۔

شرح مسلم کے مشاغل | ۱۳۳۵ھ سے بلا تخواہ پڑھانے کا سبب ایک یہ بھی تھا کہ آپ اسباق کو حسب مرضی لکھ کر کے مسلم کی شرح

فتح الملہم کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آخری سالوں میں آپ صرف علوم اسلامیہ و شریعہ کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو گئے تھے اور منطق و فلسفہ وغیرہ کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔ مولانا محمد طیب صاحب آپ کے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

”ابتداء میں معقولات کی کتابیں حمد اللہ وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہو گئے تھے اور صرف کتاب و سنت اور فنون دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے ؟“

(رسالہ دارالعلوم ماہ مئی ۱۹۵۶ء صفحہ ۷)

میرے خیال میں چونکہ علامہ مسلم کی شرح کی جانب ہمہ تن متوجہ تھے اس لئے ۱۳۲۵ھ اور ۱۳۲۹ھ کے درمیانی سالوں میں سے کسی ایک سال سے صرف شام کے دو گھنٹے میں مسلم شریف پڑھاتے تھے اور ۱۳۳۲ھ تک صرف یہی کتاب پڑھایا گئے۔ مکان وزمین دیکر حج بیت اللہ کیا | میں جب دارالعلوم دیوبند کی ایک روئداد دیکھ رہا تھا تو اس میں میری ۱۳۲۴ھ ، ۱۹۱۸ء ، روئداد دیکھ رہا تھا تو اس میں میری نظر سے آپ کے حج کا تاریخی نوٹ گذرا۔ اس میں لکھا تھا کہ مولانا عثمانی شعبان ۱۳۲۴ھ میں بیت اللہ تشریف لے گئے۔ لیکن علامہ کی بیگم صاحبہ نے بتلایا کہ موصوف ۱۳۲۸ھ میں زیارت حرین شریفین کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ ان دونوں بیانات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سوال ۱۳۲۸ھ میں تو آپ مدرسہ فتحپوری دہلی سے دیوبند بلائے گئے۔ لازم آتا ہے کہ کیا آپ اسی سال زیارت حرین شریفین کے لئے تشریف لے گئے مگر اس دور کی کسی تحریر سے آپ کا ۱۳۲۸ھ میں جانا ثابت نہیں ہوتا۔ یا ہو سکتا ہے کہ آپ ۱۳۲۸ھ میں تشریف لے گئے ہوں اور ۱۳۳۴ھ میں بھی۔

بہر حال دونوں بیانات میں جو بھی صحیح ہو۔ ہوا یہ کہ بقول آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کے چھوٹے بھائی بابو فضل حق کے آپ نے نو سو روپیہ میں اپنے حصے میں سہمی ہوئی آبائی زمین اور مکان دونوں جائیدادیں اپنے بڑے بھائی مولوی مطلوب الرحمن صاحب کو فروخت کر دیں۔ اور اس طرح بیت اللہ اور روضہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر کے دل کی پیاس بجھائی۔ زیارت حرمین کے لئے رہنے کو گھر تک نہ چھوڑنا عشق الہی اور محبت رسالت کی واضح دلیل نظر آتی ہے۔ لیکن جب آپ اس عبادت عظیمہ سے فارغ ہو کر دیوبند تشریف لائے تو اپنے چھوٹے بھائی بابو فضل حق صاحب کے گھر میں ہی قیام پذیر ہوئے اور انہی کے گھر میں سکونت اختیار کی تا آنکہ اپنا ذاتی مکان ۳۳ء میں ۱۵۔۲۰ ہزار کی لاگت سے گدیواڑے میں تعمیر کرایا اور اپنی بیعتی منیبہ خاتون کے نام کر دیا جس کی آپ نے پرورش فرمائی تھی۔

حج سے واپسی پر | حج سے واپسی پر آپ اپنی دارالعلوم کی ملازمت پر پھر قائم رہے اور برابر درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں کئی دفعہ

اپنے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مہتمم دارالعلوم سے مدرسہ کے امور میں اختلاف رائے کیا۔ جس کا اظہار آپ کے روٹھ کر گھر بیٹھنے کی صورت میں نمودار

مولانا محمد طیب صاحب اپنے مضمون میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

ظاہر و باطن کی یکسانیت اور اخلاق حمیدہ | اخلاقی طور پر مولانا شبیر احمد

صاحب میں ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں

یکسانیت تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے برخلاف اظہار پر قدرت

نہ رکھتے تھے۔ اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن میں خوش اور ناخوش ہیں تو علامت

اس کا اظہار ان کے چہرے پر شہرے سے ہو جاتا تھا۔ اور کہہ بھی دیتے تھے (واللہ

کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت

مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم سے جوان کے بڑے بھائی بھی تھے رئیس ہو جاتی تو اکثر دھکم کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں سناتے اور راضی کر کے لانے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ خفا ہو کر تمنا نہ بھون تشریف لے گئے تو یہ حقرواں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔

ایک دفعہ ناخوش ہو کر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے طے فرمایا کہ تو ہی جا کر لا سکتا ہے۔ میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے۔ اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آجاتی تھی تو اسی لمحے گرائی رفع ہو کر حقیقتاً اشاعت چہرے پر نمودار ہو جاتی۔ اور ایسے خوش اور منفرح ہو جاتے کہ گویا گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور یہ تکلف نہیں بلکہ بلا تفضیح و بناوٹ اس کی قلبی رفتار یہی ہو۔

بزرگوں کا ادب | حق تعالیٰ نے علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بار بار دیکھا کہ ان کے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجے سے کوئی بات کہی تو کبھی اُٹ نہیں کرتے تھے۔ اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی پکارتا رہا فرماتے تھے۔

اظہار جذبات | قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے تھے خواہ وہ اپنی ہی کمزوری ہو۔ ایک بار ناخوش ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسبِ معمول منانے کے لئے گیا۔ تو غصے کے لہجے میں فرمایا ”بھائی حبیب نے مجھے مردہ سمجھ

لیا ہے جو اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کرنی تو میں لو کہ اس قطع نظر کرنے پر
 میرے دل میں دو طرح کے جذبات پیدا ہوئے۔ ایک جذبہ فضا نیت سر
 اور ایک للہیت سے۔ فضا نیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے
 تو انہیں میں اپنی زندگی باور کراؤں اور اس کا یہ اور یہ طریقہ ہوتا جو انہیں
 میری زندگی سمجھو ادا تیا۔ دوسرا جذبہ للہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں
 دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف
 سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانا
 پڑے گی۔ میں نے کہا کہ حضرت ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے
 ترجیح دی ہے فرمایا للہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا الحمد للہ۔ مگر میں
 نے (پھر) کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت
 یقیناً پاک ہے مگر اس پر تو دھیان فرمائیے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی
 ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہو گا جبکہ کاموں کا
 دار و مدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے۔ اگر اسی طرح کل کو جماعت
 کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی
 نہ کبھی آپ کی طرف اس میں پیش آجاتی ہیں یہی فیصلے کر لیں کہ ہمیں کام چھوڑ
 دینا چاہئے تو فرمائیے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا۔ اور اسے کون سنبھالے
 گا۔ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے آپ کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا
 بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟
 میں اتنا سن کر اک دم چہرے پر بے تابشت آگئی۔ اور فرمایا "ہاں یہ
 تو نے صحیح کہا۔ بس اب میں نے دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا۔ اور کل
 سے دارالعلوم پہنچ کر کام کروں گا۔ چنانچہ علی الصبح حسب وعدہ

تشریف لے آئے ، اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا گوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی ۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانیت ، قلب کی صفائی اور حق پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے ۔

قلبی استغنا اور کیفیت ناز | بہر حال علم کے ساتھ حق تعالیٰ

نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا ۔ جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھادی تھی ۔ قلبی طور پر استغنا ، اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا ۔ کام کے سلسلے میں جب تک دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی متوجہ نہیں ہوتے تھے ۔ (رسالہ دارالعلوم ممبئی ۱۹۵۶ء ص ۶-۷-۸)

استاذ محترم کا بیان تحقیقی طور پر علامہ کے ان ہی ایام سے وابستہ ہے جو ۱۳۲۳ھ کے درمیان گزرے ہیں ۔ راقم الحروف کو جناب مولانا محمد طیب صاحب کے بیان سے علامہ کے مختلف قسم کے امور زندگی کا سراغ مل گیا جو حسب ذیل ہیں :-
۱۔ اول تو یہ کہ وہ ظاہر و باطن کے یکساں تھے ان کی زندگی منافقت سے قطعاً صاف تھی ۔ وہ سیاست غیر فاضلہ سے کوسوں دور تھے کہ سیاسی آنکھ مچولی بھی ہوتی رہے اور دوستانہ انداز میں ملتے بھی رہیں ۔

۲۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ اپنی شخصیت کو مقام خودی میں رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کسی مقام پر گرانے کے لئے قطعاً تیار نہ تھے ۔

۳۔ تیسری بات یہ واضح ہوئی کہ وہ مدرسہ کے معاملات میں منتظمین مدرسہ اور مولانا حبیب الرحمن صاحب ہتم مرحوم سے بھی جو ان کے بڑے بھائی ہوتے تھے اختلاف کر بیٹھتے تھے ۔ ان کو ان کے روٹھ کر بیٹھ جانے پر مولانا محمد طیب صاحب سے منویا جاتا تھا ۔ یہ منویا بتاتا ہے کہ مولانا عثمانی کے اختلاف راستے میں قوت ہوتی تھی ۔
۴۔ چوتھی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان کا معاملہ ان کی ذاتی قابلیت اور علمی

فصل کے باعث ناز کا ساتھ تھا۔ جب تک کسی کی طرف سے پوری خواہش اور طلب نہ ہوتی اپنے آپ کو ارزاں نہ بناتے اور اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ قدرت جبار کی طرف سے اسپیشل عالم بنا کر بھیجے گئے تھے کہ ان کو انہی خصوصی معاملات کے باعث حرکت میں لایا جاتا تھا جن کے لئے قدرت نے انہیں خصوصیت کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، مولانا مجید حسن بجنوری اور حضرت شیخ الہند نے ان سے کام لیا لیکن میرے خیال میں ان کو مدرسی سے ہٹا کر صرف تصنیف تالیف اور ملک میں خصوصی مجالس کے لئے خاص کر دینا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنی قوت علمی، قوت لسانی، قوت ادبی کے جواہر سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے علم و فضل کے بہترین ذخائر چھوڑ جاتے۔ اور اس کام کے لئے ان کے مزاج کے مطابق ان کو نسخہ کر لیا جانا چاہئے تھا۔

۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء سے ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۸ء تک

چشم دید حالات

ہم ان کی زندگی کے واقعات تحریر کرنے میں ۱۳۲۹ھ تک تانہوز جاسپنے میں اور اب تک ہم نے تحریری دستاویزات (DOCUMENTS) کے ذریعہ ان کے حالات زندگی کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب راقم الحروف ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک کے چشم دید حالات بیان کرے گا جو پہلے حالات کی طرح یقینی ہوں گے۔ کیونکہ شوال ۱۳۳۹ھ میں یہ راقم الحروف بھی دارالعلوم میں پڑھنے کے لئے داخل ہوا اور بہت قریب سے قریب تر ہو کر مجھے ان کے دیکھنے کا موقع ملا۔

علامہ کے دوست | میرے ہوطن بزرگ جناب مولانا عماد الدین
مولانا عماد الدین انصاری | صاحب انصاری شیر کوئی ان دنوں مطبع قاسمی

مملوکہ جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کے ناظم تھے۔ ہم وطنیت کی تقریب کے باعث میرے بڑے بھائی مبارک حسن صاحب نے مجھے انہی کے پاس قیام کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ میں مطبع قاسمی میں ٹھہرا۔ یوں تو اور بھی میرے ہم وطن مثلاً مولوی انیس احمد شیر کوئی، مولوی محمد شعیب صاحب، مولوی عنایت اللہ صاحبان وغیرہم وہاں ٹھہرتے تھے لیکن میرے لئے جناب انصاری صاحب کے پاس قیام کرنا ہی آسان یوں کا باعث تھا۔ بہر حال میں مطبع قاسمی میں مقیم ہوا۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی | جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ظاہر کیا ہے کہ مولانا
انصاری، علامہ عثمانی کے طالب علمی کے
اور مولانا عبدالمسیح صاحب | زمانے سے ہی دوست تھے اس لئے علامہ

اور آپ کے ساتھ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدرس دارالعلوم اور مولانا عبدالمسیح صاحب دیوبندی مدرس دارالعلوم یہ تینوں صاحب بعد نماز عصر روزانہ مطبع قاسمی تشریف لاتے اور پھر صبح مولانا انصاری چاروں دوست جو (اصحاب اربعہ) کے نام سے مشہور ہو گئے تھے سیر کے لئے باہر تشریف لے جاتے اور عموماً حضرت شیخ الہند کے مزار تک جاتے اور واپس آجاتے کبھی ایسا ہوتا کہ مغرب کی نماز مطبع قاسمی کے سامنے کی مسجد میں جو محل کی کہلاتی تھی پڑھتے اور بعد مغرب سب یہیں کھانا کھاتے اور کبھی مغرب کی نماز سے پہلے واپس ہو جاتے اور اپنے اپنے محلوں کی مسجدوں میں نماز پڑھتے۔ مغرب کے بعد پھر سب مولانا عثمانی کی بیٹھک پر ہوتے اور اپنے اپنے گھروں سے سب کھانا منگالیتے اور مل کر کھا لیتے۔ اکثر و بیشتر مغرب سے عشا کی اذان تک مجلس لگتی۔ طلبہ بھی ہوتے۔ اس زمانے میں مولانا بلیاوی، علامہ عثمانی ہی کی بیٹھک

میں رہتے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی بیٹھک تھی جس میں دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک میں مولانا بلیاوی رہتے اور دوسری میں عام نشست و برخاست تھی۔ یہ بیٹھک گدیوارے میں میں قاضی مسجد کے عقب سے گزرنے والی اور شیخ الہند کے مکان کی طرف جانے والی سڑک پر قریب ہی واقع تھی۔ مجھے یہاں اکثر بیٹھنے اور علامہ کی مجلسوں سے شرفیاب ہونے کا موقع ملا ہے۔

ان مجالس میں میرے عہد طالب میں اکثر و بیشتر مولانا بلیاوی، مولانا انصاری، مولانا عبدالسیح صاحب، مولوی معظم علی نجیب آبادی مبلغ دارالعلوم، مولوی سید محمد مبلغ دارالعلوم، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، گاہے گاہے مولانا محمد طاہر مرحوم، مولانا سراج احمد صاحب، کبھی کبھی مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولوی بشیر احمد صاحب جے، ماسٹر طفیل احمد صاحب، دارالعلوم کے طلبہ۔ اور یہ راقم الحروف ہوا کرتے تھے۔ علمی تذکرے ہوتے، ظرافت کی باتیں ہوتیں، بزرگان دین اور اکابرین دارالعلوم کے چرچے ہوتے۔

مطبوعہ قاسمی میں جب میں شروع شروع میں ٹھہرا تو میرے علامہ عثمانی کا سراپا | جانے کے پہلے ہی روز شام کو غالباً ۶ شوال ۱۳۳۹ھ کو

میں نے پہلی مرتبہ علامہ عثمانی کو دیکھا۔ وجہ گندم گوں چہرہ، خط بھرا ہوا سیاہ منترخ ریش مبارک، دہرا جسم بھرا ہوا، نہ زیادہ موٹا اور نہ پتلا، متوسط قد، رفتار دلہانہ مگر عالمانہ، ماتھ میں چھڑی، سر پر محوِ طری ہوئی ٹوپی، سر کے بال کترے ہوئے اور کبھی سر منڈا ہوا۔ سلامی دار ڈورے کا نیچا کرتا، مغلی پاجامہ، پاؤں میں کلکتہ کا سیاہ سلیپر اور سفر میں بعض اوقات دلی کا بنا ہوا ایک پھول کا جوتا کبھی اچکن یا شیروانی پہنے نہیں دیکھا کچھ ایام کے بعد خالص گاڑیہ کے کپڑے رو گئے جو آخری عمر تک رہے۔ غذا مختصر مگر لطیف، چائے کے شوقین، وسیع القلب،

طلبہ کے ہمدرد، نازک مزاج اور نازک طبع، عبادت میں خشوع و خضوع، رفتار میں میانہ روی، نگاہیں نیچی کر کے چلتے۔ دوستوں اور احباب کے ساتھ تواضع۔ جیسا کہ میں نے کہا یہ حضرات روزانہ شام کو مطبخ میں آتے اور چاروں مل کر سیر کو جاتے۔ لیکن گرمیوں میں دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد بھی علامہ عثمانی روزانہ آتے اور دوپہر کو مطبخ میں ہی مولانا عماد الدین صاحب کے ہوادار کمرے میں سوتے۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اس آرام کی خاطر آپ وہیں قیلولہ فرماتے۔

اتفاق ہے شوال کے بعد ہی برسات کا موسم آچکا تھا اس لئے اکثر مطبخ میں آم کھائے جاتے اور اس کے بعد برف پڑا ہوا دودھ فروش کیا جاتا۔ خوب یاد ہے کہ ایک دو دفعہ میں نے بھی اچھے آم خرید کر دعوت کی جس میں علامہ عثمانیؒ، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، مولانا عبد السمیع صاحبؒ اور مولانا انصاری شامل تھے۔ اسی طرح کئی دفعہ میری طرف سے مٹھائی کی دعوتیں ہوئیں۔ اگرچہ علامہ فرماتے کہ بھائی طالب علموں سے کھانا نہیں چاہئے لیکن مولانا عبد السمیع صاحب جو بجز اوقات خود دعوت اور مٹھائی کی فرمائش کر دیتے تھے فرماتے بھائی اولاً تو مالدار طالب علم ہے۔ علامہ فرماتے کہ مالدار بھی ہو تو پھر بھی استاد طلبہ سے کھانا مناسب نہیں۔ لیکن میرا معاملہ ان سب حضرات سے خصوصی ہو گیا تھا۔ سب مجھے بھائی انوار کہتے۔ مولانا عبد السمیع صاحب کو استاد کے لقب سے پکارا کرتے۔

عوض دکاندار کی فیرنی | اکثر شام کو مطبخ میں یا اپنی بیٹھک پر کھانے کے ساتھ گرمیوں میں عوض دکاندار کے یہاں کی فیرنی ہوتی۔

عوض دکاندار کی فیرنی دیوبند میں بہت مشہور تھی اور سچ تو یہ ہے کہ بہت ہی خوش ذائقہ اور مزیدار ہوتی تھی۔ ان حضرات کے ساتھ مطبخ میں کھانے میں میری بھی

شرکت ہوتی تھی۔ میں دارالعلوم کے مطبخ سے اس زمانے میں اپنے بیسوں سے درمیانہ درجے کا کھانا کھاتا تھا۔ مدرسہ کے مطبخ میں جس سے کئی سولہ کے مفت کھانا کھاتے تھے اور صاحب استطاعت اپنے پیسے دیکر کھاتے، تین قسم کے کھانے پکتے تھے درجہ اول جس میں بکری کا گوشت ہوتا تھا، اس کے تقریباً چھ روپیہ ہوتے تھے۔ درمیانہ درجے کا کھانا بھی بہت اچھا اور ریسا نہ سمجھا جاتا تھا اس کے ماہوار چار روپیہ ہوتے تھے اور تیسرے درجے کے کھانے میں صبح کو دال اور شام کو شوربا ہوتا تھا اور اس کے دو ڈھائی روپیہ ماہوار لے جاتے تھے۔ اللہ اللہ اس تیسرے درجے کا کھانا کھاکر شاہ محمد انور شاہ صاحب جیسے عالم پیدا ہوئے۔ کئی دفعہ لڑکے آپس میں پوچھتے ”ہلے میوز الوضو عربی المصنوع“ کیا مطبخ کے شوربے سے وضو کرنا جائز ہے۔ کیونکہ یہ شوربا اتنا پتلا ہوتا تھا کہ طلبہ کھاتے اور شوربے کی بے لطفی سے لطف لیتے۔ تیسرے درجے کی دال میں آدھا پانی ہوتا اور آدھے دال کے دلنے۔ لیکن اسی کھانے سے تربیت پانے والوں میں مولانا عبید اللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عبدالحق مفسر تفسیر حقانی، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جیسے شہیر و نامور نکلے۔

ہاں تو علامہ عثمانی روزانہ مطبخ میں تشریف لاتے تھے۔ تاآنکہ اسی سال کے جاڑے آگئے۔ چائے کا دوریوں تو گرمیوں میں بھی چلتا لیکن جاڑوں میں خصوصیت کے ساتھ بزم چائے منعقد ہوتی۔ چائے پکانے کے فرائض میرے سپرد تھے۔ جاڑوں میں اکثر سبز چائے بنتی تھی۔ مجھے پکاتے پکاتے اس کے پکانے کا سلیقہ آگیا تھا۔ علامہ اور آپ کے رفقاء پیٹے اور چائے کے پکے کی تعریف کرتے اور فرماتے ”جہانی انوار تو خوب چائے پکاتے ہیں“ بہر حال چائے پکانے کی میری ڈیوٹی تھی اور چائے بنا کر دینا بھی میرے فرائض میں سے تھا۔ اسی طرح دو سال تک ان حضرات کی

آمد و رفت رہی اور یوں علامہ سے مجھے قریب ترین رہنے اور ان کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دو سال کے بعد مولانا عماد الدین صاحب انصاری مطبع قاسمی سے مستعفی ہو کر جان ندر کے اسلامیہ ہائی سکول میں ناظم دینیات بن کر چلے گئے اور میں دارالعلوم کے بورڈنگ ہاؤس میں مولسری کے احاطے میں مولانا تفسی احسن صاحب کی درسگاہ کے برابر والے حجرے میں جو جنوب مغرب کے گوشے میں تھا رہنے لگا اور اس طرح وہ روزانہ کی مجلسیں ختم ہونگئیں۔ لیکن اب میں علامہ کی نشستگاہ پر روزانہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں میں ۱۳۴۶ھ تک تقریباً ۱۹۲۸ء تک برابر جاتا

رہا۔ میری آمد و رفت جن حضرات کے یہاں زیادہ ہوتی ان میں سے ایک تو علامہ مرحوم تھے دوسرے حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب کے یہاں ہر ہفتے جایا کرتا تھا۔ مجھے ان سے بھی بہت انس تھا۔ وہ بھی مجھے ”بھائی انوار“ کہہ کر پکارتے۔ جب جاتا کچھ نہ کچھ ضرور کھلاتے۔ ان کی مجلس ایک صاحب دل درویش کی مجلس تھی۔ مسکراتے جاتے اور ظرافت آمیز جملوں میں چٹکی چھوڑتے جاتے۔ اکثر حسین اللہ ونعم الوکیل پڑھتے اور ہائے ہاتے بہت کرتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خشیت الہی اور خوف عاقبت میں ڈوبے ہوئے ہیں اس لئے ”تاوہ“ اور ہائے ہاتے، زبان پر بہت تھی۔ لوگوں نے تو غور نہیں کیا اردو کے بہت اچھے ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ میاں صاحب کے یہاں بھی طلبہ اور دیگر عقیدتمندوں کا شام کے وقت ہجوم ہوتا تھا۔

مولانا سید تفسی احسن صاحب چاندپوری | مولانا سید تفسی احسن صاحب کے گھر بھی چلا جاتا۔ ان کو میں دادا کہا کرتا تھا۔ فرمانے لگے اس سسرے نے مجھے دادا بنا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور میں

اے پوتا ہی سمجھنے لگا ہوں۔ سسرے کا لفظ نکمہ کلام تھا۔ کئی دفعہ سفر سے تھکے ہوئے آئے اور میں نیزان کے صاحبزادوں میں سے مولوی محمد انور یا محمد احسن یا مولوی خلیل احمد مراد آبادی میرے کلاس فیلو پاؤں دباتے بیٹھ جاتے۔ کبھی مناظروں کی اور کبھی اپنے سفروں کی باتیں سناتے۔ حد سے زیادہ ظریف الطبع تھے۔ طبابت میں بھی بہت ملکہ تھا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی اکثر اپنا علاج ان ہی سے کراتے اور فرماتے علاج سے زیادہ ان کی خوش طبع باتوں اور ظرافتوں سے میری بیماری آدھی ہو جاتی ہے اس لئے میں انہی سے علاج کراتا ہوں۔

ایک دفعہ مجھے سفر میں، غالباً ۱۹۲۶ء میں، علیگڑھ اپنے ہمراہ لے گئے۔ مدرسہ کا کوئی کام تھا۔ علیگڑھ کے سٹیشن سے اتر کر سیوے حبیب گنج مولانا حبیب الرحمن صاحب شیر دہنی کی کوٹھی پر تشریف لے گئے وہ اتفاق سے نہ ملے اس لئے پھر علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے ناظم مولانا عبد اللہ صاحب فاضل دیوبند کے یہاں ٹھہرے۔ اسی سفر میں مجھے مسلم یونیورسٹی اور اس کے متعلقات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب سفر میں بھی جماعت سے نماز پڑھنے کے بہت عادی تھے۔ مجھے سفر میں اپنا مقتدی بنا لیتے اور جماعت کر لیتے۔ دلائل الخیرات اور تلاوت کلام پاک کے بھی سخت پابند تھے۔ بہر حال مولانا کے یہاں بھی میرا آنا جانا تھا اور ان سے بہت بے تکلفی تھی۔ پہلے لکھ آیا ہوں کہ مناظرے کی جو کتاب چھوڑتے میں اٹھا کر چلا آتا تھا۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ چلا تے رہ جاتے لیکن میں تھا کہ یہ جاوہ جا۔ مولانا میرے استاد تھے اور میں نے دورے میں ان سے تسائی کے دو تین سبق پڑھے تھے۔

ان کے علاوہ جب مولانا بلیاوی علامہ عثمانی کی بیٹھک کی بجائے قاضی مسجد کے سامنے کے مکان میں اپنی فیملی کے ساتھ رہنے لگے تو وہاں بھی آنا جانا رہا۔

میں جب یہ بند گیا تھا تو اس وقت کم عمر تھا نحو میر اور کبریٰ سے تعلیم شروع کی تھی۔
 امتحان شرح مائتہ عامل اور علم الصیغہ میں دیا تھا جو مولانا عبدالقیوم صاحب
 شیرکوٹی سے پڑھتا ہوا آیا تھا۔ مولانا اعزاز علی صاحب نے داخلے کا امتحان لیا
 تھا اور نحو میر، کبریٰ اور علم الصیغہ ہی پڑھنے کی انہوں نے تجویز دی تھی۔ مولوی
 محمد علی صاحب حیدر آبادی جو عرصے کے بعد حیدر آباد میں انتقال فرما گئے ان سے
 یہ کتابیں شروع کیں۔ بعد ازاں کبریٰ مولوی یعقوب الرحمن صاحب عثمانی کے پاس
 چلی گئی افسوس کہ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے لیکن خارج میں مولانا محمد ابراہیم
 صاحب بلیاوی سے بھی کبریٰ پڑھتا تھا۔

مولانا عبدالسمیع صاحب سے باقاعدہ میں نے تلخیص، مختصر المعانی، نور اللؤلؤ
 کتابیں پڑھیں۔ لیکن خارج میں مطول پڑھی جو پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل
 کے کورس میں بھی تھی۔ اس لئے گھر پر بعد بخر جا کر پڑھتا تھا۔



علامہ عثمانی اور سیاسیات

دعوتِ اول

آپ کی سیاسیات ملکی کے سلسلے میں ہم نے تجلیات عثمانی میں تفصیل سے بحث کی ہے لیکن واقعات کی ترتیب میں مجھے یہاں ان کے سیاسیات کے اثرات اور مشاغل ظاہر ہوئے ہیں اس لئے ان کا اظہار یہاں سوانح زندگی کی ترتیب کے مناسب ہوگا۔

علامہ کی ابتدائی سیاسی سرگرمی ترکوں کی حکومت اور خلافت سے شروع ہوئی جبکہ ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۱ھ میں جنگ بلقان کا آغاز ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں جمعیۃ الانصار ہندوستان میں چمک رہی تھی اور شباب پر تھی۔ علامہ پبلک کے سامنے آچکے تھے اور آپ کی تحریریں اور تقریریں ملک سے خراج تحسین حاصل کر رہی تھیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے اس لئے جنگ بلقان سے بھی مسلمانان ہند سخت متاثر ہوئے۔ علمائے دیوبند اس تاثر میں آگے آگے تھے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس سب سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے ترکوں کی امداد کی خاطر ایک وہ وقت آیا جبکہ مدرسہ لوبھی ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ نومبر ۱۹۱۲ء میں بند کر دیا گیا اور تمام علمائے دیوبند اور طلبہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں چندے کے لئے پھیل گئے۔ پہلے لکھ آیا ہوں کہ حضرت شیخ الہند، علمائے دیوبند، طلبہ اور اساتذہ کی طرف سے اس

سلسلے میں بڑی خدمات عمل میں آئیں۔

ہلال احمر اور عثمانی | علامہ عثمانی بھی بہر حال اسی دارالعلوم کے ہونہا
اور قابلِ فرزند تھے وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے

چنانچہ آپ نے بھی اس سلسلے میں کوششیں کی ہیں اور آپ نے جس نے علاقے
میں دورہ کیا وہ کاندھلہ اور مظفرنگر کے دوسرے حصے معلوم ہوتے ہیں محرم ۱۳۳۱ھ
کے ضمیمہ القاسم میں ہلال احمر کے نام سے چندے کی فہرستیں شائع ہوئی ہیں۔ ہلال
احمر ترکوں کی ایک سوسائٹی تھی جس کا کام مریضوں اور جنگ کے زخمیوں کی امداد
تھا بعینہ جس طرح یورپ میں ریڈ کراس سوسائٹی ہے۔ اسی القاسم کے ضمیمہ سے
معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی معرفت کاندھلے سے ایک رقم تین سو پندرہ روپیہ کی
موصول ہوئی ہے۔ جو، رذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۹۱۲ء کو آپ کے
نام سے اس فنڈ میں داخل ہوئی۔ دوسری رقم، رذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق
۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء کو مبلغ دو سو آٹھ روپیہ کی آپ کے نام سے درج ہے۔ تیسری
رقم ۱۸ رذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء کو درج ہے جو آپ کی معرفت
جمع ہوئی جو دو سو کی رقم ہے۔

ہلال احمر کے چندے کی ایک اور فہرست جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ مطابق مئی
۱۹۱۳ء کے القاسم میں شائع ہوئی ہے جس میں مولانا عثمانی نے خورجہ ضلع
بلند شہر کا بھی دورہ کیا ہے جہاں اس وقت آپ کے دوست مولانا عماد الدین
صاحب انصاری تھے وہاں سے سترہ سو پچاس روپیہ وصول کر کے لاتے ہیں۔
جو ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کی تاریخ میں آپ نے ہلال احمر کی مدد میں دارالعلوم
میں داخل کیا۔ گویا ان فہرستوں میں آپ کے ذریعہ دو ہزار چار سو تہتر روپیہ داخل
ہوئے۔ ان رقومات کے علاوہ ۲۸ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کو ایک رقم مبلغ

ایک سو پچیس روپیہ خورجہ سے وصول شدہ آپ نے دارالعلوم میں داخل کی گویا
کلی رقم دو ہزار پانسو اٹھانوے روپیہ کی علامہ عثمانی کے ذریعہ داخل ہوئی۔ اس
کے علاوہ خود دارالعلوم میں جو جلسہ ہوا اس میں جو رقم آپ کے ذریعہ داخل ہوئی
وہ اس کے علاوہ ہے۔

شیخ الہند کی مالٹا واپسی اور علامہ عثمانی کا انکی معیت میں سیاسی دورہ

ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا عبداللہ سندھی کابل پہنچ چکے۔ اور حضرت شیخ الہند مکہ
محظہ روانہ ہوئے لیکن وہاں گرفتاری کے بعد مالٹا میں اسیر کر دیے گئے۔ ۲۲
جمادی الاخریٰ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مالٹا
سے رہا ہوئے اور ہندوستان کو روانہ کئے گئے۔ ۲۰ رمضان ۱۳۳۵ھ مطابق
جون ۱۹۲۰ء کو ممبئی پہنچے۔ ۲۶ رمضان ۱۳۳۵ھ کو دیوبند میں قدم رنج فرمایا۔

تحریک خلافت اور فتویٰ ترک موالات

جس وقت شیخ الہند تشریف لائے
ہندوستان میں تحریک خلافت اور
ترک موالات شباب پر تھی۔ انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پھیلی ہوئی تھی۔
ہندو مسلم اتحاد زوروں پر تھا۔ ان حالات میں شیخ الہند کب خاموش رہ سکتے
تھے۔ ترک موالات کا فتویٰ اس زمانے میں آپ کی طرف سے شائع ہوا۔ آپ
سے جب ترک موالات کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے اس کے جواب کے لئے اپنے
تین شاگردوں کو جمع کیا۔ استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:-

شیخ الہند مولانا محمود حسن علیہ السلام کی نظر میں
علامہ عثمانی کے فتوے کی پسندیدگی؛
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ
علیہ سے واپسی مالٹا کے
بعد ترک موالات کا استفتاء

کیا گیا (جو کسی علیگڑھ کے صاحب نے کیا تھا۔ انار) حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتویٰ یہ حضرات مرتب کریں..... چنانچہ تینوں حضرات نے قلمبند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا جواب تو ماشاء اللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔“

(رسالہ دارالعلوم ۱۵ ماہ مئی ۱۹۲۰ء)

اس عبارت سے واضح ہے کہ ترک موالات پر شیخ الہند کی طرف سے جو فتویٰ شائع ہوا اور جس پر مسلمانان ہند مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کو بھی توڑنے لگے تھے، وہ علامہ شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہوا تھا۔ یہی وہ محرکہ آرا فتویٰ ہے جو ”ترک موالات“ کے عنوان سے موصوف نے جمیعۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ دہلی ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۸، ۹، ۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو بصدارت شیخ الہند پڑھا تھا۔ اور جس کا حوالہ آپ نے قرآن کریم کے فوائد کے ضمن میں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے موالات بالکفار (کافروں سے دوستی) کے متعلق حضرت شیخ الہند کی فرمائش پر مستقل رسالہ ترک موالات پر لکھا ہے۔

دورہ ہند اگرچہ شیخ الہند کی عمر نے مالٹا سے واپسی پر وفانہ کی لیکن پھر بھی چند ماہ میں آپ نے اپنی قوت سے زیادہ کام کیا اور علامہ عثمانی کو اپنی زبان بنا کر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ان تمام جلسوں میں حضرت عثمانی کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ وہ اپنے استاد و شیخ کے ترجیاً بنے اور تقریریں کیں۔ پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔ اے ایڈیٹر

برہان ریڈر سنی تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ جنوری ۱۹۵۷ء کے برہان کے
نظرات میں لکھتے ہیں :-

” حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ماٹھ سے آنے کے بعد آپ (مولانا
عثمانی) نے ۱۹۱۹ء کے آخر اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں سہارنپور، غازی پور
لکھنؤ، بنارس، کانپور، علیگڑھ اور دہلی کے بڑے بڑے اجتماعات
میں حضرت شیخ الہند کے ترجمان کی حیثیت سے جو بلند پایہ تقریریں کیں
انہوں نے ملک کے گوشے گوشے میں مولانا عثمانی کی عظمت و برتری کا
سمجھ بھادیا۔“ (برہان جنوری ۱۹۵۷ء)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے شیخ الہند کی زبان بن کر سیاسیات
میں خاصہ حصہ لیا۔ اور اس طوفانی دورے میں جمعیت الانصار کی طرح ملک بھر
میں تقریروں کا ہنگامہ برپا کر دیا۔

ہندوستان میں ترک موالات کے
زور شور اور خلافت کی تحریک کے
اس دور میں مسلم قوم کی ایسے اداسے

علیگڑھ کا سفر اور جامعہ ملیہ کا افتتاح
۶ صفر ۱۳۳۹ھ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء

کو دیکھنا گوارا نہ کرتی تھی جس میں گورنمنٹ دخیل ہو یا اس کی طرف سے گورنمنٹ کی
وفاداری کا اظہار بلکہ رنگ میں بھی ہو اس لئے مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی رائے یہ تھی
کہ ایک ایسی آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے جو اسلامی آزادی کی رُوح باقی رکھتے ہوئے
مذہبی اور سیاسی تعلیم دے اور انگریزوں سے آزاد ہو۔ اس سلسلے میں جوہر موصوف
نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کو بھی مشتعل کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے یونیورسٹی کا
کابینہ کاٹ کیا۔ لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین، خدا نہیں جنائے خیر دے، اپنی جگہ ڈٹے
رہے۔ جنائے خیر کی وجہ یہ کہ جب ہندو بنارس یونیورسٹی کے بائیکاٹ کا سوال پیدا

ہوا تو پنڈت مدن موہن مالویہ جو اس کے کتا دھرتا تھے انہوں نے نان کو آپریشن والوں کو آنکھیں دکھائیں اور یونیورسٹی کمپانڈ میں ایسے غصہ کو گھسنے بھی نہ دیا۔ اگر مسلم یونیورسٹی اس وقت ٹوٹ جاتی تو غیر مسلموں میں گہمی کے چراغ جلنے اور ان کی یونیورسٹی باقی تھی۔ بہر حال جامعہ ملیہ کی علیگڈھ میں بنیاد رکھنے کے لئے شیخ الہند کو دعوت دی گئی۔ آپ اس وقت سخت بیمار اور کمزور تھے لیکن آپ نے اسے قبول فرمایا۔ آپ کو پاکی میں جٹا کر سٹیشن لے جایا گیا اور وہاں سے علیگڈھ۔ مسلم یونیورسٹی کی مسجد شیخ الہند کی چار پائی بڑے محرابی دروازے میں بچھا دی گئی اور مولانا عثمانی نے جامعہ ملیہ کے افتتاح کے لئے شیخ الہند کی طرف سے انتہائی خطبہ پڑھا۔ یہ خطبہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو حضرت عثمانی نے ہی تحریر فرمایا تھا کیونکہ عبارت میں وہی ادبیانہ رنگ اور شان و شکوہ ہے جو ان کی اردو میں ہوتا ہے۔ جناب مولانا محمد میاں صاحب مصنف علمائے حق تحریر فرماتے ہیں :-

”یہ اجلاس ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علیگڈھ

میں ہوا۔ حضرت شیخ الہند کا خطبہ صدارت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔“ (علمائے حق جلد اول صفحہ ۲۱۳)

اس زمانے میں عام طور پر یہی مشہور تھا کہ یہ علیگڈھ والی تحریر حضرت عثمانی ہی کی لکھی ہوئی تھی جیسا کہ آئندہ صفحات میں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شیخ الہند جب اس قدر غلیل ہوں تو آپ کیا لکھ سکتے تھے۔ طرز تحریر سے اندازہ لگائیے کہ یہ خطبہ حضرت عثمانی کا لکھا ہوا نہیں تو اور کس کا ہے۔ لکھتے ہیں :-

”ہماری قوم کے مربراؤردہ لیٹروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ

کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں

جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و

فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں
اور ان میں اپنی ملت اور اپنی قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں
سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے
اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی
اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عمل
اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔“ (خطبہ علی گڑھ)

یہ عبارت صاف غمازی کر رہی ہے کہ میں جناب عثمانی کے قلم کی چکیدہ اور
مرہون ہوں۔ الفاظ کی چستی، تراکیب کی برہنگی، عبارت کا شکوہ اور مضموں کی
ذہنی ساخت سب کچھ اسی صاحب قلم کی صنعت بیان کا ثمرہ ہیں (یہ تو ہم نے دیکھا
و عقل سے لکھا ہے لیکن حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی نقش حیات میں تحریر
فرماتے ہیں کہ علی گڑھ کا خطبہ مولانا شبیل احمد صاحب عثمانی نے تحریر کیا تھا۔
جامعہ ملیہ کا افتتاح اگرچہ علی گڑھ میں ہوا لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس
کو دہلی منتقل کر دیا گیا جہاں ۱۹۱۷ء تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی پرنسپل شپ
میں چلتا رہا اور ابھی جاری ہے۔

جنگ بلقان و طرابلس ۱۹۱۲ء - ۱۹۱۳ء
جمعیتہ العلماء ہند ۱۹۱۹ء کے بعد ۱۹۱۳ء میں جنگ عظیم کا آغاز

ہوا۔ اس جنگ میں جرمنی اور ترکی ایک دوسرے کے حلیف تھے اور برطانیہ سے
نبرد آزما تھے۔ ہم نے تجلیات عثمانی میں اس کا پس منظر پوری تفصیل سے بیان
کیا ہے۔ بہر حال ترکوں سے جنگ کی بنا پر اور ان کی شکست کے باعث امت
مسلمہ کے لئے خلافت کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جب جرمن
اور ترکوں کو شکست ہوئی تو خلافت کے پرزے پرزے ہو گئے۔ ۱۹۱۸ء کے

بعد تحریک خلافت نے زور پکڑا اور خلافت کھٹی عمل میں آئی۔ سرزمین ہندوستان کا چپہ چپہ اس تحریک سے متاثر ہوا۔ ہندو بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ آزادی وطن کی تحریک میں شامل ہو گئے اور علماء اگرچہ خلافت کے جلسوں میں شریک ہوتے لیکن ان کے لیے خصوصی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جہاں سے خالص مذہبی آواز بلند ہوتی اس لئے خلافت اور کانگریس، نیز مسلم لیگ کے علاوہ ۱۹۱۹ء میں جمعیت العلماء وچود میں آئی جس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ہوا۔ جون ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مالٹا سے تشریف لائے تو جمعیت کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کی تاریخوں میں شیخ موصوف کی زیر صدارت نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوا۔ اسی میں حضرت شیخ الہند نے ترک موالات پر اپنے خطبہ میں زور دیا تھا اور اسی میں حضرت عثمانی نے ترک موالات پر تقریر پڑھی تھی۔

اس اجلاس کے صرف ایک ہفتہ بعد حضرت شیخ الہند تو ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو دنیا سے رخصت ہو گئے اور جناب عثمانی نے اپنے شیخ کی تحریک اور خیالات کو آئندہ بھی جاری رکھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شاگردوں کی علمی قوتوں میں سب سے زیادہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی پر اعتماد تھا اور ان کی تحریری شگفتگی کے بھی دل سے قائل تھے۔

شیخ الہند کا علامہ عثمانی پر علمی اور تحریری و تقریری اعتماد یہی وجہ ہے کہ جہاں پڑھانے یا لکھنے کا مہتمم بالشان کام ہوتا وہاں علامہ شبیر احمد صاحب پر ان کی نظر انتخاب پڑتی تھی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب اپنی خود نوشتہ سوانح زندگی ”نقش حیات“ میں لکھتے ہیں :-

” مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلبہ نے ترک موالات کے سلسلے میں مدرسے کو
 چھوڑ دیا۔ طے ہوا کہ اس کے متوازی مدرسہ قائم کیا جائے چنانچہ مسجد ناخدا میں
 آزاد مدرسہ قائم کیا گیا اور مولانا عبدالرزاق طبع آبادی ناظم بنائے گئے۔ فرنگی
 محل اور امر وہرے مدرسین مسکائے گئے۔ لیکن حدیث کے لئے کسی مشہور اور
 فاضل مدرس کی ضرورت تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ مولانا
 شبیر احمد صاحب یا مولانا رفیق حسن صاحب وہاں چلے جائیں۔ حضرت نے
 دونوں صاحبوں سے تذکرہ کیا دونوں نے علیمہ علیہ واپنی ماؤں سے اجازت
 طلبی کا غذر کیا۔“

مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان دونوں صاحبوں میں مولانا شبیر احمد صاحب
 کا درجہ اول تھا۔ اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے اور مولانا مدنیؒ نے بھی لکھا ہے کہ جامعہ
 ملیہ کے افتتاح کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ نے خطبہ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد
 صاحب کو بتا کر تحریر کا حکم دیا اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسوودہ لکھ کر لائے تو
 اس دن کہ حسب منشا ترمیم فرما کر چھپنے کا حکم دیا گیا۔ (نقش حیات جلد دوم ص ۲۵۶)
 یہ ہے حضرت شیخ الہندؒ کا تحریری اعتماد اور پہلا تھا علمی اعتماد۔

افتتاح جامعہ ملیہ
 ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :-

” ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس (افتتاح) کی تاریخ
 مقرر ہو گئی۔۔۔۔۔ حضرت (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ نے شرکت اور صدارت
 فرمائی۔ صنف اور بیاری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے۔ دونوں کے
 کندھوں پر ٹیک لگا کر چلنا ہوتا تھا۔ خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے
 پڑھا جو کہ مطبوع ہے۔“ (نقش حیات جلد دوم ص ۲۵۹)

مشاہدات اہم الحروف

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چھ ماہ بعد
۶ شوال ۱۳۳۹ھ مطابق مئی ۱۹۲۱ء کو راقم الحروف

دیوبند پہنچ گیا جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ ان ایام میں دیوبند اور بیرون دیوبند
میں بے حد جوش و خروش تھا۔ میں نے مولانا عثمانی کی دیوبندی میں خلافت اور آزادی
ہند کے سلسلے میں اول اول تقریریں سنیں۔ اس سے پہلے مجھے جن صاحب کی تقریر اپنے
اہل وطن میں من کو بھائی تھی وہ مولانا منظر الدین صاحب شیرکوٹی شہید تھے۔ لیکن
حضرت عثمانی کی تقریر نے دل پر جو اثرات چھوڑنے وہ کچھ اور ہی تھے۔

تب مجھے موصوف کی شعلہ مقالی اور جادو بیانی کا پتہ چلا۔ خوب یاد ہے کہ آپ
کی ایک تقریر تو آپ کی مسجد کے سامنے کے چوک ہی میں محلہ گدڑواڑہ میں ہوئی۔ تحصیل کے
پاس قلعہ کی مسجد کے سمیع ڈاکھانے کے سامنے بھی جو عام جلسہ گاہ تھی مولانا کی محبتی
تقریریں ہوتیں اس سلسلے میں باہر بھی تشریف لے جاتے دیکھا اور دیکھنے والوں
کی زبانی تقریروں کے تاثرات معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو پہلی
ترتیب ۱۹۲۱ء میں دیوبند میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اکثر باہر جاتے اور دیوبند
میں حضرت شیخ الہند کے دولت خانہ پر ٹھہرتے۔ چونکہ اور پگڑائی، کھدائی شیردانی
کھدکا کرنا اور کھدکا مغلی پاجامہ پہنتے۔ صورت و سیرت میں علما رنگ ظاہر
ہوتا تھا۔ ان دنوں آپ کی گرفتاری کا وارنٹ نکلا۔ دوا بھنگی۔ یہ مغرب کے
بعد کا وقت تھا۔ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند رحمۃ اللہ کے مکان پر فروکش
تھے لیکن مسلمانوں کو جب معلوم ہوا تو ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے۔ فساد کا قوی اندیشہ
ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم ہرگز مولانا کو گرفتار ہونے نہیں دیں گے۔ پولیس افسر
نے دور اندیشی سے کام لیا اور واپس چلے گئے لیکن آدھی رات کے بعد پھر آئے اور
گرفتار کر کے لے گئے۔ اس وقت کسی شاعر نے مولانا مدنی کے متعلق اشعار بھی

لکھتے تھے۔ غالباً نورسہارنپوری تھے۔ کہا تھا کہ

اے حسین احمد حق کے فدائی
آبرو دین و دنیا میں پائی
کی بروں سے بھی تم نے بھرنی
آبرو دین و دنیا میں پائی

مولانا حسین احمد صاحب کی گرفتاری کے بعد مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات اور علامہ عثمانی کی بھی شہرت گرم تھی کہ یہ بھی اب گرفتار ہوئے اور اب گرفتار ہوئے۔ چنانچہ اس روز موخر الذکر مولانا عثمانی اپنی گرفتاری کے انتظار میں مطبع قاسمی میں مولانا عماد الدین صاحب ناظم مطبع قاسمی کی جائے قیام میں مقیم رہے۔ لیکن جب تمام دن گذر گیا اور کوئی نہ آیا تو شام کے وقت مغرب کے قریب گھر تشریف لے گئے۔ گھر سے گرفتار ہوتے تو والدہ کو بہت دکھ ہوتا اس لئے ان کی خاطر مطبع قاسمی میں گرفتار ہونا پسند فرماتے تھے۔ خود فرمایا ہے کہ والدہ صاحبہ کو گرفتاری کی افواہ سے بہت احساس ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ موصوف قید و بند اور جیل اور جکے کے مرد نہ تھے۔ بہر حال

رسیدہ بود بلائے دے بخیر گذشت

ان تینوں حضرات میں سے کوئی گرفتار نہ ہوا۔

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری پر عمل | مولانا مدنی کی گرفتاری نے
شہر میں جوش پیدا کر دیا تھا تقریباً

روز جلسے ہوتے۔ اکثر و بیشتر مولانا عثمانی کی تقریریں ہوتیں۔ باہر بھی سہارنپور، دہلی، میرٹھ اور دیگر مقامات پر تقریریں جاتے۔

پہلے لکھ چکا ہوں کہ کانگریس اور
مسلم لیگ سے علیحدہ صرف علماء کے
لئے متحدہ پلیٹ فارم کی ضرورت

جمعیتہ العلماء ہند دہلی کی مجلس
عاملہ کے رکن علامہ عثمانی

کے باعث علمائے ہند دہلی کا وجود ۱۹۱۹ء میں عمل میں آیا۔ علامہ عثمانی اس کی
مجلس عاملہ کے ممتاز رکن تھے۔ آپ اکثر جمعیتہ العلماء کے سالانہ جلسوں میں شریک
ہوتے۔ مجلس عاملہ کی تجویزوں پر بحث کرتے، اختلاف رائے پیش کرتے۔ جمعیت
کے خاص ارکان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا
حسین احمد صاحبؒ مدنی، مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ، مولانا سید محمد رفیع
شاہ صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ
وغیرہم تھے۔ ان میں بھی آگے چل کر جمعیتہ العلماء مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور
مولانا مدنی صاحبؒ کے دم سے چل رہی تھی۔

پہلے تو اس میں ہندوستان کے مختلف العقائد علماء شامل تھے۔ لیکن
مولانا احمد سعید صاحب ابتدائے دور خلافت میں گرفتار ہوئے تو ان کی جگہ
سیکرٹری مولانا منظر الدین صاحب شیرکوٹی ایڈیٹر الامان دہلی بنائے گئے۔
جب مولانا احمد سعید صاحب رہا ہوئے تو پھر سیکرٹری وہی بنائے گئے۔ مولانا
منظر الدین صاحب شہید اس جماعت سے اختلاف کے باعث علماء کی دوسری
جماعت سے جاملے جو مولانا عبد الماجد بدایونی اور دیگر علمائے بریلی پر مشتمل تھی۔

بہر حال جمعیتہ العلماء میں علامہ ۱۹۱۹ء سے

۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۵ء تک

۱۹۴۵ء تک شریک رہے اور اس عرصے

میں آپ نے خلافت کمیٹیوں اور جمعیتہ العلماء اور ہندو مسلم اتحاد کے پلیٹ
فارموں پر زبردست تقریریں فرمائیں۔

۱۹۲۲ء میں جب گیا میں جمعیتہ العلماء کا سالانہ جلسہ ہوا تو مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر بنائے گئے اور آپ کا خطبہ صدارت علامہ نے ہی پڑھا جس سے محفل کا رنگ بدل گیا۔ اس جلسے میں موصوف نے ایک بڑی تقریر بھی کی تھی جو اس تجویز کے رد میں تھی کہ آئندہ کو بائیکاٹ کی بجائے ہندوستانیوں کو اسپیلوں میں شریک ہو کر اپنے حقوق کے حصول میں جدوجہد کرنی چاہئے۔

ہم نے علامہ کی سیاسی سرگرمیوں کا پورا تفصیلی جائزہ تجلیات عثمانی میں لیا ہے۔ یہاں اس کو دہرانا تطویل سے خالی نہیں۔ اس لئے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ خلافت، جمعیت، ہندو مسلم اتحاد اور مسلم لیگ کے معاملات میں صرف ایک سیاست پیش نظر رکھتے تھے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت اور شریعت اسلامی کے احکام اور اسلام کا اقتدار باقی رکھا جائے۔ اور اس کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔

خلافت کے دور میں مسلم ہندو اتحاد میں جو مذہبی بے اعتدالیاں مسلمانوں اور ان کے لیڈروں کی طرف سے ہوا کیں مثلاً مسلمانوں کا ملک لگانا، گائے کی قربانی سے دست بردار ہونا، ارتھیوں کے ساتھ رام رام کہتے ہوئے چلنا وغیرہ وغیرہ آپ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔

جمعیتہ العلمائے ہند سے بھی آپ کا اس سلسلہ میں ہمیشہ اختلاف رہا کہ وہ جمعیت کی پالیسی کو علماء کی حیثیت سے کسی کا تابع مہمل بنا گوارا نہیں فرماتے تھے۔

تحریک خلافت کا ہند میں ۱۹۲۸ء میں خاتمہ | خلافت کے پلیٹ فارموں سے علامہ نے کسی نہ کسی شکل میں اس وقت

تک روگردانی نہیں کی جب تک کہ خود خلافت ترکوں کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دی گئی اور اصرہ ہندوستان کے اولوالعزم لیڈر یعنی علی برادران مولانا محمد علی اور

شوکت علی بھی خلافت کیٹی کے بانی مبنی تھے خلافت سے دست بردار نہ ہو گئے یعنی ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء کو ترکوں کی قومی اسمبلی نے خلافت کو سلطنت سے جدا کرنے اور سلطان وحید الدین کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں ترکی میں خلافت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔

۲۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ایک اجلاس خلافت کیٹی کا زیر صدارت مولانا محمد علی جوہر مرحوم کلکتہ میں ہوا اور پھر نہرو رپورٹ کے سلسلے میں خود خلافت کیٹی کے مسلم لیڈروں میں اختلاف ہو گیا۔ لیکن خلافت کیٹی اس کے بعد سکتی سی رہی کیونکہ پھر اس کے باقاعدہ جلسے نہوتے البتہ ۳۰ مئی ۱۹۳۱ء کو بمبئی میں، ۲۷ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اجیر میں، اور ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں جلسے ہوتے اور پھر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گئی۔ ۱۹۱۹ء میں اس کا آغاز ہوا اور ۱۹۳۸ء میں ۱۹ سال کی عمر میں غفر کہا ہو گئی۔ علامہ عثمانی بھی یہیں تک چل سکتے تھے لیکن خلافت کے آخری سالوں میں ان کی جولا گاہ زیادہ ترجیحیہ العلمائے ہند کا میدان تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کا شدھی کے عہد خاتمہ | ہندو مسلم اتحاد کا بھانڈا بھی شدھی کے چور ہے میں پھوٹا جبکہ پنڈت شرمندا نے انگریزی حکومت سے رشوت لیکر دونوں قوموں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے آگے کے ارد گرد ملکوں میں شدھی کی تحریک شروع کر دی۔ علماء اور دیندار مسلمان ہندو مسلم اتحاد سے مستعفی ہو گئے۔ اور یہی انگریز چاہتا تھا۔ شدھی کی تحریک دراصل لارڈ ریڈنگ یہودی والس رائے ہند کی سیاسی عیاری کا کرشمہ تھا جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔

خلافت کے جلسوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد میں بھی زبردست شکاف پڑ گیا اور اس کا سبب کچھ تو نہرو رپورٹ (جس میں ہندو حقوق کا زیادہ

خیال رکھا گیا تھا، بنی اور زیادہ تر شدھی۔ بہر حال اس طرح حضرت عثمانی کے لئے اب یہ مقام بھی نہ رہا۔ اب لے دے کہ جمعیتہ العلماء اور تبلیغی یا مناظروں کے میدان تھے۔ جن میں علامہ کی ہر جگہ مانگ تھی۔

جمعیتہ العلماء میں علامہ عثمانی کی خدمات ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک

علامہ نے جمعیتہ العلماء ہند میں رہ کر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک خاصی خدمات انجام دی ہیں جن کا اظہار انہوں نے مکالمۃ الصدرین میں پوری شدت سے کیا ہے۔ لیکن ہم سر دست ان کی خدمات کے متعلق جمعیتہ العلماء کے جلیل القدر ہمراہ عہدہ دار مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی کی زبانی پیش کرتے ہیں۔ ان کی رپورٹ ”جمعیتہ العلماء کیا ہے“ کی دو جلدیں اس وقت میرے پیش منظر ہیں جن میں انہوں نے جمعیتہ العلماء کے کارناموں کی رپورٹ پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں :-

”۱۹۱۴ء کے جنگ کے سلسلے میں جبکہ یورپ کی عدم تعاون کا فتویٰ فرنگی طاقتوں نے ترکی حکومت کو ختم کر دینے اور خلافت اسلامیہ کو تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور حجاز مقدس پر قبضہ جمانے کا ارادہ کر لیا اس وقت جمعیتہ العلماء ہند کے رہنماؤں نے اپنی بصیرت سے ترک موالات اور عدم تعاون کے قدیم اسلامی حربے کے استعمال کا فیصلہ کیا اور تمام مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے عدم تعاون کے پروگرام کے متعلق ایک متفقہ فتویٰ تیار کیا جس کو لیکر خلافت کمیٹی اور کانگریس کے رہنما اور کارکن حکومت کے مقابلے میں صف آرا ہوئے۔ (جمعیتہ العلماء کی ہر جگہ ۱۲/۱۱)

اس موقع پر میں اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علامہ شبیر احمد نے ایک بار دست خطہ پڑھا تھا جس کا عنوان ہی ”ترک موالات“ تھا اور جس کو فقہیہ ہند مفتی کفایت اللہ صاحب اور تمام علماء نے بہت سراہا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد میاں صاحب دوسری جلد میں لکھتے ہیں :-

”سالانہ اجلاس جمعیتہ العلماء ہند، ترک موالات پر زبردست تقریر از مولانا شبیر احمد عثمانی براہ راست دفتر سے شائع کی“

(جمعیتہ العلماء کیا ہے جلد ۲ صفحہ ۲۹)

خود شیخ الہند کے خطبہ صدارت اجلاس دہلی میں جس کو مفتی کفایت اللہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا شیخ الہند کی ترجمانی کے ضمن میں علامہ عثمانی کے خطبہ ترک موالات کے لکھا ہے :-

”جو کچھ مجھے کہنا تھا خطبہ صدارت میں کہہ چکا ہوں اور جو مبسوط مضمون مولو شبیر احمد صاحب عثمانی نے آپ کو آج ہی کے اجلاس میں سنایا ہے اس کے ضمن میں بھی میرے مقاصد اور محسوسات نہایت خوبی سے ادا ہو گئے ہیں“

مولانا محمد میاں صاحب آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں :-

حجاز میں **مؤتمر اسلامی** | حجاز پر شریف مگر کی بجائے ابن سعود کا قبضہ ہو گیا تو جمعیتہ العلماء ہند نے

ان کو ایک مؤتمر اسلامی منعقد کرنے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں صحیح طریقہ پر نظام حکومت قائم ہو چنانچہ سلطان ابن سعود نے اس مشورے کو قبول کیا اور ایک مؤتمر اسلامی منعقد کی جس میں جمعیتہ العلماء ہند کا ایک

نمائندہ وفد شریک ہوا“ (صفحہ ۱۳ جلد ۱)

اس وفد میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے مختلف مجلسوں میں اور شاہ ابن سدد کے سامنے عربی میں زبردست تقریریں کیں۔ یہ مقرر دراصل نظام حکومت کے سلسلے میں مشورے کے لئے نہیں بلکہ ابن سعود نے صحابہ کی قبروں پر بنے ہوئے قبوں اور دیگر مآثر کو منہدم کر دیا تھا جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا اس لئے ابن سعود نے تمام دنیا کے اسلام کے جلیل العلماء کو دعوت دی تھی۔ ہندوستان سے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت علامہ شبیر احمد صاحب، مولانا عبدالحلیم، مولانا محمد عرفان اور مولانا احمد سعید صاحب جمعیت کی طرف سے نمائندہ مقرر کئے گئے تھے جس کا تفصیلی تذکرہ ہم نے تجلیات عثمانی میں پیش کیا ہے اور آئندہ بھی آ رہا ہے۔

جمعیۃ علمائے ہند کے تیسرے اجلاس
 میں جو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت
 میں ۱۸ - ۱۹ - ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء

علامہ عثمانی جمعیت کے اجلاس سوم میں
 اور سبکیٹی کے رکن کی حیثیت میں

مطابق ۱۷ - ۱۸ - ۱۹ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو لاہور میں منعقد ہوا اس میں جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں تیسری تجویز کے جز (ب) یعنی مسلمانوں کو کسی غیر مسلم کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے جنگ کرنا جس سے کفر کی شوکت بڑھتی ہے اور اسلام کی قوت کو صدمہ پہنچتا ہے قطعاً حرام ہے۔ اس تجویز کی تحریک مولانا حبیب الرحمن عثمانی نے فرمائی اور تائید میں پہلا نام علامہ شبیر احمد عثمانی کا ہے اور بعد ازاں مولانا محمد فاخر، مولانا محمد اسحق مراد آبادی، مولوی محمد نعیم لدھیانوی، مولانا مرتضیٰ حسن وغیرہم کے ہیں۔ یہی وہ جلسہ ہے جس میں علامہ عثمانی کی معرکہ آرا تقریر ہوئی جو تمام علماء کی تقریروں سے بڑھ کر تھی جس کو مولانا نصر اللہ غزنوی نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیا ہے۔

اسی لاہور کے اجلاس میں تجویز نمبر ۸ میں امیر الہند کی تجویز اور اس کا انتخاب بھی ہے۔ جس میں طے پایا کہ امیر الہند کا انتخاب کر لیا جائے اور ایک سب کمیٹی بنائی جائے جو امیر شریعت کے فرائض اور اختیارات کا تعین کرے چنانچہ ایک ایک کمیٹی بنائی گئی جو اپنی رپورٹ بدایوں کے دسمبر میں منعقد ہونے والے اجلاس میں پیش کرے۔

مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا حبیب الرحمن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب،
مولانا محمد شجاع صاحب، مولانا سید نور شاہ صاحب،
مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا عبد الباقی صاحب، مولانا تفسی خٹن صاحب،
مولانا شتار اللہ صاحب، مولانا محمد فاروق صاحب، مولانا عبد الماجد صاحب،
مولانا سبحان اللہ، مولانا محمد داؤد صاحب۔

اس سب کمیٹی میں جن علماء کو رکھا گیا ہے وہ ہند کے چیدہ علماء میں اور ان ہی میں علامہ شبیر احمد صاحب کا نام نامی بھی ہے۔ بدایوں میں ہونے والے سالہ اجلاس کو بعض وجوہ سے ملتوی کرنا پڑا لیکن صوبائی اجلاس ہوا۔ اس میں علماء کی تقریریں ہوئیں نیز سب کمیٹی نے اختیارات و فرائض امیر شریعت کا مسودہ تیار کر لیا۔ (بحوالہ اخبار مسلم، ارحمدی الاخریٰ سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق ۵ فروری ۱۹۲۲ء بدھو جمعۃ العلماء کیا ہے صفحہ ۲ جلد دوم)

مذکورہ سب کمیٹی کا امیر شریعت کے فرائض سے متعلق مسودہ اجہیر کے سالانہ اجلاس میں پیش کئے جانے کی تجویز مولانا عبد الحلیم صدیقی نے پیش کی لیکن پھر آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ (صفحہ ۵۲ ج ۲)

اور آخر کار سب کمیٹی کی یہ رپورٹ نہایت تفصیل سے مجلس منتظمہ کے اجلاس ۸/۹ صفر ۱۳۴۰ھ ۲۰/۲۱ دسمبر ۱۹۲۳ء بمقام دہلی پیش ہوئی اور مولانا عبد الحلیم صاحب مسودہ میں نام درج نہیں، خالی جگہ چھوڑی ہوئی ہے ۱۷ شفاق احمد لکھنؤی۔

صاحب نے سہ ماہی میں حمید یہ پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

حضرت عثمانی جمعیت کے چوتھے سالانہ اجلاس میں
جمعیت کا چوتھا سالانہ جلسہ ہو گیا میں ۲۲
دسمبر ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا اس میں علامہ
عثمانی نے کونسلوں اور اسمبلیوں کے مسلسل

بائیکاٹ پر تقریر کی اور فرمایا کہ گورنمنٹ برطانیہ کا مقاطعہ جاری رہنا چاہئے۔
دوسری طرف علماء کا ایک گروہ تھا جو یہ رائے رکھتا تھا کہ کونسلوں اور اسمبلیوں
پر قبضہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا یہی خیال تھا مگر علامہ عثمانی
کثرت رائے سے قلعیاں ہوئے۔ اس اجلاس میں مولانا حبیب الرحمن عثمانی کا خطبہ
صدارت علامہ عثمانی نے پڑھ کر سنایا تھا جنہوں نے خطبے میں حیات تازہ چونک
کر سامعین کو محو حیرت بنا دیا تھا۔

علامہ عثمانی مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ
دہلی، بتاریخ ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱ ستمبر ۱۹۲۳ء
کا اجلاس تھا جس میں علامہ
کی شرکت نیز مجلس منتظمہ کا ممبر

ہونا ثابت ہوتا ہے۔ افسوس کہ رپورٹ تمام تفصیلات سے خاموش ہے البتہ مجلس
منتظمہ کے اس اجلاس میں خصوصی تجویز جزیرہ العرب سے غیر مسلم کا اقتدار اور اثر دور
کرنے کے لئے طے کی گئی۔ اور التوائے حج کے مسئلے پر غور کرنا بھی طے کیا گیا۔ اور یہ
بھی طے پایا کہ حسب ذیل کمیٹی ایک فتویٰ مرتب کر کے جمعیت منتظمہ کے سامنے پیش کرے۔
کمیٹی کے ارکان یہ ہیں :-

مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا شام الدین صاحب،
مولانا محمد سجاد صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب، مولانا عبد الباقی صاحب،
مولانا منظر الدین صاحب (شیر کوٹی راقم الحروف کے ہوطن شہید)، مولانا حسین احمد صاحب

مدنی ، مولانا عبد الماجد صاحب - (جمعیتہ العلماء کے بارے میں) جلد دوم

علامہ شبیر احمد جمعیتہ العلماء کے پانچویں سالانہ اجلاس بمقام کوکناڈا میں جلسہ ۲۲، ۲۳، ۲۴ جمادی الاولیٰ

۱۳۳۲ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۲۳ء ویکم، دوم جنوری ۱۹۲۴ء کو کناڈا میں منعقد ہوا۔ جو مختلف تجویزیں اس جلسے میں پاس ہوئیں ان میں ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم لیڈروں نے دہلی کے اسپیشل کانگریس اجلاس اور بنگالی صوبائی کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں قومی معاہدہ یا میثاق ملی مرتب کیا۔ جمعیتہ العلماء نے تجویز کیا کہ دونوں مسودوں پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مرتب کی جائے جو انصاف، مذہبی آزادی اور حفاظت حقوق کے مضبوط اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنی تجویز جمعیتہ العلماء کو پیش کرے۔ اس سب کمیٹی کے لئے جو حضرات منتخب ہوئے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

- ۱۔ مولانا حسین احمد مدنی ۲۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ۳۔ مولانا سید سلیمان ندوی
 - ۴۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی ۵۔ مولانا ثناء اللہ ۶۔ مولانا عبد القدیر
 - ۷۔ صدر جمعیتہ ۸۔ ناظم جمعیتہ ۹۔ حکیم اجل خاں۔ (جمعیتہ کے صدر)
- ایک اور مجلس منتظمہ کے اجلاس دہلی میں مجلس منتظمہ کا اجلاس ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ محرم ۱۳۳۳ھ مطابق ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱

اگست ۱۹۲۴ء کو جمعیتہ علمائے ہند دہلی کے دفتر میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں جہاں اور بہت سی تجویزیں پیش ہوئیں ان میں ایک یہ بھی تجویز تھی کہ مسلمانوں کے فرقوں میں باہمی اختلاف کے اسباب اور اس کے رفع کرنے کی صورتوں پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ مولانا محمد میاں اس مجلس منتظمہ کی رپورٹ کا

حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”جمعۃ العلماء کا یہ اجلاس ان ناگوار فسادات کو جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں پیش آتے رہتے ہیں سخت افسوس کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے رفع کرنے کے لئے حسب ذیل اصحاب کی ایک کمیٹی منتخب کرتا ہے: مولانا ابراہیم صاحب، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا عبدالباری صاحب، مولانا عبدالقدیر صاحب، حکیم اجل صاحب“ (جمعۃ کیا ہے صفحہ ۱۰۳ تجویز نمبر ۱۲)

مذکورہ تجویز سے علامہ عثمانی کی شرکت اور ان کا اس کمیٹی میں انتخاب ان کی اہمیت اور خدمات پر واضح دلیل ہے۔

جمعیۃ کی مجلس منتظمہ کا ایک اور اجلاس
 خصوصی ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ مطابق
 ۱۱ جنوری ۱۹۱۵ء بوقت گیارہ بجے دن واقع
 بمقام مراد آباد میں

ہوا۔ اس میں جہاں اور بہت سی تجویزیں پاس ہوئیں ایک یہ بھی پاس ہوئی جمعیۃ کیا ہے کے رپورٹ لکھتے ہیں :-

”تجویز نمبر ۲۱ جمعیۃ علمائے ہند کا یہ اجلاس عدم تعاون کے پروگرام پر غور کرنے کے لئے حسب ذیل کمیٹی مقرر کرتا ہے۔ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ مرتب کر کے آئندہ جمعیۃ مرکزہ کے اجلاس میں پیش کرے۔ ارکان سب کمیٹی یہ ہیں :-

- (۱) مولانا ابوالحسن محمد سجاد صاحب (۲) مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی
- (۳) مولانا حسین احمد صاحب (۴) مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
- (۵) مولانا شام اللہ صاحب اترسری (جمعۃ کیا ہے صفحہ ۱۰۵)

حضرت عثمانی اجلاس مجلس عاملہ جمعیت
برسکان حکیم اجمل خاں دہلی میں

یہ فوری اور ہنگامی اجلاس ۳۰
جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ مطابق
۲۶ جنوری ۱۹۱۵ء کو منگل کے

روز حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر دہلی میں منعقد ہوا۔ جس میں گورنمنٹ
برطانیہ کی حجاج پرپاسپورٹ اور واپسی ٹکٹ کی پابندیوں کے خلاف گورنمنٹ
سے احتجاج کرنا تھا۔ رپورٹر کی رپورٹ کے مطابق اس میں مفتی کفایت اللہ صاحب
مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں وغیرہم شامل ہوئے
چونکہ آخری جنوری کو یہ قانون اسمبلی میں پیش ہونا تھا اس لئے دیگر ارکان مجلس
منتظمہ کو تار دے گئے۔ رپورٹر لکھتے ہیں:

”اس (تجویز) کے بعد مولانا مرتضیٰ حسن تشریف لائے اور مولانا
حبیب الرحمن صاحب، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب
عثمانی اور اپنی جانب سے متفقہ طور پر تحریری رائے پیش کی جس کا مقصد
قانون نڈا کو صریح مداخلت مدہبی ظاہر کرنا تھا۔ ڈھائی بجے جلسہ ختم ہو گیا۔“
(جمعیت کیا ہے صفحہ ۱۰۹ ج ۲)

الحاصل اس مجلس منتظمہ میں بھی علامہ عثمانی فعال کی حیثیت سے شریک ہیں۔

علامہ کا تذکرہ سالانہ اجلاس ہفتم
جمعیت منعقدہ کلکتہ میں؛

۱۱ مارچ تا ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء مطابق
۲۵ - ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ شعبان ۱۳۴۴ھ کے
سالانہ اجلاس ہفتم بصدارت سید سلیمان

ندوی میں بھی علامہ موجود نظر آتے ہیں۔ رپورٹر اس اجلاس کی عملی کاروائیوں اور
تجاویز کے ضمن میں لکھتے ہیں:-

”تجویز نمبر ۱۸..... جمعیت علماء کا یہ اجلاس صدر و ناظم جمعیت کو

اختیار دیتا ہے کہ جب مالی حالت اجازت دے تو وہ مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کریں اور اس کی رائے اور صوابدید کے ساتھ معتد اور مستند علماء کی نگرانی میں ترجمہ و تفسیری فوائد تیار کر کے طباعت کی کارروائی شروع کر دیں۔ تفسیری فوائد کا کام مولانا شبیر احمد صاحب کے سپرد کیا جاتا ہے، مولانا موصوف کی علامہ سید سلیمان صاحب اعانت کریں گے۔

(جمعیت کیا ہے صفحہ ۱۲۲ و صفحہ ۱۲۳ جلد دوم)

اس عبارت سے علامہ عثمانی کی شرکت معلوم ہوتی ہے اور اگر شرکت نہ بھی ہو تو دیکھنا یہ ہے کہ تمام علمائے ہند میں علامہ عثمانی کے لئے فوائد لکھنے کی خدمت طے کرنا ان کی تفسیری لیاقت اور علوم قرآنی میں جہارت کا واضح ثبوت ہے الحمد للہ اگرچہ جمعیت کی طرف سے تو انہیں البتہ قدرت کے انتخاب کی بنا پر مدینہ پریس کے مالک مولوی مجید حسن صاحب کی درخواست پر علامہ شبیر احمد عثمانی نے فوائد تفسیری کا وہ شاہکار انجام دیا ہے جس کی خوبی اور عمدگی تمام علماء میں مسلم ہے اور یہ تفسیری فوائد اس قدر مقبول ہوئے ہیں کہ اب تک کے تمام تفسیری فوائد ان کے سامنے ماند پڑ گئے ہیں۔

مجلس عاملہ کا یہ اجلاس ۲۰، ۲۱، ۲۲ اپریل ۱۹۲۶ء مطابق ۷، ۸، ۹ شوال ۱۳۴۵ھ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی تجویز

علامہ عثمانی کی یاد مجلس مرکزیہ جمعیت علماء ہند منعقدہ دہلی میں

میں رپورٹر لکھتے ہیں :-

”تجویز :- جمعیت مرکزیہ کا یہ اجلاس بالاتفاق مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا نثار احمد صاحب کو وفد حجاز کے لئے نمائندہ منتخب کرتا ہے۔“

اس وفد کو اختیار ہے کہ مولانا محمد عرفان یا مولانا عبدالحمیم صدیقی کو اپنا

سیکرٹری منتخب کرے (جمعیت کیا ہے ص ۱۲۳)

اس وفد میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب تو تشریف نہ لے جاسکے البتہ علامہ عثمانی مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا عبدالحمیم ندوی تشریف لے گئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم تجلیات عثمانی میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ تاہم حجاز سے وفد کی واپسی پر جو جمعیت عاملہ کا اجلاس ۲-۳ محرم ۱۳۶۶ھ مطابق ۳-۴ جولائی کو ہوا ہے اس میں تجویز ۵ کے الفاظ یہ ہیں:-

” وفد حجاز کی رپورٹ پیش ہوئی۔ قرار پایا کہ صدر محترم کو پورا اختیار

دیا جائے کہ وہ اس کی اشاعت کی جو مناسب تجویز فرمائیں اختیار کریں۔

ارکان وفد کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور صدر محترم اور دوسرے ارکان

کا شکریہ ادا کیا گیا“ (جمعیت کیا ہے ص ۱۲۳)

اٹھواں سالانہ اجلاس جمعیت علمائے ہند اور علامہ عثمانی | یہ اجلاس پشاور میں بصدرت استاذ محترم مولانا محمد انور شاہ صاحب ۷

سے ۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۶ھ مطابق ۲ تا ۵ دسمبر ۱۹۴۶ء منعقد ہوا۔ اس

اجلاس کی تجاویز میں تجویز نمبر ۱۵ بھی ہے جس میں طلاق وغیرہ کے مسائل میں غیر

مسلم حکام کے فیصلے کو غیر معتبر قرار دیتے ہوئے مسلمان حاکم کی ضرورت محسوس کی گئی

کہ حکومت مسلمانوں کے نکاح اور فسخ نکاح، خلع، طلاق کے لئے با اختیار شرعی

قاضی مقرر کرے۔ قاضی کے اختیارات کے سلسلے میں ایک سب کمیٹی بنائی گئی جو

حسب ذیل علماء پر مشتمل کی گئی:-

مولانا حسین احمد صاحب، مولانا شام الدین صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب،

مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا محمد نعیم صاحب، مولانا قطب الدین

صاحب ، مولانا عبد الماجد صاحب ، مولانا شبیر احمد صاحب ،
 مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ، مولانا عبد الحکیم صاحب پشاور ،
 (جمعیت کیا ہے ص ۱۲۷)

اسی اجلاس پشاور کی ایک اور تجویز میں حضرت عثمانی کا تذکرہ آتا ہے :-
 رپورٹر لکھتے ہیں :-

” جمعیت علمائے ہند کا یہ جلسہ اس اعلان کے ساتھ کہ سود کی حرمت
 قرآن پاک کی نص قطعی سے ثابت ہے اور کوئی شخص کسی حرام کو حلال نہیں
 کر سکتا ، علماء و واقفین معاملات تجارت کی حسب ذیل کمیٹی منتخب
 کرتا ہے جو حالات حاضرہ کی متعق و تحقیق کرے اور شرعی تیسیر (سہولت)
 کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب و سنت کی روشنی میں جہور مسلمین کی رہنمائی کرے
 اور ظاہر کر دے کہ حوادث جدیدہ میں کتنے امور جائز اور کتنے ناجائز اور
 حرام - کمیٹی کے ارکان یہ ہوں گے :-

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب ، مولانا سید حسین احمد صاحب ،
 مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ، مولانا
 عبد القہار صاحب (مروت والا) مولانا عبد الحکیم صاحب پشاور ،
 مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی ، مولانا عبد الماجد صاحب ابوی ،
 مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی ، مولانا قطب الدین صاحب
 فرنگی محل ، مولانا نثار احمد کانپوری ، مولانا معین صاحب جمبیری ،
 مولانا محمد علی صاحب ، سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب ، میاں ہاشم غلام
 علی مصطفیٰ صاحب ” (جمعیت کیا ہے ص ۱۳۳ و ۱۳۴)

مذکورہ بالا عبارتیں جو ہم نے ” جمعیت کیا ہے “ سے پیش کی ہیں اس بات

کی وضاحت میں واضح حقیقتیں ہیں کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے جمعیتہ العلماء میں رہ کر دین اور قوم کی وہ خدمات جلیلہ انجام دی ہیں کہ جن کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ نہ صرف جمعیتہ العلماء کی بولانگاہ تھی بلکہ تمام متحدہ ہندوستان کے دینی اور سیاسی پلیٹ فارم ان کی تقریروں سے گونجتے رہے ہیں۔

دسمبر ۱۹۲۷ء کے پیشاور اجلاس کے بعد ”جمعیتہ العلماء“ کیلئے میں علامہ عثمانی کا آخر تک کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ رپورٹ کی دوسری جلد ۲۳۸ صفحات پر ہے، لیکن علامہ کا ذکر ۱۶۹ صفحات پر پہنچ کر ختم ہو گیا ہے۔ دراصل یہ ایک خاکہ ہے جو مولانا محمد میاں صاحب نے مختصراً پیش کیا ہے۔ نہ صرف علامہ کا نام مذکور صفحہ کے بعد نہیں، بلکہ حضرت شاہ صاحب، مولانا حبیب الرحمن صاحب، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہم کسی کا بھی ذکر نہیں۔ البتہ مولانا عثمانی کی بعض تحریروں سے ۱۹۲۷ء کے بعد بھی مجلس شوریٰ اور بعض سالانہ جلسوں میں شرکت کے متعلق پتہ چلتا ہے۔ مراسلات سیاسیہ میں ایک جگہ مولانا محمد منظور نعمانی کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں :

” غالباً ۳۹ء میں اجلاس جمعیتہ العلماء نے ہندو دلی کے موقع پر

یاد ہو گا کہ آپ نے قبل از اجلاس کچھ گفتگو مجھ سے کی تھی۔ مجھے بہت کچھ امید ہو گئی تھی کہ آپ جیسے لوگ وہاں میری ہمنوائی کریں گے۔ میں ورکنگ کمیٹی

میں دوروز تک ان حضرات سے بحثا رہا۔ خیر اس میں تو آپ شامل نہ تھے پھر سبکیٹ کمیٹی میں مسئلہ آیا آپ بھی اس میں شریک تھے۔ میں

نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔ (مراسلات سیاسیہ ص ۷۱)

اس عبارت سے ۱۹۲۹ء کے اجلاس دہلی میں شرکت، ورکنگ کمیٹی اور

سبکیٹ کمیٹی میں بحث اور سرگرمی نیز جمعیتہ العلماء سے ایک گونہ بیزاری و تنکدر کا

پتہ چلتا ہے۔ ایک اور خط سے جو اپنے سید الدین صاحب بہاری کے جواب میں انہیں لکھا ہے آپ کا سلسلہ ۱۹۴۴ء تک جمعیت سے منسلک رہنے اور سلسلہ ۱۹۴۵ء میں اس کی رکنیت سے علیحدہ ہو جانے کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

” میں کچھ مدت سے خلیفۃ العلماء دہلی سے علیحدہ ہو چکا ہوں اور سہارنپور

سیشن کے بعد ادھر سے جو رکنیت کی دعوت دی گئی تھی میں نے لکھ دیا تھا

کہ اب میں اس کا رکن بننا پسند نہیں کرتا۔“ (مراسلات سیاسیہ ص ۱۰)

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۴۴ء کے آخر تک علامہ جمعیت العلماء کے رکن رکن کی حیثیت سے رہے اور آپ نے جمعیت کی زبردست خدمات کیں۔ ضرورت ہے کہ جمعیت العلماء ہند کے دفتر سے ان تمام تجاویز اور تقاریر کا ریکارڈ حاصل کر کے ان کے سوانح زندگی کا جز بنایا جائے، اسید اللہ انشا اللہ اس کے لئے قدرت کبھی موقع عطا فرمائے گی۔ ہم سر دست علامہ کی سیاست کے اس دور کو ۱۹۴۴ء پر ختم کرتے ہیں اور دیگر حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ البتہ ۱۹۴۵ء کے بعد کے سیاسی دور اور تعمیر پاکستان کی خدمات جلیلہ کے دور کا آئندہ اوراق میں انشا اللہ تعالیٰ نئے عنوان سے ذکر کریں گے۔ البتہ اس دور کی سیاست سے متعلق جو جمعیت العلماء سے وابستگی اور ۱۹۴۴ء تک سے متعلق ہے کچھ مزید معلومات آپ کو ہماری کتاب ”تجلیات عثمانی“ میں ملیں گی۔ وہاں مطالعہ فرمائیے۔

پھر دارالعلوم کی طرف

منتشر کارنامے

تصفیہ عقائد و مسائل | آپ کی سیاسیات، اسلام پر حملہ آوروں کے مقابلہ میں مدافعانہ کوششیں، دارالعلوم کی دلچسپی، درس و تدریس کا سلسلہ اور اس پر القاسم کی تحریری مساعی کوئی معمولی خدمات نہ تھیں۔

مدافعانہ مساعی میں آپ کی ایک کوشش یہ رہی کہ آپ کے دور اور اس سے ذرا پہلے کے زمانہ میں ایک سلسلہ یہ چل نکلا اور بعض عقل کے بندوں نے یہ روش اختیار کی کہ جو چیز ہماری عقل میں نہ آئے وہ اسلام کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ ان کو عقل ربی عقل کے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ انہوں نے معجزات کا ہی قطعاً انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں علامہ کے مضامین العقل والنقل نے ہندوستان میں غلط فہمی برپا کر دیا۔ حتیٰ کہ جب آپ کے اس مضمون کی قسط کو القاسم میں چھپنے سے دیر ہو جاتی تو القاسم کے قارئین کی طرف سے تقاضے ہوتے۔ آپ نے اس مضمون میں نہایت عالمانہ، فلسفیانہ اور سلیجے ہوئے پیرائے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی مخالفت نہیں ہو سکتی۔

خطبہ جمعہ عربی میں | جمعیت الانصار کے زمانہ میں خواجہ عبدالحی صاحب جو کہ درجہ تکمیل دارالعلوم کے طالب علم تھے اور بعد ازاں جامعہ ملیہ کے پروفیسر اور اب اسلامیہ کالج لاہور میں سیاسیات کے لے جب ہم اگست ۱۹۶۷ء میں اس کتاب پر نظر ثانی کر رہے تھے تو خواجہ صاحب (بقیہ سہ صفحہ پر)

لیکچر رہیں ان کو خیال پیدا ہوا کہ جمعہ کا خطبہ اپنی زبان میں ہونا چاہیے۔ یہ بات اور کہاں، دارالعلوم میں گونجی۔ حضرت عثمانی نے اس خیال کی تردید میں خطبہ جمعہ عربی زبان میں ہونے پر ذیقعدہ ۱۳۲۶ھ میں زبردست فتویٰ لکھا۔ جو مذکورہ ماہ و سنہ کے القاسم میں چھپا۔ جس پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب وغیرہم کے تائیدی دستخط ہیں۔ اس تحریک کے کچھ عرصہ بعد بقول خواجہ صاحب جیسا کہ انہوں نے مجھے تفصیلات بتائیں موصوف عثمانی شملہ کسی جلسے میں پہنچے تھے۔ اتفاق سے خواجہ صاحب کا بھی شملہ جانا ہوا۔ مولانا مبین صاحب دیوبندی جو وہاں خطیب تھے ان سے خواجہ صاحب نے خطبہ جمعہ کے متعلق تقریر کرنے کی درخواست کی لیکن انہوں نے جواب میں کہا کہ مولانا عثمانی یہاں آئے ہوئے ہیں لہذا یہ تقریر مناسب نہیں۔ بہر مذکورہ مضمون اسی سلسلے میں لکھا گیا۔

ایک اور اہم مسئلہ! | دارالعلوم کے ایک قدیم تعلیم یافتہ فاضل نے علامہ کو خط لکھا کہ کتنے مسائل ایسے ہیں کہ جن میں ائمہ کا سخت اختلاف ہو مثلاً

امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو امام اعظم منع فرماتے ہیں اور امام شافعی پڑھنے کا حکم دیتے ہیں تو کیا یہ مختلف اجتہادات سب کے سب صحیح ہیں یا حق ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ اس پر آپ کا ایک زبردست مضمون ہدیہ سنیہ

کے نام سے القاسم میں چھپا جو نہایت ہی محققانہ ہے۔ اس مضمون میں مسائل کے بعض دیگر سوالات پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضمون شوال ۱۳۳۶ھ کے القاسم میں طبع ہوا۔ اور ہم نے جو انوار عثمانی کے نام سے علامہ کے مکتوبات مرتب کر کے چھپوائے ہیں اس میں سب سے پہلا یہی مکتوب ہے۔ ملاحظہ ہو

انوار عثمانی مکتوبات علامہ شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کراچی
مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیاؤن خانہ مسجد۔ اب ہم حیات عثمانی پر ایک اور
نظر اگست ۱۹۶۲ء میں ڈال رہے ہیں جبکہ اس کی کتابت ہو رہی ہے۔

آیت صوم پر محققانہ تفسیر | القاسم کے دور میں امرتسر سے ایک پرچہ
تہذیب الاخلاق نکلتا شروع ہوا جس

میں ڈاکٹر صاحب (کیو رتھلوی) کا ایک مضمون نکلا جس میں: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامِ مَسْكِينٍ** کی تفسیر میں یہ
ظاہر کیا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں اور وہ روزہ نہ رکھنا چاہیں
تو مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ اس کے رد میں آپ نے ایک نہایت محققانہ
مضمون لکھا جس میں آیت مذکورہ کی صحیح تفسیر پیش کی اور لوگوں کے بگڑتے
ہوئے عقائد کو سنبھالا۔ یہ مضمون بھی القاسم کے ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ میں چھپا

دارالعلوم میں معزز مہانوں کی آمد | خوب یاد ہے کہ مولانا منظر الدین
شیر کوئی ایک دفعہ دیوبند شریف

لائے غالباً یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے اس سے پہلے آپ کے تعلقات دارالعلوم
اور متوسلین دارالعلوم سے بگڑ گئے تھے بہر حال آپ آئے اور نوادر میں آپ
نے تقریر کی۔ مولانا عثمانی نے ان کی تقریر کے جواب میں نہایت شستہ اور
شگفتہ تقریر فرمائی۔

۱۔ موجودہ نام جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن ہے۔ نجیب
۲۔ مذکورہ کتابت ادھوری رہ گئی اور کتاب کی طباعت التوار کا شمار ہو گئی، اب
مکتبہ دارالعلوم کراچی کے زیر انتظام اگست ۱۹۸۱ء میں دوبارہ کتابت شروع ہوئی پر نجیب

مولانا مدنی کی کراچی سے رہائی | خلافت کے زمانے میں غالباً ۱۹۲۱ء میں جب مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ دو سال قید فرنگ سے ۱۹۲۳ء میں واپس آئے تو دارالعلوم میں آپ کے لئے مولسری کے احاطے میں جلسہ ہوا۔ اسٹیج فودرہ کے برآمدے کے درمیانی دروازے پر بنائی گئی۔ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اپنے نرم لہجے میں مدبرانہ مگر مشفقانہ تقریر فرمائی۔ ان کے بعد مولانا عثمانی مرحوم جو انہی مقاصد کے لئے وکیل کل تھے تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا :

” اس میں شک نہیں کہ آپ کے ایام قید فرنگ میں ہم آپ سے وہ رابطہ قائم نہ رکھ سکے جو تعلقات کی بنا پر ہونا چاہئے تھا لیکن یہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی یاد سے ایک گونہ ہمارے دل خالی نہیں رہے جس کا ثبوت مختلف مجالس میں آپ کے تذکرے دیں گے جن میں آپ کی یاد رہی۔ میں نہایت احتیاط سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کے سامنے میں ایسی کوئی بات کہنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں کہ جس کا وجود میرے دل میں تو نہ تھا اور شیطانی وسوسے سے دھوکا کھا کر مبالغہ آمیز رنگ میں آپ کی جدائی میں بیقراری اور دل فکاری کے لفظوں سے یاد کر دے جو حقیقت کے خلاف ہی نہیں بلکہ دیانت و امانت کے بھی خلاف ہے۔“
(شہیدہ راقم الحروف)

اس موقع پر علامہ نے نہایت صاف اور حق پرزورہ الفاظ میں لیکن دوستانہ و رابطہ کے مناسب الفاظ میں وہ زبردست تقریر کی کہ مجھ پھر تک اٹھا۔ یہ وہ دور تھا کہ دارالعلوم میں مولانا عثمانی کا طوطی بول رہا تھا۔ بعد ازاں

مولانا مدنی کے اعزاز میں مہتمم صاحب اور طلبہ نے پارٹیاں دیں۔ خوب یاد ہے کہ ان پارٹیوں میں ہمارے محترم دوست مولانا حامد لالا نصاری غازی اور مولوی آفاق احمد سکروی نے مدحیہ قصیدے پڑھے تھے۔ علامہ عثمانی بھی ان پارٹیوں میں خصوصیت سے بلائے جاتے تھے۔

مولانا شیروانی اور حضرت عثمانی | مولانا حبیب الرحمن صاحب شیروانی دارالعلوم کے ممبر ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم

میں آیا جایا کرتے اور نورے میں ان کی تقریر ہوتی تو مولانا حبیب الرحمن صاحب تو مہتممانہ تقریریں کرتے لیکن شیروانی مرحوم کی تقریروں کا حق گوئی کے انداز میں سلجھا ہوا منطقانہ اور محققانہ جواب آپ ہی دیتے۔

سرمحمد شفیع کی دارالعلوم میں آمد اور تقریر، علامہ عثمانی کی جوابی تقریر | ایک دفعہ غالباً ۱۹۲۳ء میں خلافت کے ہنگامے کے فرو ہو جانے کے بعد سرمحمد شفیع دارالعلوم میں تشریف لائے اور

آپ نے اپنی تقریر میں کہا کہ خلافت کے زمانے میں دارالعلوم نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تو مولانا حبیب الرحمن صاحب کی تقریر کے بعد علامہ نے تقریر فرمائی، اور فرمایا :-

”جب دنیا میں سیلاب آتے ہیں تو اس کے بہاؤ میں شیرازہ ہے، سانپ اور دوسرے جانور سب بہ چلے جاتے ہیں۔ اس طوفان میں کسی کارکن دشوار ہی نہیں بلکہ اس وقت جانوروں کا بچنا بھی دشوار ہو جاتا ہے اسی طرح خلافت کا ایک سیلاب اٹھا جس میں ہندوستان کے مسلمان بہ نکلے۔ دارالعلوم جو مسلمانان ہندوستان کی واحد مذہبی نمائندہ درگاہ ہے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس مذہبی مسئلہ سے متاثر نہ ہوتی۔ اُس فیرو

ہے کہ دارالعلوم ہمیشہ اعتدال کے درجے سے کبھی اپنا قدم آگے نہیں بٹھاتا
چنانچہ اس موقع پر بھی اس کے لئے جب چارہ نہوا تو اس نے اپنے فرائض
کی ادائیگی میں اعتدال کا درجہ اتھکے سے چھوڑا۔

علامہ نے کچھ ایسی مرعوب کن اور مدلل تقریر فرمائی کہ سر شفیق صورت حال
سے سخت متاثر ہوئے اور فاضل مقرر کی معقول باتوں کو تسلیم کرتے ہی نبی یاد
ہے کہ سر موصوف نے دارالعلوم کو سو روپیہ بطور چندہ عنایت فرمایا جس پر مولانا
حبیب الرحمن صاحب نے اپنے مدبرانہ الفاظ میں فرمایا تھا کہ یہ سو روپیہ ہمیں
ہزاروں کی برابر ہیں۔

دارالعلوم میں ایک انجمن ”جمعۃ الطالبہ“
جمعۃ الطالبہ اور علامہ عثمانی تھی جس میں تقریریں، مناظرے اور مساجحے

ہوتے تھے۔ میں نے بھی ایک دفعہ تقریر میں دوسرے نمبر کا انعام لیا تھا۔ اس
انجمن میں عموماً ایسے ہی طلبہ حصہ لیتے تھے جو تقریر کر سکتے یا مضمون لکھ سکتے۔ میرے
زمانے سے پہلے بھی اور میرے عہد طالب علمی بھی حضرت عثمانی ہی طلبہ کو تقریروں
اور تحریروں کے نشیب و فراز اور اصول و ضوابط کی تعلیم و تربیت دیتے جن طلبہ
میں تقریر و تحریر کا فطری جوہر ہوتا تو وہ علامہ کی طرف رجوع کرتے یا جمعیت کی
شکل میں مولانا ان کی رہبری فرماتے۔ اس مقصد کے لئے سب تک آپ
دارالعلوم میں رہے آپ ہی کو موزوں ترین سمجھا جاتا۔

مولانا حفظ الرحمن سیواری | میرے دور طالب علمی میں مولانا
حفظ الرحمن صاحب سیواری دارالعلوم
علامہ کی زیر تربیت ہیں داخل ہوئے غالباً یہ ۱۳۴۰ھ

مطابق ۱۹۲۲ء کا سال تھا۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب بدو فطرت سے

شعلہ مقال مقرر اور گلبار انشا نگار تھے۔ خلافت میں خوب حصہ لیتے رہے۔ اسی عہد میں وہ دیوبند کے مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے اس لئے آتے ہی چمک اٹھے۔ اور بڑے بڑے اساتذہ کے یہاں اپنا ربط ضبط قائم کر لیا۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب اور مولانا عثمانی کے یہاں کافی آمد و رفت تھی۔ یہ دونوں حضرات بھی شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بہر حال مولانا سیوہاری نے جمعیت الطالبین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چندا اور طلبہ بھی ان کے ساتھ ہو گئے جن میں سے غالباً مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا محمد یحییٰ تھانوی، مولوی انیس احمد صاحب کاندھلوی مرحوم برادر خورد مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مولوی عبد البصیر صاحب سیوہاری مرحوم۔ یہ چاروں پانچوں مقابلے میں بعض اوقات تقریریں کرتے اور حضرت مولانا عثمانی ان کے سرپرست اور جج بنتے۔ خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ نودہ میں سب کی تقریریں ہوئیں اور مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تقریر کو مولانا عثمانی نے بہت پسند فرمایا۔ ایک دفعہ علامہ نے نودہ سے کی چھت پر ان حضرات کی انجمن میں فصاحت و بلاغت پر تقریر فرمائی۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور وہاں خوب ہوا کا لطف آتا تھا۔

خطابت جمعہ | میرے عہد طالب علمی میں جمعہ کا خطبہ شہر کی عالیشان جامع مسجد میں مولانا عثمانی ہی دیتے تھے اور نماز بھی وہی پڑھاتے تھے۔ چیلنے میں ایک دو دفعہ جامع مسجد میں آپ کی تقریر بھی ہوئی شہر والے اگرچہ مدرسہ والوں کے عموماً مخالف رہتے لیکن مولانا عثمانی سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

جمعہ کے بعد مہتمم مولانا حبیب الرحمن،
 کی کوٹھی میں اجتماع اور علامہ عثمانی کی تقریر

جمعہ کی نماز کے بعد اکثر اساتذہ
 دارالعلوم مولانا حبیب الرحمن
 صاحب کی کوٹھی پر جو دفتر ہتمام

تھی جمع ہوتے ان میں مولانا عثمانی ضرور ہوتے۔ علمی مسائل کا چرچا ہوتا
 آپ اپنا اظہار خیال کرتے اور نہایت دل فریب، دل پذیر اور اثر انگیز کلام
 کرتے۔ چائے کا دور چلتا اور یہ مجمع عصر تک جمارہتا۔ ہر جمعہ کو یہی صورت
 ہوتی تھی۔

شیخ الہند کے مکان پر ہفتہ
 بعد نماز جمعہ درس قرآن

غالباً ۱۹۲۲ء میں آپ نے حضرت
 شیخ الہند کے دولت گز پر ہفتہ وار
 بعد نماز جمعہ درس قرآن کریم جاری کیا

مگر یہ زیادہ دیر جاری نہ رہا۔ لیکن جو کچھ آپ نے لیکچر دئے وہ آپ کی شان
 تفسیری کا بہترین نمونہ تھے۔

طلبہ کو مناظرے کی تربیت دیتے اور اہم مسائل پر تقریریں فرماتے۔ ایک
 دفعہ نو درہ کی درس گاہ میں ”اعجاز قرآنی“ پر کئی لیکچر دئے۔ یہ تقریریں ”اعجاز
 القرآن“ کے نام سے رسالہ کی شکل میں چھپی ہوئی ہیں۔

قتل مرتد پر آپ نے ایک دن ایک رات میں ایک رسالہ لکھا جو ”الشہادۃ
 کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ رسالہ جلد چھپ کر تیار ہوا اور دو تین رسالوں
 کی طلائی جلدیں تیار کر کے شاہ افغانستان امان اللہ خاں کے پاس
 روانہ کی گئیں۔

علامہ عثمانی سے ایک ہندو
 جوگی کا دارالعلوم میں مکالمہ

ایک دفعہ ایک جوگی لٹے بھرے ہاتھ
 میں چٹا، سر برہنہ دارالعلوم میں آیا

اور یہاں آکر علامہ عثمانی سے تباہ خیال کیا۔ جوگی تھا ہندو مذہب کا عالم۔ کتب خانے کے اس بالائی کمرے میں دونوں کی گفتگو ہوئی جو مطبع کے قریب صحن کی طرف بھی کھلتا تھا۔ علامہ نے جوگی کو خاموش کر دیا۔

سفر موگا غالباً ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں موگا تشریف لے گئے۔ وہاں کا ڈاکٹر متھرا داس آنکھیں بنانے میں بہت مشہور تھا۔ آپ کی اس نے بہت قدر کی اور آپ سے وہ بہت متاثر ہوا پھر آپ سے ملنے دیوبند بھی آیا۔ جب آپ ہو گئے سے تشریف لائے تو طلبہ دارالعلوم آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے۔ بہت شاندار استقبال ہوا۔ میں بھی شریک استقبال تھا۔

سفر حجاز

اور مؤتمر مکہ میں شرکت

۱۲۲۳ھ مطابق ۱۹۲۶ء

علامہ عثمانی کے پہلے سفر حج کا ذکر آچکا ہے۔ دوسری مرتبہ آپ میرے قیام دیوبند کے زمانے میں حجاز تشریف لے گئے۔

اس سفر کا پس منظر یہ ہے کہ جب جنگ عظیم میں شریف مکہ نے جو اس وقت ترکوں کی طرف سے والی مکہ معظمہ تھا، ان سے غداری کی تو انگریزوں نے شریف حسین کو حجاز کی عنان حکومت دیدی۔ ترک تمام عرب سے بے دخل ہو چکے تھے۔ سرزمین حجاز پر بظاہر شریف حسین لیکن بیاطن انگریزوں کا اقتدار تھا کہ قدرت نے نجد کے سلطان ابن سعود کو کھڑا کیا اور وہ طوفان بکریلیخا کر تاپوا پہنچا اور اس نے حجاز پر اپنا تسلط جمالیا اور شریف مکہ کو اس کی غداری کا صلہ

مل گیا۔ ترکوں سے نمک حرامی جلد ہی رنگ لائی۔
 دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را،
 چندیں اماں نداد کہ شبِ راسخ کند

لیکن ابن سعود حنبلی مذہب تھے۔ عبدالوہاب نجدی کے ہم مشرب تھے کہ وہ بھی حنبلی تھا۔ انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی خدمت کا چارج لیتے ہی مآثر حجاز کو منہدم کر دیا۔ صحابہؓ کے تمام پنجہ مزارات کو پیوست زمین کر دیا، قبروں کا نام و نشان نہ چھوڑا۔ البتہ کچھ قبریں نشانی کے طور پر رہنے دیں۔ ترکوں نے تقریباً تمام متبرک اور محترم (شخصیتوں کی) قبروں پر قبے بنوائے تھے، اور ان پر ان کے نام بھی کندہ کر دئے تھے لیکن سب کو صاف کر دیا گیا جنگِ اُحد کے شہداء یا مخصوص امیر حمزہ رضی اللہ عنہم کی قبریں ہموار حالت میں ہیں۔ جو میں نے اپنی آنکھوں سے ۱۹۶۵ء میں دیکھی ہیں۔ اب چاروں طرف صرف پتھروں کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں۔ جنت البقیع میں بھی مزارات کا یہی حال ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام کے فرزند یہاں اگر قبروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ لہذا ان مآثر ہی کو اڑا دیا۔ ایسا کرنے سے دنیا سے اسلام میں ہیجان پھیل گیا اور مشرق سے لیکر مغرب تک اضطراب اور جوش و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاج کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں سلطان ابن سعود نے مالک اسلام سے تبادلہ خیال کے لئے ایک مؤتمر (اجتماع) منعقد کیا۔ جس میں ہندوستان، کابل، مصر، شام، حجاز، روس وغیرہ کے علماء کو دعوت دی گئی۔ ہندوستان سے بھی علماء بلائے گئے۔ چنانچہ جمعیت العلمائے ہند دہلی کی طرف سے علامہ

امام غالباً محترم مصنف کو سہو ہو گیا ہے۔ مصلح موصوف محمد بن عبدالوہاب تھے۔ جو اگرچہ اصولی طور پر حنبلی تھے مگر انہوں نے ایک جدید مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی۔ نجیب

شہیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا عبدالحکیم صاحب صدیقی، اور خلافت کھٹھی کی طرف سے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا سید سلیمان ندوی، شوال ۱۳۵۳ھ مطابق مئی ۱۹۳۲ء میں ہندوستان سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔

علامہ کی ڈائری | اس سفر میں آپ کے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری تھی یہ ڈائری مجھے کراچی میں آپ کے چھوٹے بھائی بابو فضل حق عثمانی سے ملی۔ اس میں علامہ نے اپنے حالات سفر و موثر لکھے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس اس کی بعینہ ولفظ نقل موجود ہے۔

اس ڈائری کے پہلے صفحے پر علامہ نے ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے جو اس سفر میں آپ اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ کتابیں حسب ذیل ہیں :-

۱۔ از مبصر فتح المہم شرح مسلم از ابتداء تا آخر ما بیض (یہ آپ کی فتح المہم شرح مسلم کا مسودہ ہے جو آپ لکھ رہے تھے، غالباً اس سفر میں بعض علماء کو دکھانا اور سنانا ہوگا۔ یا سفر میں شرح لکھنا مقصود ہوگا۔ انوار)

۲۔ حائل شریف مترجمہ شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ (تلاوت کیلئے ہوگی)۔

۳۔ رسالہ الکفار المحدثین (مصنفہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب)

۴۔ حجة اللہ البالغہ (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب)

۵۔ العرف الشذی (تقریر مطبوعہ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب)

۶۔ آثار السنن علامہ نیموی (بہار)

۷۔ مفتاح الصعیمین

۸۔ کلید خزائن قرآنی

۹۔ تبویب القرآن

- ۱۰۔ مفردات امام راغب۔
- ۱۱۔ الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوبائیۃ النجدیۃ۔
- ۱۲۔ البطار المنن۔

ڈائری کے دوسرے صفحے پر لکھا ہے ”جنید کے مسلمانوں کے لئے دعا۔
مولوی محمد محسن صاحب“ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست جنید پنجاب
میں سکھوں کی ریاست ہے ان کے مسلمان ان دنوں مظلوم ہوں گے۔ اور مولوی
محسن صاحب نے آپ سے مقامات مقدسہ میں دعا کے لئے عرض کیا ہوگا۔

آپ مئی ۱۹۲۷ء کے پہلے ہفتے میں دیوبند سے
حجاز کے لئے مئی ۱۹۲۷ء میں
دیوبند سے دہلی
دہلی پہنچے تو پانچویں صفحہ پر ڈائری میں اس طرح حساب درج کیا ہے۔

شبیر احمد

محکمٹ از دیوبند تا دہلی عمر (۵ - ۹ - ۱)

ٹانگہ و قلی وغیرہ متفرقات ۱۳

جوتا از دہلی عمر (۵ - ۱۱ - ۳)

سلیپر عمر (۵ - ۱۵ - ۱)

جائے نماز عمر (۵ - ۶ - ۱) صفحہ ۲

۱۲ مئی ۱۹۲۷ء کو بمبئی میں عظیم الشان
جلسہ اور علامہ کی صدارت
ایک دو روز دہلی قیام فرما کر
مفتی کفایت اللہ صاحب کے
ہمراہ آپ ۸ یا ۹ مئی کو بمبئی
روانہ ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ ۱۲ مئی کو علامہ کی زیر صدارت بمبئی میں ایک

عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس کا ذکر آپ نے اپنی ڈائری میں صفحہ ۱۳ پر حسب ذیل الفاظ میں فرمایا ہے:-

” ۱۲ مئی کی شب میں بندہ کی صدارت میں بمبئی میں جلسہ ہوا۔ اجتماع

بہت تھا اور جلسہ نہایت شاندار اور موثر رہا۔ اثنائے راہ میں گود ہو

دو حد اور سورت سے بڑے جوش کے ساتھ لوگ خدا حافظ کہنے کو آئے۔“

اس عبارت سے علامہ کی اس عظمت کا پتہ چلتا ہے جو جلسہ کی صدارت کی

صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی کہ بمبئی اور سورت کے لوگ آپ کو بکثرت

الوداع کہنے کو آئے۔

بمبئی جوان دنوں خلافت کا مرکز تھا وہاں سے

مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ صاحب

حجاز کو روانگی اور ورود

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی ۱۲ مئی کے بعد

مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے غالباً یہ ذیقعدہ کا ابتدائی مہینہ ہوگا یا شوال کا آخری

ہفتہ۔ بہر حال ان تاریخوں میں یہ وفد مکہ معظمہ پہنچ گیا۔

یہ وفد مکہ معظمہ پہنچا اور ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ

مطابق مئی ۱۹۲۳ء سے موتہ کی کارروائی

شروع ہوئی جن مسائل پر آپ نے تقریریں

آغاز موتہ اور علامہ کی تقریریں

از ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ

فرمائیں اور جو وہاں کا مرکز خیال تھا وہ مآثر شریفہ، انہدام قبائلی ملاقات

صحابہ وغیرہم، غلاف کعبہ، اخراج نصاریٰ از جزیرۃ العرب کے مسائل تھے۔

ہم نے ان مسائل سے متعلق علامہ کی تقریریں ”تجلیات عثمانی“ میں درج کی ہیں

ملاحظہ فرمائی جائیں۔ اور ستمبر ۱۹۲۳ء میں علامہ عثمانی کے خطبات جو نظر

پاکستان سے متعلق ہیں ناچیز نے مرتب کئے ہیں جن میں علامہ کی موتہ مکہ کی

تقریریں لفظ بلفظ ہم نے درج کر دی ہیں اور جو چھپ کر مکمل ہو گئے ہیں۔
بہر حال اب مؤتمر کارروائی خود علامہ کی زبانی سنئے۔ ڈائری میں لکھتے ہیں:

۱۳ رذی القعدہ (۱۳۴۳ھ) کو سید

رشید رضا مصری ہمارے یہاں بغرض

ملاقات آئے۔ اور ساڑھے تین بجے عربی

امیر ابن سعود سے ملاقات
اور علامہ کی پہلی تقریر

ثام سے دونوں وفدوں کو موٹروں پر سوار کر کے امیر ابن سعود کے پاس

لے گئے۔ اور اس سے بیشتر امیر کی طرف سے پیغام آیا کہ آپ لوگ کس وقت

ملاقات پسند کرتے ہیں۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ (دور ویر سپاہی پہرہ دے

رہے تھے۔ امیر کے نمائندوں نے دروازہ پر استقبال کیا۔ امیر ابن سعود

نے سب سے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور دعائیہ کلمات کہتے رہے۔ پھر رسمی

الفاظ شکریہ وغیرہ کے کہے۔ پھر سید سلیمان ندوی نے تقریر کی جس میں زیادہ تر

زور اس پر تھا کہ ہم عرب سے اثر اجانب و اغیار کا ہٹانا چاہتے ہیں۔

درمیان میں شوکت علی محمد علی کی کچھ ترجمانی کرتے رہے جس میں جیل وغیرہ

کا ذکر تھا۔ بعدہ مولوی عبدالحکیم صدیقی نے تقریر کی بعدہ بندہ نے

ایک ملبسوط تقریر کی جس میں ان کے مکارم اخلاق اور اکرام ضیف کو بیٹا

کر کے اپنی جماعت دیوبند اور اپنے مسلک کی تصریح کر کے کتاب اللہ

اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زور دیا۔ (ڈائری ص ۱۱۱)

حق گوئی و بیباکی
مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلی ملاقات

میں آپ نے اپنے عقائد اور جماعت کے مسلک کا ذکر

کرنا مناسب سمجھا۔ بعد ازاں تقریر کے آخر میں حق گوئی اور بے باکی اور اظہار

خیال میں آزادی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

”پس جبکہ آپ نے ہم کو شرف بخشا اور خود دعوت دی تو ضرور ہے کہ ہم صاف صاف مشورہ دیں۔ خیانت نہ کریں، ہم جھوٹ نہیں کہیں گے اور نہ اپنے بواطن امور کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ صاف مشورہ دیں گے اگر آپ قبول کریں گے فہما و نعت، رد کردیں گے تو ہم اپنے گھر واپس چلے جاتیں گے۔ لیکن بحول اللہ و قوتہ اپنا فرض ادا کر کے جاتیں گے“ (ڈائری صفحہ ۱۶)

موصوف کے ان جملوں میں علمائے حق کی سی بے باکی اور جرأت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ آپ تقریر کے بعد سلطان نے تقریر کی جس میں توحید پر زور اور شرک و بدعات کا رد تھا اور اس طرف اشارہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے کافر کہا ہے کہ وہ اپنے انبیاء کی قبروں کو پوجتے اور سجے کرتے ہیں اور ان کو خدا کہتے ہیں لہذا وہ مسلمان جو قبروں کو سجدہ کرتے ہیں وہ بھی اسی ضمن میں شامل ہیں۔ اتنا لکھنے کے بعد علامہ لکھتے ہیں کہ اس پر بندہ نے پھر تقریر کی اور مسلمان قبر پرستوں اور یہود و نصاریٰ میں فرق بتایا جو تجلیات میں موجود ہے۔

علامہ کی اس تقریر سے سلطان ابن سعود پر بہت اچھا اثر ہوا اور انہوں نے آپ کی تقریر کو سراہا، حضرت عثمانی لکھتے ہیں :-

”بعدہ امیر نے کہا میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے خیالات اور

بیان میں بہت رفعت اور علو ہے اور دقیق مسائل پر مشتمل ہے“

پہلی مجلس جب ختم ہو گئی تو سب باہر نکلے۔ علامہ لکھتے ہیں :-

علامہ کا عتیقی کی طرف سے حق گوئی پر شکریہ
اور سید سلیمان کی طرف سے تحسین

” اس گفتگو میں علاوہ ذیلین
(جمعیت العلماء و خلافت) کے
عبد العزیز عتیقی اور حافظ ڈیہرہ

وغیرہ بھی تھے ۔ باہر نکل کر عتیقی نے میرا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے نہایت
صراحت سے خیالات ظاہر کئے ۔ سید سلیمان ندوی نے کہا کہ تو نے اپنا فرض
بے خوف و خطر ادا کیا ۔ والحمد للہ علی ذالک حمداً کثیراً ۔ سب مجمع کو خوشی ہوئی ۔
اس ملاقات کی اجمالی کیفیت ام القرنی مورخہ ۱۶ ذوالقعدہ ۱۳۴۴ھ
میں چھپی ۔ ۱۶ ذوالقعدہ کو جو ہمارے رویت ہلال کے موافق ۱۵ تھی ۔ شیخ
عبد العزیز عتیقی نے بیان کیا کہ جلالتہ الملک تقریروں سے بہت خوش ہوتے
ہیں ۔ شبیر احمد عثمانی کی تقریر سے بہت محظوظ اور متاثر ہوئے اور اپنے
بعض علماء اور اصحاب رائے و فکر سے بعض اجزائے تقریر نقل کئے ؟
(ص ۲۳ و ۲۵ تا ۲۷)

اس پہلی مجلس کے بعد کا حال علامہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں :-
” ۱۶ ذوالقعدہ) کو مبادی مؤتمر طے کرنے کے لئے ایک لجنہ مخیرہ
قائم ہوئی ۔ جمعیت کی طرف سے مولانا کفایت اللہ صاحب اس میں تشریف
لے گئے اور خلافت کی طرف سے سید سلیمان ۔ یہ جلسہ سید رشید رضا کی
قیامگاہ پر ہوا ۔ رشید رضا صاحب نے ایک یادداشت پیش کی کہ اس پر
ابھی مباحثہ ہوگا ۔

دو روز علماء کا اجتماع ہوا ۔ پہلے دن سلطان بھی شریک رہے مگر
مجلس میں بدترکی ہوئی ۔ دوسرے روز سب کاموں کا فیصلہ مؤتمر دیکھا گیا ؟

اس دوران کی کارروائی کے بعد علامہ آگے چل کر ایک اور سٹنگ کا ذکر کرتے ہیں، جس میں انہوں نے شرکت فرمائی۔

۲۵۔ ردوالقصہ کو دوسرے کے وقت

سلطان نے جمعیت العلماء کا وفد بلایا۔

اول سلطان نے کچھ تقریر کی پھر وہ

سلطان اور مولانا کفایت اللہ
صاحب کی گفتگو کریں

کفایت اللہ صاحب نے مبسوط تقریر فرمائی۔ جس میں مآثر و مقابہ کے متعلق تشدد ترک کرنے کے متعلق فرمایا۔ اس کے بعد بندہ نے کہا کہ میں تین روز سے محموم (بخار زدہ) اور وجہان (دردمند) تھا۔ مگر مسئلہ ہم ہے جس کی فحاشی شان کی وجہ سے کچھ کہنا ضرور ہے۔

پہلے ہم آپ کی عتایوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں
میم قلب سے اور اللہ دلوں کے حال کو جانتا ہے
ہم مشکلفین میں سے نہیں اور نہ میں مذاق سیاست

علامہ عثمانی کی شاہ کے
سامنے ایک اور تقریر

اور رجال سیاست میں سے ہوں۔ میں ملکیت اور جمہوریت کے قصہ سے تعرض نہیں کرنا چاہتا کہ دوسرے لوگ جو اس کے اہل ہیں وہ آپ سے اس میں کلام کریں گے۔ ہمارا مشغلہ تعلیم و تدریس ہے۔ ہم کو جن چیزوں سے تعلق ہے ان کو ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان میں ہمیں جو خبر پہنچی کہ آپ بلاد مقدسہ میں فاتحہ داخل ہوئے اور اسی کے ساتھ یہ بشارت بھی کہ شریف حسین کے ذمائم اور قبائح سے یہ سرزمین پاک ہو گئی جیسا کہ مجھ سے پہلے شیخ رئیس الوفند نے بیان کیا۔ ہم کو یہ بشارت بھی ملی کہ حجاز کے راستے مامون ہو گئے اور حجاج وزائرن کے لئے کوئی کھٹکا نہیں رہا تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مگر ہمارے نزدیک

سب سے عظیم بشارت جس نے ہمارے قانون کو کھٹکھٹایا وہ یہ تھی کہ ایک بادشاہ خصوصاً ان بلاد مقدسہ میں جو مہد اسلام ہیں اور جن سے ہدایت کے چستے پھوٹے ہیں یہ پکارتا ہے کہ ہمارا قانون صرف کتاب و سنت ہے وہ صرف اسی کی طرف دعوت دیتا ہے اور اسی کو ہر معاملے میں حکم ٹھہراتا ہے تو یہ آواز ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عزیز اور محبوب اور اس زمانے میں سب سے زائد نالہ آواز تھی۔ بسیط ارض پر آج کوئی ملک (اور مسلمان بایضا ہمت نہیں جو یہ اعلان کرے کہ ہم یورپ اور انسانوں کے بنائے ہوئے اور تراشے ہوئے قوانین کی جگہ صرف کتاب و سنت کو دستور العمل بناتے ہیں۔ صرف آپ کی طرف سے ہم نے یہ آواز سنی اس لئے آپ کے ساتھ کلام کرنا ہمیں سہل ہوا۔ جو شخص ہوا پر چلے اور ہوا پر بیٹھے اور ہوا پر کھڑا ہو اس سے کوئی معقول بات کہنا بیکار ہے لیکن ہمارے اور آپ کے درمیان اگر نزاع ہو تو خدا کے فضل سے ایک مسلم حکم موجود ہے اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلعہ ہے ۴ (صفحات ڈائری نمبر ۲۳۲)

اس تقریر کے بعد علامہ نے قبر پرست، قیروں پر چڑھاؤ کرنے والے مسلمانوں کے بدعتی ہونے لیکن کافر نہ ہونے پر مدلل بحث کی جو تجلیات عثمانی میں موجود ہے۔ البتہ مذکورہ بالا تقریر تجلیات میں موجود نہیں جو ہم نے یہاں نقل کی ہے۔ اس بیان میں موصوف نے نہایت بے باکی مگر قدر مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعلیٰ درجہ کی حق گوئی سے کام لیا ہے۔ نیز قانون اسلامی کے حجاز میں رواج دینے پر نہایت ہی مسرت کا اظہار کیا ہے۔

علامہ نے سلطان ابن سعود کے سامنے ان کے منبلی ہونے پر جو روشنی ڈالی ہے وہ ان الفاظ سے واضح ہے نیسر

نجدی حنبلی ہیں

ائمہ اربعہ میں ایک دوسرے کے اجتہاد پر قویٰ دینے اور بعض مسائل میں ایک دوسرے کے اجتہاد پر عمل کرنے کا حسب ذیل عبارت میں اظہار فرمایا ہے جس کا ہم نے تجلیات میں ذکر نہیں کیا۔ آپ نے سلطان سے فرمایا :-

علامہ عثمانی کا بیباکانہ اظہار خیال
اپنی حقیقت اور شاہ کی حقیقت پر تقریر

ہمارے یہاں یہ مشہور تھا کہ نجدی
تقلید کے دشمن اور اس کو شرک
سمجھتے ہیں اور ائمہ اربعہ کی کچھ

پرواہ نہیں کرتے لیکن ہم نے الهدیۃ السنیۃ میں شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بیٹے شیخ عبد اللہ کی تحریر پڑھی جس میں لکھا ہے کہ ہم اجتہاد کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ فروع و احکام میں ہم امام احمد بن حنبل کے متبع ہیں۔ آلایہ کہ کوئی نص علی صریح غیر مخصص معارض یا قویٰ سند یا قابل تاویل آجائے تو ہم احمد بن حنبل کا مذہب چھوڑ کر ائمہ اربعہ میں سے کسی کا قول اختیار کر لیتے ہیں۔ بہر حال ائمہ اربعہ کے دائرے سے باہر نہیں جاتے حتیٰ کہ حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کا قول طلاق ثلاث (تین طلاقوں) کے مسئلہ میں ہم نے اسی لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ائمہ اربعہ سے علیحدہ تھا۔

اگر آپ ایسے بنی ہیں تو ہم ٹھیک ٹھیک ایسے ہی حنفی ہیں۔ اور یہ حنبلیت ایسی ہے کہ مسلمانوں کا سواد اعظم یعنی مقلدین ائمہ اربعہ کے نزدیک چند محل طعن نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوگا تو اس شرذمہ قلیلہ (تھوڑی سی جماعت) کے نزدیک ہوگا جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتی ہے اور ہمارے یہاں اس کا نام غیر مقلدین کی جماعت ہے کیونکہ وہ اپنے کو ہر ایک امام کی تقلید سے علیحدہ کر لیتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تقلید ائمہ کو شرک

بتلاتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ یہ حقیقت زیادہ نمایاں اور اس سے
 زائد مشہور ہو جتنی کہ اب تک ہوئی ہے۔“ (صفحات ڈائری از ۳۸ تا ۴۰)
 اس عبارت میں حضرت عثمانی نے بڑی لطیف تبلیغ کی ہے یعنی عبدالوہاب نجدی
 کے بیٹے عبداللہ کی تحریر کو حجت بنا کر سلطان ابن سعود کے لئے حنبلی ہونے اور تقلید
 پیروی کرنے کی طرف نفیس پیرائے میں اشارہ کیا ہے بلکہ یہ بھی فرما دیا ہے کہ آپ کو
 چاہئے کہ آپ اپنے مقلد ہونے کی شہرت دور دور تک پہنچائیں تاکہ لوگوں کی غلط فہمی
 دور ہو جائے کہ آپ غیر مقلد یا اہل حدیث ہیں۔

آئین جو ان سرداں حق گوئی و بیباکی
 اللہ کے مشیروں کو آتی نہیں رو بای

مذکورہ تقریر کے بعد موصوف نے قبروں کے گرا دینے اور مقامات مقدسہ
 کی زیارت کرنے، غلاف کعبہ اور تطہیر جزیرۃ العرب پر تقریریں فرمائیں، جو
 تجلیات میں درج ہیں۔

مجادلہ پراظہار خیال | حضرت عثمانی نے ۳۰ رذوالقعدہ کی ایک مجلس
 کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں فرمایا جو علمی تھی اور
 اس کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہوگا۔ کیونکہ آپ کی ہر نرم علم و فضل کی جتنی جاگتی
 تصویر ہوتی تھی۔ لکھتے ہیں:-

قاضی القضاۃ بلیہ کی ایک مجلس | ۳۰ رذوالقعدہ کو قاضی القضاۃ
 اور اشہر علمائے نجد عبداللہ بن بلیہ
 میں علامہ کی علمی موشگافیاں | نے مدعو کیا۔ دونوں وفد گئے۔ وہاں

فلسطینی وفد کے ارکان اور بعض دوسرے معززین بھی تھے۔ کوئی خاص

یہ بھی ایک عجیب تم نظریہ کہ یہ تحریک بانی کے باپ عبدالوہاب نجدی کے نام سے مشہور ہوئی حالانکہ حقیقت اس کے
 بانی عبدالوہاب نجدی کے بیٹے شیخ محمد (ابن عبدالوہاب) نجدی ہیں، عوام اہل بانی کے نام سے ہونڈنا آتا ہیں۔ اشفاق احمد

مسئلہ نہ تھا۔ مختلف مذاکرات ادبی و علمی رہے۔

مجادلہ کی مشرور عیت (جواز) پر میں نے قَدْ جَادَلْتُمَا فَا كَلَّمْتُمَا حِدَ الْمَنَادِ اے نوح! تو نے ہم سے جدال کیا اور بہت کیا، پیش کیا۔ اور امام ابو الحسن اشعری کے استدلال کا حوالہ دیا اور کہا کہ کہیں اکثر مجادلہ (بکثرت مجادلہ) کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم نوح علیہ السلام نے کفر و ضلالت میں تادمی (تجاوزی) کی اس لئے اکثر مجادلہ کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ دوسری جگہ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَ نَهَارًا اِلٰی آخِرِ الْاٰیَاتِ فرمایا۔ مجادلے کے معنی کسی مسئلہ یا معاملہ میں زور اور جہد کے ساتھ کے ساتھ کلام کرنا ہے کما فی قولہ تعالیٰ یُجَادِلُنَا فِیْ قُتُوْبِ لُوطٍ اِنَّ اِیْسٰہِیْمَ لَخٰلِیْمٌ اَوْ اَکْثَنِیْبٌ۔ یہاں مجادلہ کی ذم نہیں۔ نہ یہ مجادلہ فی آیات اللہ ہے۔ البتہ اس مجادلہ کے غیر مؤثر پر تنبیہ کر دی ہے۔ یٰ اِیْسٰہِیْمَ اَغْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّکَ قَدْ جِئْتَ اٰخِرَ دَبْطٍ ؟ (مر ۵۳-۵۴)

موصوف نے ۱۴ ذوالقعدہ سے ۳۰ ربیع الثانی تک کے حالات یہاں تک ختم کر دئے بعد ازاں لکھتے ہیں :-

” ۴ ذوالحجہ ۱۲۴۳ھ کو کھجنتہ الاقتراعات میں کسوۃ کعبہ (غلاف کعبہ) کا مسئلہ پیش ہوا کہ اس میں بہت اسراف ہوتا ہے۔ اس کے مصارف گھٹا کر دوسرے وجوہ خیر میں صرف کئے جائیں۔ حریر اور ذہب (ریشم) اور سونے کا استعمال بالاتفاق حرام ہے۔ اس پر محمد علی صاحب (جوہر) اور عبد اللہ شیبی نے سختی سے مخالفت کی ؟ صفحہ ۵۸-۵۹

اس کے بعد علامہ نے غلاف کعبہ کا تاریخی پس منظر بیان کر کے اس کے جواز

پرزبردست تقریر کی جو ”تجلیات“ اور ”خطبات عثمانی“ میں موجود ہے۔
 اور جس میں عبداللہ شیبی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی تردید کی۔
 اس کے بعد ۵ رذی الحجہ کی کارروائی کے متعلق حضرت عثمانی تحریر فرماتے
 ہوئے وضاحت کرتے ہیں :-

”۵ رذی الحجہ کو لجنۃ الاقتراحات میں بڑی رد و کم کے بعد جزیرۃ العرب
 کی تجویز پیش ہوئی اس کی مخالفت میں رئیس وفد روس نے طویل تقریر کی
 اس پر میں نے (تطہیر کے متعلق) تقریر کی“

آپ نے رئیس وفد روس کی تردید کی اور ثابت کیا کہ کم از کم جزیرۃ العرب
 نصاریٰ کے اخراج کا اعلان کریں۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ ان کو نکال باہر کریں۔
 چنانچہ اس کی تائید کی گئی۔ موصوف لکھتے ہیں :-

”شیخ قاضی ابوالعزائم نے اس کی بہت داد دی“

جناب مولانا عثمانی نے جزیرۃ عرب سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے جو مدلل
 تقریر فرمائی وہ بھی راقم الحروف نے تجلیات کے صفحہ ۳۸۰ پر بلقلم درج کی ہے
 وہاں ملاحظہ فرمائی جائے۔

۵ رذی الحجہ کی کارروائی کے بعد جو تطہیر جزیرۃ العرب سے متعلق تھی علامہ
 کی ڈائری ختم ہو گئی اور اس کے بعد آپ نے کچھ تحریریں فرمایا جس سے صاف
 واضح ہے کہ ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ سے ۵ رذی الحجہ تک مؤتمر کے جلسے ہوتے
 رہے اور بعد ازاں حج کے موقع پر جو ۸ رذی الحجہ سے ۱۲ رذی الحجہ تک پانچ روز
 ہوتے ہیں جلسے ختم ہو گئے۔

لہ لجنۃ الاقتراحات : وہ مجلس جس میں ریزولیشن اور تجاویز زیر غور پر مباحثہ و
 قدرج ہوتی تھی۔ انوار

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم جو خود اس میں شریک تھے، لکھتے ہیں :-
 ”مکہ میں موتمر کے جلسے ایک ماہ کے قریب ہوتے رہے۔ ان میں ہم
 لوگ شریک ہوتے رہے اور اکثر مولانا شبیر احمد صاحب بھی ہوتے تھے۔“

(معارف اپریل ۱۹۵۰ء ص ۳۰۲)

جائزہ | اب تک کی مولانا عثمانی کی ان تقریروں کا جو آپ نے موتمر مکہ
 میں کیے جائزہ لیا جائے اور محتاط تبصرہ کیا جائے تو یہ ہے:
 ۱۔ آپ کی تقریروں نے ابن سعود کو سخت متاثر کیا اور قبر پرست مسلمانوں
 اور یہود و نصاریٰ میں سلطان نے جو امتیاز قائم نہ رکھا تھا اس کو صحیح راہ
 دکھائی جس سے سلطان اپنے موقف سے ہٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور مولانا
 عثمانی کے سامنے ہتھیار ڈالتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ شیخ عبدالعزیز عتیقی اور حافظ وہبہ علامہ عثمانی کی تقریر پر داد دیتے
 نظر آتے ہیں۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی بھی اس تحسین میں ہمنا ہیں۔
 ۳۔ شیخ عبدالعزیز عتیقی کی روایت کے مطابق کہ انہوں نے کہا کہ سلطان
 مولانا عثمانی کی تقریروں سے بہت محفوظ ہوئے اور ان کی تقریروں کے نوٹ
 بھی لئے۔ عتیقی صاحب نے علامہ کی تقریر سن کر یہ کہا کہ اس قسم کے مضمون ہم
 نے پہلی مرتبہ سنے ہیں۔

۴۔ نجد کے مشہور اور حجاز کے حبید عالم ابن بلیہد بھی بغلیں جھانکتے نظر
 آتے ہیں اور علامہ عثمانی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ جاسکی۔

۵۔ ۳۰ رذوالقعدہ کو جو عبداللہ بن بلیہد کے یہاں دعوت میں مدعو کئے

علہ شیخ عبدالعزیز عتیقی اور حافظ وہبہ فاضل علمائے نجد میں سے تھے۔ جیسا کہ
 علامہ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔ مصنف

اور جو خود بھی اس مؤتمر کو آنکھوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:-
 ”قبول کو چونکہ ابن سعود شاہ حجاز نے گروایا تھا اس پر جمعیت کے وفد
 نے اعتراض کیا تھا۔ ابن سعود نے کہا کہ ہمارے علماء اس پر بحث و
 مباحثہ کر لیجئے چنانچہ جمعیت کے وفد اور سعودی علماء کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا۔
 میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی و
 حضرت مفتی صاحب احادیث نبوی کی روشنی میں اپنے دلائل اور براہین ہو کر
 علماء منوالئے :- (اخبار الجمعیت دہلی المفتی نمبر ۲۲ فروری ۱۹۵۲ء)
 آخر میں ہم علامہ عثمانی کی ایک آخری تقریر پیش کرتے ہیں جو آپ نے مؤتمر کے
 آخری اجلاس میں مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت فرمائی تھی۔ اور جس کا زمیندار
 اخبار لاہور نے بعینہ اپنی اشاعت مورخہ ۱۷ صفر ۱۳۷۵ھ مطابق ۲۷ اگست
 ۱۹۵۶ء بروز جمعہ میں پہلے صفحہ پر نمایاں کر کے شائع کیا۔ یہ اخبار اس وقت
 ہمارے پیش نظر ہے۔ اور ہم اسی کی قائم کردہ سرخیوں کے ساتھ یہ تقریر یہاں درج
 کرتے ہیں۔ یہ تقریر ہم نے خطبات عثمانی میں بھی درج کی ہے:-

اعلائے کلمۃ الحق

مولانا شبیر احمد عثمانی کی درد اسلامی میں ڈوبی ہوئی تقریر
 سلطان ابن سعود کے عدل اور دیانتداری کا اعتراف
 مولانا شبیر احمد عثمانی نے مؤتمر مکہ کے آخری اجلاس میں حسب ذیل
 تقریر ارشاد فرمائی (اخبار زمیندار)
 اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حضرات! عزیز عقیدہ ہے کہ آپ کی وہ تمام قراردادیں جو اپنے موثر ترین نتائج کی ہیں۔ اور وہ ساری گفت و شنید جو آپ کے مابین جاری رہی۔ اس وقت تک بے سود ہے کہ ارکانِ موثر کے مابین اخوت اور دوستی کے رشتے استوار نہ ہوں۔ اور آپ کے توسط سے مسلمانانِ اکنافِ عالم اخوت و مودت کے ایک محکم رشتے میں مربوط نہ ہو جائیں اس لئے ہمیں نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرنا لازمی ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم میں سے ہر ایک فردِ علامۃ المسالین کے حالات کی نگرانی رکھے اور اپنے عزیز اوقات میں ایک حصہ اسلام کے مصالح عمومی پر غور و خوض کرنے اور مسلمانوں میں اتحاد اور آفاق پیدا کرنے کے اسباب و وسائل تلاش کرنے کے لئے وقف کر دے میرے نزدیک اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے بڑا ذریعہ اوستی بڑا وسیلہ وہ ہے جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مکہ مکرمہ اور اس کے ماحول کی تطہیر سے ہمارے لئے مہیا کر دیا ہے۔ سرزمین مقدس باغیوں اور خانوں کی جہانتوں سے پاک ہو گئی ہے اب مسلمان آزاد ہو گئے ہیں کہ اخوت اسلامیہ کی توثیق و تجدید شریعت محمدیہ کے احیاء اور کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لئے بلا خوف و خطر بلاد مقدسہ میں جوق در جوق آئیں۔ اللہ سبحانہ کے علم و قضا میں اس عظیم و جلیل کائنات کا انصرام صاحبِ اجلاتہ عبد الحسین بن السعود نصرہ اللہ وادیہ برّج منہ کے (اتھوں کا مرہون تھا) مرکز اسلام اور قبلۃ مسلمان کو شریف حسین اور اس کے پھوؤں سے آزاد کرانے اور بلاد الامین میں عالمِ اسلامی کے ایک ایسے آزادانہ اجتماع کا دروازہ کھولنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے انہیں کو عطا فرمائی! اور اب مسلمانانِ عالم خدا کے اس گھر میں بیٹھ کر اپنے مصالح و منافع کے لئے باہم مشورہ کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ

کے خوف کو دل میں بچھ دے کر سلامت کنذہ کی ملامت سے بے پرواہ ہو سکتے ہیں۔ یہ سب سے بڑا فضل اور سب سے بڑا اکرم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے سلطان عبدالعزیز کو سرفراز فرمایا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا وہ احسان ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے قرنہا قرن سے کسی فرد کو مشرف نہیں فرمایا۔ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَانَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔

حضرات! ہم نے مؤتمر کے سارے حالات مشاہدہ کئے ان کے کیف و کم کا سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اجلاس پر کبھی انبساط کا لہجہ افروز عالم طاری ہو جاتا تھا اور کبھی انقباض و کسیدگی چھا جاتی تھی اور بعض اوقات ہم آپس میں ایسی باتیں کرنے لگتے تھے جن سے دلوں میں کدورت پیدا ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا! بلکہ اگر کسی بھائی کو مجالس کے امور کا تجربہ ہو تو یحیدر نہیں کہ وہ بعض باتوں کو اپنی توہین و تذلیل پر محمول کر لے لیکن ہمیں مسلمانوں سے حسن ظن رکھنے کا حکم ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام غصے اور افسوس سے بھرے اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو تورات کی الواح کو زپ پر دے چکا اور اپنے بھائی کو داڑھی اور سر سے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ ہارون علیہ السلام نے یہ معذرت پیش کی کہ اے میرے ماں جلتے مجھے داڑھی اور سر سے پکڑ کر نہ کھینچ۔ مجھے ڈرتھا کہ کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ پس اگر ہم میں سے کسی نے مؤتمر میں اپنے بھائی کی داڑھی پکڑ کر کھینچی ہے تو غصہ کے فرو ہو جانے کے بعد لازم ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ کہے رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِإِخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (اے پروردگار مجھے اور میرے بھائی کو بخش

دے۔ ہم پر اپنی رحمت نازل فرما۔ تو سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے، مومنین قاتلین کہہ ہی شان ہے وہ لوگ جن کے سینوں میں دولتِ اخلاص مضمحل ہے اور وہ لوگ جن کی غرض و غایت اصلاح ہے ان کا یہی شیوہ ہے مندوبین عالم اسلام کا یہی اجتماع جس طریق پر وقوع پذیر ہوا اس کی نظیر زمانہ سابقہ میں مفقود ہے۔ پس ہم پر لازم ہے کہ اس شہر کے پروردگار کا جس نے ہمیں خوف سے مامون اور ظاہری و باطنی نعمتوں سے مالا مال کیا اس عظیم الشان احسان پر سجدہ شکر بجالائیں۔ اس کے بعد ہم پر جلالتہ السلطان عبدالعزیز کا شکریہ ادا کرنا بھی لازم ہے۔ جن کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے یہ جلیل القدر کام سرانجام دلایا۔ بلا و مقدمہ کے خام کی حیثیت سے ان کو خاص عزت و عظمت حاصل ہے۔ اور خصوصاً جب کہ عظمتہ السلطان عدل، دیانتداری، وسعتِ قلب اور حسنِ اخلاق کی گونا گوں صفات سے مستصف ہیں کتاب اللہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ خلفائے راشدین و سلف صالحین و ائمہ متبوعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے متبع ہیں مزید برآں اللہ تعالیٰ نے ظالموں و مکرشوں اور قطاعِ الطریق کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیا ہے۔ حج و زیارت کے راستے بالکل مامون ہو گئے ہیں جن لوگوں نے مکہ و مدینہ کے مابین سفر کیا کیا ہے ان سے باتو اترا ہی شہادت کی تائید و تصدیق ہوتی ہے شہادت دینے والے مختلف جماعتوں اور فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایک حقیقت میں وہ سب متفق اللسان ہیں کہ راستے بالکل مامون ہیں!

جس طرح حجاز کی حکومت کو عالم اسلامی پر سیادت و قیادت میں بڑی حاصل ہے اسی طرح اس پر ذمہ داریاں بھی اسی نسبت سے زیادہ اور

وسیع ہیں حکومت حجاز ان اسلامی قومی کے لئے جو موتمر میں مدعو کی گئی ہیں، وسیلہ ربط ہے۔ اور امیر حجاز موتمر کی روح رواں ہے اگر اس میں فساد پیدا ہو گیا تو ساری موتمر پر فساد طاری ہو جائے گا۔

حضرات! موتمر حجاز کی کامیابی زیادہ تر حجاز کی مقامی حکومت کی استقامت اس کی توجہ اور اس کے اس احساس پر منحصر ہے کہ وہ صرف نجد کی نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کی حکومت ہے۔ اور مسلمانان عالم اور حکومت حجاز دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق ہیں حکومت حجاز کو ان حقوق کے ادا کرنے میں خوف خدا، دیانتداری، صبر و استقامت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت ہے ان فرائض کی بجا آوری میں حکمت، تسہیل، فراخی، فیاضی اور تدبیر کی ضرورت ہے۔ تاکہ کسی بُری بات کے ازالہ کرنے سے کوئی بات پیدا نہ ہو جائے جو اس سے بھی زیادہ بُری، زیادہ ضرر رساں اور زیادہ پریشان کن ہو ہم ان بدعات و منکرات کے ازالہ کو جو اسلامی ممالک اور ان بلادِ مطہرہ میں پھیل چکی ہیں بُرا نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ اہم تر مقصد کو مقدم رکھا جائے! جب دو آفتیں پیش نظر ہوں اور ان میں سے ایک کو اختیار کرنا، بمقتضائے حالات لا بدی ہو، تو ان دو مصیبتوں میں سے اس مصیبت کو بدرجہ مجبوری اختیار کر لینا چاہئے! جو مقابلہ ہلکی ہو۔ اور مصائب و آفات سے نجات حاصل کرنے میں حکمت و آہستگی کا شیوہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور غلو و تعمق سے بچنا چاہئے!

کیونکہ تعقی فی الدین ہی پہلے لوگوں کے لئے باعثِ ہلاکت بنا ہے۔ کسی چیز پر شرک بدعت یا گمراہی کا حکم لگانے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے!

مخاسد کا موازنہ شریعت مصاحف عامہ کے نقطہ نظر سے کرنا چاہئے!!
 حضرات! آپ میری تقریر کا مقصد جانتے ہیں۔ تفصیل کا
 موقع نہیں ہے! عظمۃ السلطان نے ہماری باتوں کو شرف سماعت
 بخشا اور ہماری تصریحات کو پسند کیا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ
 کیا۔ کہ ہم علماء نجد وغیرہ کے ساتھ بحث و مذاکرہ کریں۔ ہم نے اکثر
 علماء کے ساتھ گفتگو کی۔۔۔ جس قدر مبادلہ خیالات ہوا ہے، امید
 ہے کہ وہ ضرور بار آور ہوگا! اور مسلمانوں میں اعتدال پیدا ہو جائے
 گا! مؤتمر کو چاہئے کہ یک زبان ہو کر حکومت حجاز کو اس بنیادی اصول
 کا احساس کرائے! جماعت کی آواز میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ افراد
 میں نہیں ہوتی۔ فَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ لِي تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ
 مولانا عثمانی کی مذکورہ بالا تقریر زمیندار میں اس وقت شائع ہوئی ہو
 جب آپ دیوبند تشریف لائے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اور دیگر حضرات بھی
 ہندوستان پہنچ چکے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر سلطان ابن سعود کے مخالفین میں
 سے تھے۔ چنانچہ آپ نے سلطان ابن سعود کی مخالفت میں اپنے اخبار ہمدرد
 میں آتے ہی ایک دو آرٹیکل لکھے۔ مولانا ظفر علی خان مالک و ایڈیٹر اخبار
 زمیندار لاہور سلطان ابن سعود کی موافقت میں تھے اور انہوں نے مولانا
 محمد علی جوہر کی تردید کی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کی آخری تقریر زمیندار میں شائع کی۔
 اسی ۲۷ اگست ۱۹۲۷ء کے پرچے میں مولانا محمد علی جوہر کی تردید میں تین کالم کا تردیدی
 مضمون لکھا ہے جس میں ان کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو ان کے
 الفاظ سے مترشح ہوئے تھے اور جن کو ہندوستان کے مسلم اخبارات نے اچھالنا
 شروع کر دیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی بھی شروع شروع میں سلطان ابن سعود کے مخالف تھے لیکن بعد میں وہ پھر پیئرا بدل کر ان کے حق میں ہو گئے تھے۔ اسی اخبار کے افکار و حوادث میں مولانا ظفر علی خاں نے مولانا جوہر مرحوم کے کراچی میں خالق دینا مال کے لیکچر پر زبردست بھتیجی کسی ہے۔ لکھتے ہیں :-

”مولانا محمد علی جوہر جو اپنی پلوں کی زبانی اپنے دل اور جگر کے گداڑ کی

بھائی مٹانے کے لئے ہمیشہ مضطرب رہتے ہیں کراچی کے خالق دینا مال میں

روئے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے حضرت مولانا نے

اپنے شبکی و عظم میں نجد کے اخوان الشیاطین پر رہتے ہوئے یکمال تو

دکھایا ہی تھا کہ دیکھتے دیکھتے ہر طرف آنسوؤں کا ایک دریا بہنے لگا جس

کی منہرہار میں سلطان ابن سعود کی ملوکیت کی کشتی ڈبکوں ڈبکوں کر رہی

تھی حضرت خواجہ حسن نظامی بہت بڑے نباض واقع ہوئے

ہیں ایک وقت تھا کہ خواجہ صاحب نے سلطان ابن سعود کو

”حمیدی“ کے خطاب سے یاد کیا تھا لیکن عرب کے اس حمیدی کی

قبیلہ شکیبی سے ناراض ہو کر آپ تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کو مفسرِ سخن

کہنے لگے۔“

غرض یہ ہے کہ ہندوستان کا بریلوی طبقہ تو سلطان کا سخت مخالف تھا اور

ابھی تک مخالف ہے اور ایک طبقہ ان کے قطعاً موافق تھا اور اب بھی ہے وہ اہل

حدیث کا طبقہ ہے لیکن مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے علمائے دیوبند کی ترجمانی

میں اعتدال کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے حجاز کے راستوں کے مامون ہو جانے ،

شریعت اسلامی کے قوانین کو رائج کرنے کے سلسلے میں سلطان کی تعریف کی ہے ،

اور یہ بھی کہ سرزمین حجاز میں شرک کا استیصال سلطان کا بہترین کارنامہ ہے لیکن

ساتھ ہی قبوں کے گرد اپنے کو اچھا ظاہر نہیں کیا بلکہ سلطان ابن سعود کے سامنے برملا اس فعل کو مستحسن قرار نہیں دیا اور نہ ہی قبروں پر عرس، چراغاں کرنیوالے مسلمانوں کے متعلق کفر کے فتوے کی موافقت کی بلکہ فرمایا کہ اس قسم کے لوگوں کو ہم مبتدع کہہ سکتے ہیں لیکن کافر نہیں کہہ سکتے یا ان کے اموال و دماء کو مباح نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ان کا فعل قابل تعزیر ضرور ہے۔ بہر حال علامہ کارویہ ان سب میں معتدل، حکیمانہ، متین اور عالمانہ رہا۔

ابن سعود مرحوم کے عہد حکومت میں ہندوستان سے جو بعض حجاج گئے اور واپس آئے تو ان کے بریلوی خیالات کے رشتہ داروں میں عجیب کمکش پیدا ہوئی زمیندار کا مذکورہ اشاعت کے پرچے میں ایک خبر یہ بھی ہے :-

مولوی دیدار علی کی سنگدلانہ فتویٰ بازی | کوچہ چراغ گراں میں ایک حاجی مسی شیخ محمد طفیل صاحب

نے حج سے واپس آکر فریضہ حج کی ادائیگی کی خوشی میں برادری کو دعوت طعام دی۔ اس کی برادری کے چند آدمی جو مولوی دیدار علی صاحب کے مریدان باصفائیں تھے اس کے پاس آکر کہا کہ تم نے حج کیا ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ پھر انہوں نے کہا کیا تم نے نجدیوں کے ساتھ نماز پڑھی؟ اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا کیا تم نجدی ہو؟ اس نے کہا کہ کیا آپ میرے عقیدے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں تم وہابی ہو۔ تمہارے گھر کا کھانا ہم پر حرام ہے۔ چنانچہ مولوی دیدار علی کے تقریری فتوے پر اس شخص کی برادری کا اس سے انقطاع کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حاجی بے چارہ برادری سے انقطاع ہونے پر سخت

غمزہ اور صاحب فراموش ہے۔

یہاں پہنچ کر ہم اب پھر علامہ کی موتمر کی آخری تقریر کا جائزہ لیتے ہیں۔
 درمیان میں اس وقت کی ہندوستانی سیاسیات اور ماحول کا ہم نے معلومات
 اور واقفیت عامہ کے لئے تذکرہ کر دیا ہے۔ اب جائزے کی طرف آئے ہیں۔
 علامہ کی آخری تقریر جو آپ نے موتمر میں مندیائی
 راقم الحروف کے نزدیک موتمر کی روح تھی کیونکہ اس

تقریر کا جائزہ

اسلامی اجتماع کا مقصد صرف

نشست و گفتند و برخاستند

ہی نہیں ہونا چاہئے تھا بلکہ دنیائے اسلام میں اتحاد، یگانگت اور آئندہ کے
 لئے ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کی جڑوں کو مضبوط کرنا تھا۔ چنانچہ آپ نے
 صرف انہی چند مسائل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ موتمر کو آئندہ کے لئے امت مسلمہ
 کی خاطر ایک پروگرام دیا ہے جس کی تعلیم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی تھی۔
 اور وہ ہے آئندہ کے لئے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور درد و غم میں
 شریک ہونا اور اسی جذبے سے سرشار ہمیشہ آپ کا دل رہا چنانچہ موتمر اسلامی
 کراچی میں بھی آپ نے یہی کوشش فرمائی۔

موتمر کی یہ کارروائیاں ہندوستان کے اخباروں میں چھپتی رہیں اور آپ
 کی ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ زمیندار اخبار نے تو خاص طور پر علامہ کی
 تقریروں اور تجویزوں کو پُر زور سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ بہر حال موتمر ختم
 ہوئی۔ لیکن دنیائے اسلام کے جلیل القدر علماء پر حضرت مولانا کی دھاک
 بیٹھ گئی۔

ڈائری میں کہیں مدینہ منورہ کے سفر کا ذکر نہیں لیکن آپ اس سفر
 مدینہ منورہ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ کیونکہ ڈائری میں یہ موجود ہے

مدینہ منورہ

کہ وہاں مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی کے بچوں کو جو مدرسۃ العلوم الشرعیہ کے بہتم ہیں مٹھائی وغیرہ دی ہے اور کچھ نقد بھی۔ تاہم میرے ذاتی علم میں یہ بات ہے کہ آپ حج اور موتمر سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

علامہ کی حجاز سے ہند کو روانگی اور علما کا روانگی وداع کہنا

جب موصوف حجاز سے واپس ہوئے تو جیسے کی بندرگاہ پر حجازی اور دیگر ممالک کے علماء اور معززین نے آپ کو اور اہل وفد کو الوداع کہا۔ علامہ اپنی ڈائری میں تو وداع کے متعلق کچھ اشارے لکھے ہیں مثلاً جدہ کا منظر، مصریوں اور دیگر حضرات کا الوداع کہنا، جہاز پر دعوت دینا ہر طبقہ کے ممتاز اشخاص اور علماء کا موجود ہونا، کامراں کا جلسہ، یہ اشارے ہیں جن سے آپ کے وداعیہ وقت کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

واپسی پر جو سامان ہمراہ تھا | حجاز سے جو تبرکات آپ نے اپنے ہمراہ لئے اور جو سامان سفر میں جب سے ساتھ تھا ڈائری

میں اس کی فہرست لکھی ہے جو حسب ذیل ہے :-
بکس کلاں، بکس خورد، بکس تبرکات، پیٹی زمرم، پیٹی چور زنبیل،
ہندی، بستر، توشہ دان، لوٹا گلاس، چھتری، تکیہ مولوی عرفان
صاحب کے پاس بستر میں ہے اور روغن بلبان مفتی (کفایت اللہ)
صاحب کی شرکت میں ہے۔ ٹین حلوی کا، (ڈائری ص ۶)
علاوہ ازیں وہ کتابیں بھی ہمراہ تھیں جو ساتھ لے گئے تھے۔ غالباً وہ بکس کلاں
میں تھیں۔ اسی ڈائری میں سفیر بالشویک سے ملاقات کا جملہ بھی درج ہے۔

حضرت عثمانی مئی میں روانہ ہوئے تھے اور اگست ۱۹۲۶ء
مراجعت ہند | مطابق صفر ۱۳۴۵ھ میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔

اخبار زمیندار مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۲۶ء مطابق ۱۷ صفر ۱۳۴۵ھ جمعہ کی اشاعت میں حسب ذیل خبر آپ کی آمد سے متعلق شائع ہوئی :

” حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رکن و ذریعۃ العلماء جو ابھی آپ سفر حجاز سے تشریف لائے ہیں دیوبند پہنچ گئے ہیں ۔ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ نصیب اعداء آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی ہے ۔ دعا ہے کہ شافی مطلق انہیں صحت عاجلہ عطا فرمائے “

اس خبر سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ۲۷ اگست سے کچھ دن پہلے دیوبند پہنچے ہیں ۔ اور گزشتہ سطور میں بمبئی کے جلسے کی صدارت میں آپ کو یہ معلوم ہو ہی چکا ہو کہ آپ نے ۱۲ مئی کی شب میں بمبئی کے ایک عظیم الشان جلسے کی صدارت کی تھی جب کہ آپ وہاں سے حجاز کو روانہ ہونے والے تھے گویا کہ آپ کے ساٹھ تین ماہ اس سفر میں صرف ہوئے ۔

جب علامہ دیوبند پہنچے تو اسٹیشن پر طلبہ اساتذہ اور اہل شہر نے زبردست استقبال کیا ، اقامت اور زبردست استقبال

اسٹیشن کچا کچھ بھرا ہوا تھا اور تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی ۔ دیوبند واپسی پر سب پہلا جمعہ آپ ہی نے جامع مسجد میں حسب عادت پڑھایا ۔ خوب یاد ہے کہ جمعہ کے بعد جامع مسجد میں آپ کی تقریر ہوئی اور آپ نے وہاں کے حالات سنائے ۔ ان میں سے ایک بات یہ یاد رہ گئی کہ ” مولانا عبدالحکیم صدیقی “ سے سلطان ابن سعود نے پوچھا ” الیہ عبادۃ مبینی العبادۃ الی شئی (عبادت کی کیا تعریف ہے) تو مولانا عبدالحکیم کا جواب شفا بخش نہ ہونے پر میں نے انہی کرسی آگے بڑھا کر عبادت کی حقیقت پر روشنی ڈالی ۔ حجاز سے واپسی پر آپ کے ارد گرد دھرم رہتا ۔ کیونکہ اس

مؤتمر کی کاروائیوں کے سنے کے لئے لوگ بیتاب تھے۔ بہر حال علامہ کا سفر نہایت مبارک اور نہایت کامیاب رہا۔

اس سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خداے بخشنده

شیرکوٹ میں آمد (دسمبر ۱۹۳۶ء) | مؤتمر مکہ سے واپسی کے چند ماہ بعد علامہ راقم الحروف کے وطن شیرکوٹ ضلع سینور (یو۔ پی) میں اپنے دوست مولانا غمدالدین صاحب انصاری شیرکوٹی کی دختر فرخندہ اختر علیہ کی شادی میں جو منشی نصیر الدین سے ہوئی تھی تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی اساتذہ دارالعلوم بھی تھے۔ میں بھی سفر تھا۔ شیرکوٹ کے لئے دھام پور کے اسٹیشن پر اترے وہاں سے شیرکوٹ تین میل تھا۔ راستے میں کھو دریا ٹرنا تھا جو شیرکوٹ کے کنارے پر بہتا ہے۔ وہاں آپ کے استقبال کے لئے اہل شیرکوٹ جمع تھے۔ خوب یاد ہے کہ ان سب حضرات نے مغرب کی نماز کھو دریا کے اُس پار پر ہی اور مجھے امام بنادیا گیا۔ میں اس زمانے میں جوانی میں تو قدم رکھ چکا تھا مگر ان کی امامت کے قابل نہ تھا۔ بہر حال مولانا انصاری کے یہاں پہنچے۔ شام کو نکاح ہوا۔ یہ جعرات کا دن تھا۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد میں تشریف لے گئے۔ بعد نماز جمعہ کے مسجد میں جلسہ ہوا۔ جلسے سے پہلے آپ کے خیر مقدم میں دو قصیدے پڑھے گئے۔ ایک تو بندہ نے عربی میں لکھا تھا جو خود پڑھا۔ دوسرا قصیدہ استاذی مولانا عبدالقیوم صاحب اثنی عشر شیرکوٹی نے لکھا تھا وہ بھی راقم الحروف نے ہی پڑھا تھا۔ اپنا قصیدہ تو یاد نہیں رہا اور ۱۹۳۷ء کے ہنگامے میں مسیری شاعری کی بیاض کے ساتھ کپور تھلہ میں ہی ضائع ہو گیا۔ استاذی مولانا عبدالقیوم

صاحب شیر کوٹ کے اردو فارسی کے قدیم ماہر اساتذہ میں سے ہیں۔ ان کا قصیدہ
یہ ہے جو میں نے موصوف سے حیات عثمانی کے لئے حاصل کیا تھا۔ شاعر موصوف
کی قائم کردہ سرخیوں کے ساتھ خیر مقدم پڑھئے جو حسب ذیل ہے۔

خیر مقدم

بیعت الفاظ معانی بقریہ و دہمیت آمود طیب جانی حضرت مولانا
شیر احمد عثمانی

از خاکپائے اہل علوم اجتر عبد القیوم ارتقی شیر کوٹی

اللہ اللہ کیا نشاط افزا ہے عالم کی بہار ۛ رشک گلزار جناب ہے ہر خیابان چین
قطرے قطرے سے ہر شبنم کے عیا فیض حق ۛ ذرہ ذرہ دشت کا ہے غیرتِ بعلِ بسین
ہر گل سے ہر ظاہر رنگ بولے لئے دوست ۛ جلوہ زارِ بیا ہے ہر برگِ نسیم و سن
قریوں کا ورد ہے حق سرہ بالائے سرو ۛ بلبلِ دستانِ بھر ہے شاخ گل پر نغمہ زن
نگہت ہر گل چین میں صدم ہے عطرِ نیر ۛ ہر گل کی کہتی ہے یہ، یوسف کا ہوں میں پیرین
ہے نصارتِ گلشنِ عالم کی تیرے فیض سے ۛ ابرِ رحمت بن کے برسا فضل تیرا ذوالمنن
یوں تو فیضِ عام اک عالم پہ ہے چھایا ہوا ۛ آج فضلِ خاص اس قصبہ پہ ہے پرتو فگن
یعنی شادی کہ خدائی میں نصیر الدین کی ۛ لائے میں تشریف حضرت افغانِ اردو بن
آمد آمد کی خبر سنتے ہی سارا شیر کوٹ ۛ رشکِ جنت بن گیا، پہلے جو تھا بیتِ الحزن
آج برائی تنہائے دلی ہر ایک کی ۛ دل میں اک تیرے تھا شوقِ زیارتِ خوشن
مولوی شبیر احمد لودھی و لمبی ۛ سب سے اعلیٰ سب سے افضل زبیر اہل زمن
قطب الاقطاب زمانہ سالک راہِ ہدیٰ ۛ یادگار خاص شیخ الہند محمود الحسن
حامی دین متین و ماحی بدعات و کفر ۛ جو کہ ہے اتحاد کا اور زندقہ کا بیچ کن

ایسا عالم ، ایسا فاضل ایسا عابد باورع
 وہ اکابر کا نمونہ وہ سلف کی یادگار
 ملح حاضر میں کروا بل میں ہر تجھے خطاب
 خیر مقدم کے لئے ہیں دیدہ و دل فرس راہ
 وصف تیرے کر سکے یہ نطق کا یا را نہیں
 تیرے احسانات میں جو قوم پرے فخر قوم
 سعی و کوشش تو نے جو کچھ موثر کہ میں کی
 مصلحانِ قوم میں جو آج کل مشہور خلق
 تیرے استدلال کے آگے ہو سر بر کیا مجال
 تو جو دکھلائے دم تفسیرِ راعی اکلام
 مبداءِ فیاض سے کیا نطق ہے جمع کو ملا
 حقہ اخلق کو قول مخالف سے کبھی
 مخلصانہ ہے دعا و شوق کی یہ شام و سحر
 کوئی دیکھا ہو تو بتلائے ہیں ہر چرخ کہن
 جس کی طبع نکتہ رس سے واقف تر و علن
 اب حوالا تو ہے اور سب قلم ہے تشنہ ذہن
 تجھے تیرے مدت سے جو یا سب میرے اہل وطن
 مدح تیری کیا کرے میری زباں میرا ذہن
 صفحہ دل پر ہمارے ثبت ہیں سب میں وعن
 سب نے اخبارات میں اس کو پڑھا ہر جہاں
 تجھ سے استقلال و اطمینان کا کچھ چین چلن
 قائلِ تثلیث ہو یا ہو پرستارِ دشمن
 بت گریں سجدے میں اور ایمان لائے برہن
 چٹکیاں لیتا ہے دل میں تیرا انداز سخن
 تیری پیشانی انور پر نہیں پڑتی شکن
 تیرے فیضِ عام سے ہوں مستفیض اہل وطن

اصدقا کو روز و شب بچے تھے عزت نصیب

اور واژوں بخت اعدا کے لئے دار و رس

نذر بندۂ عاصی ارض

۲۶ ۶ ۱۹

جب راقم الحروف یہ خیر مقدم پڑھ رہا تھا تو جلسے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔
 جامع مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس کے بعد علامہ نے تقریر فرمائی اور مردہ
 دلوں کی کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر دیا۔

غریب خانے پر چائے پارٹی | جمعہ کی تقریر کے بعد میرے غریب خانہ پر چائے
کی دعوت تھی جس پر میں نے موصوف کو مدعو کیا

تھا اور بھی معززین شہر تھے خوب لطف مجلس رہا۔ بقول شاعر

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھسے کو دیکھتے ہیں

مولانا ایشق صاحب کے خیر مقدم میں دو تاریخی باتوں کا ثبوت ملتا ہے ایک

تو یہ کہ مؤتمر مکہ میں آپ کی سرگرمیوں کا اخبار میں چھپنا دوسرے بندہ حامی ایشق

کے نیچے ۱۹۲۶ء کا درج فرمانا۔ اس سے یہ صاف معلوم ہو گیا کہ علامہ کا شیرکوٹ کا

سفر ۱۹۲۶ء میں مؤتمر مکہ کے بعد ہوا۔ اور چونکہ جازوں کا موسم تھا اور علامہ

نے ایک گرم اونی چوغہ پہن رکھا تھا اور یہ دسمبر کی تعطیلات کے دن تھے کہ مولانا

انصاری شیرکوٹی جو اس وقت اسلامیہ ہائی سکول جالندھر میں پڑھتے تھے دسمبر

کی تعطیل میں شیرکوٹ آتے تھے۔ لہذا یہ سفر آخری عشرہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہوا۔



تبلیغی کارنامے

بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

دنیا میں جس قدر انبیاء تشریف لائے ان سب کا فریضہ وحی الہی اور احکام خداوندی کی تبلیغ تھا۔ سب سے آخری پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہو گیا جو قیامت تک جاری رہے گا۔ جب سورج دن کو روشن ہوتا ہے تو اور کسی روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جب چھپ جاتا ہے تو سورج کی شفق روشنی کا کام دیتی ہے پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ پیغمبر اعظم نبوت کے تیرا عظم کی روشنی کے سامنے کسی روشنی کی ضرورت نہیں جب وہ دنیا سے رخصت ہو گئے تو قرآن کی شفق قیامت تک کام کرے گی اور پھر قیامت آجائے گی اس لئے کسی نبی کے آنے کے لئے درمیان میں وقفہ نہیں ملتا۔ البتہ علماء امت اسلام خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب بن کر دین اسلام کی شمع روشن کرتے رہیں گے۔ یوں تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تبلیغ کا فریضہ انجام دے لیکن خاص طور پر علماء کا۔ اسی لئے علماء کے متعلق حدیث نبویؐ ہے :

علماء امتی کا نبیاء | ”میری امت کے علماء، انبیاء
بنی اسرائیل۔“

کون ایسا عالم ہے جس نے اپنے اپنے دور میں کسی نہ کسی شکل میں تبلیغ نہ کی ہو البتہ علماء میں بھی بعض خاص علماء ہوتے ہیں جن کی علمی لیاقت، فضیلت، منزلت اور عظمت کے باعث دین کو بڑی ترقی ہوئی اور ہوتی ہے اور ہوتی

رہے گی۔ انہی علماء دیدہ وراور فضلاء دانشمند میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ وہ ایک ایسے جامع صفات عالم تھے جو علوم عقلیہ اور علوم شرعیہ میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ علاوہ انہی اپنے زمانے کے شعلہ مقال مقرر اور عظیم المرتبہ انشا پرداز تھے۔

جمعیت الانصار کے جلسوں میں، دلی کی راج دہانی میں فتحپوری کی ملازمت کے دوران کی مجلسوں میں، خلافت اور جمعیت العلماء کے پلیٹ فارموں پر عربی مدارس کی جلسہ گاہوں اور سیاسی مجالس میں وہ تمام ہندوستان میں اپنی جادو بیانی میں مشہور ہو چکے تھے۔ آپ جیسے مقرر ہندوستان میں چند ہی تھے اور یوں بولنے والے ہزاروں تھے۔

مقامات تقریر | میں نے جہاں تک محالہ کیا ہے کونسا ایسا شہر ہے جہاں آپ کی تقریریں نہ ہوئی ہوں۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ،

کراچی، حیدر آباد سندھ، بہاولپور، ملتان، لاہور، جالندھر، فیروزپور، اترپردیش، لدھیانہ، انبالہ، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، شملہ، ایبٹ آباد، سہانپور، مانسہرہ، میرٹھ، بجنور، شیرکوٹ، کھوٹا، دھام پور، دہلی، علیگڑھ، غازی پور، بلند شہر، مظفرنگر، نہٹور، مراد آباد، اگرہ، کانپور، لکھنؤ، گیا، دیوبند، بڈھان، رڑکی، بریلی، مدراس، ممبئی، کلکتہ، سورت، حیدر آباد دکن، ڈھاکہ، بنارہ، کوٹا، بنوں، ہزارہ، گجرات کا ٹھیا دار، غازی آباد، سنبھل، ہوشیار پور، سرگودھا وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں کوئی جگہ ہوگی جہاں آپ کی تقریریں نہ ہوئی ہوں۔ پھر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی تقریروں کے آپ کو بے شمار مواقع میسر آتے۔ خاص خاص ملکی اجتماعات کے ماتحت کتنے ہی مذہبی جلسوں میں تقریریں کیں۔ اسلام کی سر بلندی اور غیر مسلموں

کی تردیدوں میں ملکی دورے کئے۔ ان میں سے بعض انجمنوں کے ماتحت اجلاسوں میں تقریروں کا ہم کچھ حال بیان کرتے ہیں :-

انجمن خدام الدین لاہور میں علامہ عثمانی کی تقریر

جب حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے انجمن خدام الدین کی لاہور میں بنیاد ڈالی تو بعض مخالفین نے ان کے خلاف

زبردست پروپیگنڈہ کیا۔ مولانا احمد علی صاحب نے اپنے جلسوں میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کو تقریروں کے لئے مدعو کیا۔ یہ حضرات تشریف لاتے رہے۔ پہلی دفعہ لاہور میں ایک اشتہار شائع کیا گیا کہ ان کے جلسے میں شرکت ناجائز ہے۔ اس کا اثر اٹا ہوا۔ اور اس جلسے میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ علامہ اقبال، سر محمد شفیع، مولانا ظفر علی خاں، سر عبد القادر اور بڑے بڑے اہل علم جلسے میں شریک ہوئے۔ علامہ شبیر احمد صاحب کی تقریر نے اہل لاہور پر جادو کا اثر کیا اور ان کو یہ کہتے بنیے

اثر لبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے

کسی کی آنکھ میں جادو تری زباں میں ہے

علامہ اقبال، سر محمد شفیع اسی مجلس سے علامہ عثمانی کے معتقد ہو کر اٹھے۔

اور پھر اسی قسم کی مجالس سے متاثر ہو کر سر محمد شفیع نے کہا تھا :-

”کاش میری ماں مجھے وہاں تعلیم دیتی جہاں مولانا شبیر احمد

نے تعلیم پائی ہے“

مولانا ظفر علی خاں مرحوم زمیندار مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۳۹ء میں مولانا عثمانی

کی تقریر کے متعلق لکھتے ہیں :-

”جن لوگوں نے مرحوم کی تقریریں سنی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا

کے ایک ایک لفظ میں علم و عرفان کا سمندر موجزن ہوتا تھا۔ اور ایک ایک بات میں دنیا و مافیہا کے حقائق پوشیدہ ہوتے تھے۔

حیدر آباد دکن میں علامہ عثمانی کی تقریریں

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی "معارف" کے پرچے میں جو اپریل ۱۹۵۰ء کی اشاعت ہے، لکھتے ہیں :-

" ایک میلاد کی مجلس میں میرا ان کا ساتھ ہو گیا۔ اسی جلسے میں خود حضور نظام بھی آنے والے تھے۔ میری تقریر ہو رہی تھی کہ وہ آگئے۔ میرے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی۔ حضور نظام نے بڑی داد دی اور اہل محفل محفوظ ہوئے۔ مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب و مقرر تھے۔ ان کی تقریروں میں کافی دلائل ہوتے تھے اور سیاسی و علمی تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ ذہانت و طباطبائی اور بدیہہ گوئی ان کی تقریروں سے کافی نمایاں ہوتی تھی۔ "

علامہ عثمانی کی حق گوئی، حیدر آباد میں تقریریں

اسی معارف کے پرچے میں علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں :-

" ایک وقت ایسا آیا کہ جب نظام (عثمان علی خاں) پر تفضیلت کا غلبہ تھا اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے تو مرحوم (مولانا شبیر احمد صاحب) نے تقریر فرمائی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشین طریقے سے بیان کئے گئے تھے۔ اس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی اور ان کے بے باکانہ اظہارِ حق کی سب سے تعریف کی۔ اسی تقریر میں علامہ عثمانی نے فرمایا تھا کہ " اگر آج حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیر بن کا ٹکڑا ابھی نظام صاحب کو مل جائے تو آپ اس کو اپنے تاج

میں لگانا باعث فخر تصور فرمائیں گے۔ اس پر نظام صاحب اپنی جگہ سے
اچھل پڑے اور فرمانے لگے بے شک مولانا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی صدق اخبار میں لکھتے ہیں :-
”اپنے وقت کے زبردست محکم، نہایت خوش تقریر و اعطاء محنت و

مفسر سب کچھ ہی تھے۔“ (دسمبر ۱۹۳۹ء اخبار صدق)

آزاد اخبار کے ایڈیٹر احمد سعید صاحب اختر لکھتے ہیں :-

”حلقہ علماء میں ایسا قادر الکلام مقرر اور ایسا بلخ البیان خطیب

شاید عرصے تک میسر نہ ہو۔ جب آپ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ

علم و کمال کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور علم و عرفان کی سوتیں رہ رہ کر

ابل رہی ہیں۔ وہ تقریر و تحریر میں اپنے وقت کے امام تھے۔“

(آزاد دسمبر ۲۳، ۱۹۳۹ء)

مدرسۃ البنات جالندھر جس کے بانی اور

مدیر مولانا عبدالحق عباس تھے اور اب

یہ مدرسہ ایک عظیم الشان کالج کی شکل میں

**مدرسۃ البنات جالندھر میں
علامہ عثمانی کی شہتیر**

لاہور میں جاری ہے۔ اس کے ایک جلسے میں تقریر فرمائی اور لڑکیوں کی تعلیم کے بارے

میں گرا ندر رائے کا اظہار فرمایا تقریر کیا تھی لڑکیوں کی تعلیم پر حکیمانہ اور محققانہ

اظہار خیال تھا۔ پبلک بے حد خوش ہوئی اور اگرچہ بعض امور میں علامہ نے مخالفانہ

انداز اختیار کیا لیکن خود بانی مدرسہ نے بھی بہت پسندیدگی کے ساتھ اس تقریر کو

سرایا۔ میں خود اس تقریر میں موجود تھا۔ غالباً یہ ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا۔

مدرسہ خیر المدارس جس کے بانی

مولانا خیر صاحب جالندھری

**مدرسہ خیر المدارس جالندھر میں
علامہ عثمانی کی تقریر**

ہیں اور جواب ملتان میں اپنی روایتی شان سے جاری ہے اس کے بعض جلسوں میں سے ایک جلسے میں بمقام جالندھر غالباً ۱۹۳۶ء میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا عطار اللہ شاہ بخاری، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا ماری علیہم الرحمۃ نے شرکت فرمائی۔ ظہر کی نماز کے بعد ایک روز علامہ عثمانی نے ”اَوْقُوا بِالْعُقُودِ“ پر تقریر فرمائی۔ لاؤڈ اسپیکر اس وقت نہ تھا۔ جلسہ اس وقت کچا کچ بھرا ہوا تھا۔ مخلوق ٹوٹ پڑی تھی۔ علامہ نے وہ دھواں دھاکا تقریر کی کہ لوگوں پر جادو کر دیا۔ میں خود اس تقریر میں موجود تھا۔

تجلیات عثمانی میں ہم نے تاریخی حیثیت سے اس کا اظہار کیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد

علامہ عثمانی کی ڈھاکے میں نواب سلیم اللہ خاں کے یہاں ایک حکیمانہ تقریر ۱۳ اپریل ۱۹۱۳ء

جن میں حضرت سید مولانا محمد انور شاہ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری وغیرہم تھے۔ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء کو روانہ ہوا۔ ۶ اپریل کو وفد کلکتہ پہنچا۔ چھ یوم قیام بعد ۱۱ اپریل ۱۹۱۳ء بروز منہ کلکتہ سے ڈھاکہ روانہ ہوا اور ۲۱ اپریل کو نواب سلیم اللہ صاحب کے پاس ڈھاکہ پہنچا۔ وہاں حضرت عثمانی نے لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ پر ایک زبردست تقریر فرمائی جس سے نواب صاحب اور سامعین پُر پُر اگہرا اثر ہوا اور ان کے دلوں کی حالت ہی بل گئی۔

دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے علماء نے مخالفین اسلام کا ہمیشہ مقابلہ کیا بانی دارالعلوم دیوبند کی تمام

علامہ عثمانی کی قادیانیوں کے خلاف مساعی ۱۳۲۳ء مطابق ۱۹۲۵ء

عمر اہلسنت و الجماعۃ اور اسلام کی تائید اور قادیانیوں، آریوں، عیسائیوں اور یوں سنا تن دھرمیوں کی مخالفت میں گزری۔ دارالعلوم دیوبند سے ایک وفد پنجاب

کے دورے کو نکھاتا کہ قادیانیت کے دجل و فریب کی دھجیاں اڑادی جائیں۔
حضرت سید محمد انور شاہ اور مولانا عثمانی بھی اس وفد سے جا ملے۔ فیروز پور میں
قادیانیوں سے مناظرے کی ٹھہری۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب حیات انور
کے مقالے میں لکھتے ہیں :-

” مناظرے کے بعد شہر (فیروز پور) میں ایک جلسہ عام ہوا جس
میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریریں فیروز
کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ
جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے اس مناظرے اور تقریروں کے بعد
اسلام پر لوٹ آئے۔“ (حیات انور ص ۳۱)

حضرت مفتی صاحب حیات
انور کے اسی مضمون میں تحریر
فرماتے ہیں کہ :-

**قادیانیت کے استیصال میں پنجاب
اور سرحد کا دورہ ۱۳۲۳ھ، ۱۹۲۵ء**

” یہ علم کے پہاڑ (حضرت شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب)
مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہم (پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہنچے اور
مرزائیت کے متعلق اعلانِ حق کیا۔ منکرین کو رافعِ شبہات کی دعوت دی۔
لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، لاہولہند، ایبٹ آباد،
مانسہرہ، ہزارہ، گکوٹہ وغیرہ میں ان حضرات کی بصیرت افروز عالمانہ
تقریریں ہوئیں۔“ (حیات انور ص ۳۱)

انجن ضیاء الاسلام کراچی کے ماتحت
میں آریوں سے مناظرے
کے لئے علامہ عثمانی کو بذریعہ

**انجن ضیاء الاسلام کراچی کے ماتحت
آریوں اور علامہ عثمانی کا مناظرہ ۱۳۲۹ھ**

تاریخ دعوت نامہ بھیجا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب القاسم میں لکھتے ہیں :-
 " ۲۲ رمضان (۱۳۲۹ھ) کو (مولانا شبیر احمد عثمانی) کراچی روانہ

ہوئے اور وہاں آپ کے نہایت موثر وعظ ہوئے اور مناظرہ بھی ہوا جن
 کا اہل کراچی پر گہرا اثر ہوا۔ وہاں سے کامیاب لوٹے اور تار آ یا کہ
 مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت کامیابی حاصل کی :- (القاسم شوال ۱۳۲۹ھ)
 الغرض علامہ جہاں جاتے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فتح و نصرت کا پھر برا
 اڑاتے واپس آتے۔

اگرہ کے نواح میں شدھی اور سنگھٹن | اگرہ کے اطراف میں ملکائوں
 کی قوم رہتی تھی جو مسلمان تھے
 کے مقابلے میں دارالعلوم کی مہینہ گامیابی | اور اب بھی ہیں۔ خلافت کی تحریک

اور ہندو مسلم اتحاد کے بعد آریوں نے مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کر دیا۔ اس
 تحریک کے شعلے اگرہ اور اطراف اگرہ میں بھڑک اٹھے۔ بہت سے مسلمان ہندو
 ہو گئے۔ دراصل ان مسلمانوں کو صمیم معنی میں اسلام کی تعلیمات نہیں پہنچی
 تھیں وہی ہندوانہ رسم و رواج ان کے اندر موجود تھے اور نام کے مسلمان تھے۔
 اگر آپ اس فتنہ ارتداد کی پوری تفصیلات پڑھنا چاہتے ہیں تو دارالعلوم
 کی ۱۳۲۱ھ کی رپورٹ پڑھئے، اس میں آپ کو تمام تفصیلات ملیں گی حقیقت
 یہ ہے کہ دارالعلوم جن مقاصد کے لئے جاری کیا گیا تھا اس کے طلبہ اور علماء
 نے شدھی اور سنگھٹن کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دیں اور جو لوگ مرتد ہو گئے تھے نہ
 صرف وہ حلقہ اسلام میں دوبارہ داخل ہو گئے بلکہ بہت سے ہندو بھی مسلمان ہو گئے۔
 شدھی کا پس منظر | شدھی کا پس منظر دارالعلوم دیوبند کی
 رپورٹ میں یہ ہے :-

” اخبار کیسری لاہور نے اپنی ایک اشاعت میں آریہ سماج کو ساڑھے چار لاکھ ملکاتہ نو مسلم راجپوتوں کو شہمی کر لینے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ اس تحریک کی پہلی بنیاد تھی جس کو اخبار کیسری نے شروع کیا تھا۔“

(رپورٹ دارالعلوم دیوبند ۱۳۲۱ھ ص ۵۵)

لیکن اس میں گورنمنٹ برطانیہ اور پنڈت شرودھانند کو بھی اصل میں دخل تھا۔ برطانیہ نے شرودھانند کو کئی لاکھ روپیہ دیا اور ہندو مسلم اتحاد ختم کرنے کے لئے یہ چال چلی جو بڑی کامیاب رہی۔ دارالعلوم دیوبند اس فتنے کے استیصال کیلئے اٹھا اور پہلا وفد ۱۲ جمادی الثانیہ کو حالات کی تفتیش کے لئے روانہ ہوا۔ یہ وفد پہلے دہلی پہنچا اور مولانا عبدالحلیم صاحب نائب ناظم جمعیتہ العلماء ہند دہلی سے مل کر حالات معلوم کئے۔ دہلی سے گورگانواں پہنچا۔ وہاں سے علیگڑھ گیا اور خلافت کمیٹی کے دفتر پہنچا سیکریٹری صاحب سے ملے۔ معلوم ہوا کہ فتنہ ارتداد کی رپورٹ صحیح ہے۔

ملکانوں آریوں نے کس طرح بہکایا | دارالعلوم کی رپورٹ میں درج ہے کہ:-

” آریوں کو جب معلوم ہوا کہ ملکاتہ قوم مذہب سے نا آشنا ہے..... اور بالکل بھولی بھالی ہے تو ان کو کہہ کر بہکایا گیا کہ تم درحقیقت ہندو ہو تمہارے آباء و اجداد کو عالمگیر نے توار کے زور سے مسلمان بنالیا تھا..... ملکاتہ قوم غریب ہے اس لئے..... ہندو مہاجنوں سے قرضہ معاف کرا دیئے گا بھی وغیرہ کیا گیا۔“ (رپورٹ ص ۵۶)

دارالعلوم سے پہلا وفد رجب ۱۳۲۱ھ کو روانہ کیا گیا۔ مولوی محمد شعیب ہزاروی کو معلوم ہوا کہ آریہ ملکاتوں کو اچھیزہ میں شہمی کریں گے۔ مولوی محمد شعیب صاحب نے آریوں کو مقابلے کا چیلنج دیا لیکن وہ مناظرے سے بھاگ گئے۔ انہوں نے

وہاں تقریر کی۔ تقریر کے بعد دو مکانوں کی چوٹی کاٹی گئی۔

پھر معلوم ہوا کہ اکثرہ گاؤں پورا شدہ ہونے والا ہے۔ یہ وہاں پہنچے اور تبلیغ کی۔ آریہ بہت جمع تھے۔ لیکن اکثرہ والے شدہ ہونے سے بچ گئے۔ مولوی شمس القمر مولوی محمد شعیب کے ہمراہ تھے۔

دوسرا وفد دارالعلوم دیوبند سے ۳۰ رجب کو روانہ ہوا۔ اس وفد کے امیر مولوی سرور حسین تھے۔ بھوگی پور پہنچے وہاں کے لوگوں نے ہندو ہونے سے منع کر دیا اور آریوں کو صاف جواب دے دیا۔

تیسرا وفدہ شعبان ۱۳۴۱ھ کو اور جو تھا مولانا میرک شاہ صاحب کشمیری مدرس دارالعلوم دیوبند کی سرگردگی میں اکیس ارکان پر مشتمل، ارشعبان ۱۳۴۱ھ کو آگرے پہنچا وہاں انہوں نے تبلیغ کا دفتر قائم کیا۔ پانچواں وفد جو مین بلخین پر مشتمل تھا ۳۰ رمضان کو روانہ ہوا اور مختلف دیہات میں پہنچ گیا۔ یہ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ ۲۲ شوال کو ایک اور وفد روانہ کیا گیا جو پانچ افراد پر مشامل تھا۔ ۲ ذیقعدہ کو ساتواں وفد بھیجا گیا۔ دارالعلوم کے طلباء نے ساجا جامدارس قائم ہوئے۔ وہ مقامات جہاں مدارس قائم کئے گئے یہ ہیں :-

علاقہ بھرتپور میں ڈیک، کبوا، بیرکھڑہ، کامہ، بلند پور، ماس، (الور میں) تسی، موضع سمرو، اعظم پہاڑی، گوبند گڑھ، بڑا د۔

تفصیل مدارس آگرہ اکثرہ کلاں، اکثرہ خورد، گتھلا، بریو تحصیل کھیرٹھ، غیاث پور، دستورہ۔

تفصیل مدارس ضلع مین پوری و ایٹھ امرنگھ کاٹھلا، جواہر پور، تمرا، مقنود پور، عرف نام کاٹھلا، موضع فیروز پور، سلونی، شہباز پور، دہروہی،

توک پور، مان پور، گہنوا، کھنڈ، بیڑہ، شکرولی، لولاری، کولادی، تلسی، دلیل نگر، کوندڑ، تھانہ نیکر،

(علیگڑھ میں) موضع ٹھکوان ڈاکخانہ ڈیری فام چرت۔

دوبارہ قبولِ اسلام | بہت سے مواضع کو شیعہ سے بچالیا گیا اور موضع

مولوی فیاض سلہٹی مبلغ دارالعلوم دیوبند کی کوشش سے دوبارہ مسلمان ہو گئے۔

لنگہ امر سنگھ کے ۲۴ مسلمان ہندو ہو گئے تھے پھر دوبارہ مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح چوتھا گاؤں موضع پھرواڑی کے ملکائے بھی دوبارہ مسلمان ہو گئے۔

ہندوؤں کا مسلمان ہونا | مرتدین کو دوبارہ مسلمان بنانے کے علاوہ ہندوؤں میں سے ۷۵، ۷۶ اشخاص مبلغینِ دارالعلوم کی کوششوں سے مشرف باسلام ہوئے۔

الغرض مولانا میرک شاہ صاحب، امیر وفد، مولانا محمد ابراہیم صاحب شیرکوٹی، مولوی مختار حسن صاحب شاہجہاںپوری، مولوی محمد شہین صاحب، مولوی عبد المجید صاحب مظفر آبادی، مولوی سرور حسین صاحب، شمس الحسن صاحب مبلغین دارالعلوم اور طلبہ دارالعلوم نے اسلام اور دارالعلوم دیوبند کا حق ادا کر دیا۔ ان حضرات نے ۱۵۸ علاقوں میں دو، ۷ کئے اور لوگوں کو شیعہ ہونے سے بچایا اور مساجد تعمیر کرائیں، مدارس جاری کئے۔

مذکورہ بالا مبلغین کے علاوہ دارالعلوم یا دارالعلوم کے ماتحت تبلیغ کرنے والوں کی تعداد ۷۷، آدمیوں کی تھی۔ جن میں مفتی عتیق الرحمن صاحب دیوبندی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، قاری محمد یامین صاحب مدرس دارالعلوم بھی تھے۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا دورہ اور ۲۷ مئی ۱۹۲۳ء کو آگے میں زیر دست تقریر | ہم نے اس تبلیغی مشن کی تمہید حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کی خاطر اور دارالعلوم دیوبند

کی خدماتِ جلیلہ کی خاطر اٹھائی ہے۔ الغرض علمائے دیوبند میں مولانا سید مرتضیٰ احسن صاحب، مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا عبد السمیع صاحب رحمہ اللہ علیہم اجمعین نے بھی دورے کئے اور تقریریں کیں مولانا حبیب الرحمن صاحب لکھتے ہیں :-

” ۲۷ مئی ۱۹۲۳ء کو بمقام آگرہ ایک عظیم الشان جلسے میں مولانا

شبیر احمد صاحب عثمانی کی زبردست تقریر ہوئی۔“ (ریپورٹ ص ۱۹)

علامہ شبیر احمد صاحب کی تقریر نے آگرے کے لوگوں کو سیدار کر دیا اور اس کام کی اہمیت کو مسلمانوں نے سمجھا اور ایسے اٹھے کہ آریوں اور ہندوؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ڈو بتی ہوئی کشتی کو بچا لیا۔ معلوم ہے کہ یہ زمانہ مئی کی سخت گرمی کا مہینہ تھا۔ علامہ اس گرمی میں وہاں پہنچے۔ کراچی کے مناظرے کے وقت بھی رمضان المبارک کے ایام تھے جو یقیناً مشقت کے دن تھے۔

نومبر ۱۹۲۱ء، جمعیتہ العلماء لاہور کے جلسے میں علامہ عثمانی کی معرکہ الآراء تقریریں

اخبار نسیم، ۲۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں مولانا نصر اللہ خان عزیز لکھتے ہیں :-

” (علامہ شبیر احمد عثمانی) ایک جادو بیان مقرر تھے۔ لاہور میں مولانا

ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیتہ العلماء ہند کی کانفرنس ہوئی تھی اس

میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تقریر نہایت معرکہ الآراء تھی۔“ (یہ

کانفرنس نومبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی)۔



سلسلہ ہائے تفتاریر | ہمارے پیش نظر اس وقت ایک کتاب
 "قاصۃ الظہما فی بلند شہر" | اس کتاب میں شیخ عبدالغنی خوجوی

اور حافظ محمد عظیم صاحب بلند شہری تاجر کے درمیان خط و کتابت ہے جس کا مقصد
 عبدالغنی صاحب خوجوی کی ذمہ داری علمائے دیوبند کو بلانے کی اور حافظ محمد عظیم
 صاحب بلند شہری تاجر کی ذمہ داری مولانا احمد رضا خاں صاحب کو بلانے
 کی تھی۔ علمائے دیوبند نے مناظرے کا وعدہ کر لیا لیکن مولانا احمد رضا خاں
 صاحب نہ آئے۔ پھر بلند شہر کے اصحاب میں سے احمد حسن صاحب امام العیدین،
 محمد خان آنریری مجسٹریٹ، حکیم سردار احمد خاں طبیب بلند شہر، حکیم نسیا ز احمد
 بلند شہری، حاجی پیر علی صاحب، حافظ اکبر علی صاحب بلند شہری نے اہل شہر
 کے سامنے فیصلہ سنایا کہ دیوبند سے مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی اور مولانا
 خلیل احمد صاحب بلند شہر میں مولانا احمد رضا خاں صاحب سے مناظرے کے
 لئے تیار ہیں لیکن حافظ عظیم صاحب کی تحریروں اور خطوط کے باوجود مولانا
 احمد رضا خاں صاحب نہ آ سکے۔ اس تمام روداد کے اول میں عبدالغنی صاحب
 لکھتے ہیں :-

"خوجویں ابتداء ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں چودھری عبدالرحیم
 صاحب مرحوم نے مدرسہ عربی خازن العلوم بذات خاص جاری کیا جس کا
 تکفل اپنی ذات سے وابستہ رکھا اور جناب مولانا عماد الدین صاحب
 شیر کوٹی اس کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ مولانا موصوف کا غایت تعلق
 مولانا شبیر احمد صاحب دیوبندی سابق مدرس مدرسہ فقہیوری زمانہ
 طالب علمی سے تھا۔ مولانا شبیر احمد صاحب بوجہ تعلق قدیم مولانا عماد الدین

صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائے اور خورجہ میں وعظ فرمایا۔
 مولانا عبدالدین صاحب بلند شہر کے حالات سے باخبر ہو چکے تھے مولانا
 شیر احمد صاحب کو بلند شہر کو وعظ فرمانے کے لئے مُہتر ہوئے اور دونوں
 صاحب بلند شہر تشریف لے گئے جن کے ہمراہ جماعت کثیر اہل خورجہ کی تھی
 جس میں بندہ بھی موجود تھا۔ بروز جمعہ وعظ ہوا جس کے بعد اس محلے
 کے متعلق جس کو اُسندہ پیش کیا گیا ہے بندہ اور حافظ محمد عظیم میں گفتگو ہوئی۔
 (قاصدۃ النظر مطبوعہ قاسمی صلا)

مولانا عثمانی تو تقریر فرما کر تشریف لے گئے لیکن ان کے بعد بعض دیوبندی
 اور بریلوی معتقدین میں دونوں مکتبہ ہائے خیال کے درمیان مناظرہ کرانے کا
 خیال پیدا ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا عثمانی نے کوئی ایسی بات وعظ میں نہیں
 فرمائی ہوگی جو اختلافی ہو کیونکہ ان کی عادت کسی اختلافی بات کے چھڑنے کی نہ
 تھی۔ یہ سلسلہ مولانا شیر احمد صاحب کے بعد ۱۳۲۸ھ تک شہر والوں نے لمبا
 کر دیا تا آنکہ فوت بمناظرہ رسید لیکن مولانا احمد رضا خاں صاحب تو تشریف
 نہ لائے البتہ ان کے معتقدین میں سے ایک صاحب مولوی کرامت علی عشرہ محرم
 میں آئے ان کے آنے سے پہلے بلند شہر میں ان کی آمد کا اشتہار شائع ہوا کہ وہ
 ان تمام امور سے نقاب اٹھائیں گے جو علمائے دیوبند قابلِ اعتراض باتیں
 کہتے ہیں۔ "قاصدۃ النظر" کی حسب ذیل عبارت پڑھئے۔

”مولوی کرامت اللہ خان صاحب ۹ محرم کو بلند شہر تشریف لا چکے
 اور بروز عشرہ جامع مسجد بلند شہر میں وعظ ہوا۔ ادھر مشہور واعظ
 مولانا محمد ابراہیم دہلوی بھی اسی روز بلند شہر پہنچ گئے۔ دیوبند سے جناب
 مولانا مولوی نور شاہ صاحب کشمیری مدرس مدرسہ دیوبند، جناب

مولانا مولوی شبیر احمد صاحب مدرس مدرسہ دیوبند، جناب مولانا ترقی
حسن صاحب چاندپوری مدرس مدرسہ دیوبند، محرم ۱۳۲۹ء کی شام کو
خورجہ پہنچ گئے۔ صبح عشرہ (۱۰ محرم) کو بندہ (یعنی شیخ عبدالغنی) حضرت
علمائے دیوبند اور مولانا عبدالرحمن خان صاحب رئیس خورجہ و مولانا
عماد الدین صاحب مدرس مدرسہ خازن العلوم کو لیکر بلند شہر پہنچا۔
(قامتہ النظر ص ۲۷)

محرم ۱۳۲۹ء، علامہ عثمانی کی
دوسری تقریر بلند شہر میں؛
۱۹۱۰ء، ۱۳۲۹ء کے بعد علامہ عثمانی
کی دوسری تقریر بلند شہر میں ہوئی۔
شیخ عبدالغنی لکھتے ہیں:-

”محرم ۱۳۲۹ء کی صبح کو سرائے کی مسجد میں قبل جمعہ مولانا مولوی
شبیر احمد صاحب نے نہایت پُر اثر و عطا فرمایا کہ جس کی تاثیر اور حقانیت کو
سامعین کے دلوں سے پوچھا جائے۔ بعد نماز جمعہ اس مسجد میں مولانا و بالفصل
اولئنا بحر العلوم زمانہ جناب سید انور شاہ صاحب مدفونہم العالیہ نے وعظ
فرمایا اللہ اللہ! اہل بلند شہر نے دیکھ لیا کہ علمائے ربانی یہ ہوتے ہیں حضرت
مولانا نے سنت و بدعت کی تحقیق نہایت فصاحت و بلاغت اور وضاحت
سے فرمائی جس کا بیان میں لانا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ عصر کا وقت
آگیا بعد نماز عصر پھر حضرت مولانا مولوی حکیم سید مرتضیٰ حسن صاحب نے ایک
مختصر مگر نہایت پر جوش تقریر فرمائی کہ جس سے لوگوں کے دل ہل گئے۔“

(قامتہ النظر ص ۲۷ و ۲۸)

مذکورہ عبارتوں سے حضرت عثمانی کے خورجہ اور بلند شہر میں تشریف لیجانا
اور وہاں تقریریں کرنے کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت مولانا عماد الدین صاحب انصاری نے جو بقیہ حیات ہیں فرمایا کہ جب میں ابتدائے ملازمت میں بڈھانے ضلع مظفرنگر میں پڑھاتا تھا تو میری وجہ سے اکثر وہاں تشریف لاتے۔ خصوصاً تربوزوں کے زمانے میں کہ بڈھانے کے تربوز بہت شیریں ہوتے تھے حالانکہ بڈھانے تک پہنچنے میں ٹیشن سے جائے قیام تک بیل گاڑی کا سفر کرنا پڑتا تھا اور راستے میں دریا بھی پڑتا تھا۔ بعض اوقات بیل دریا کو عبور کرتے ہوئے بھی میرے پاس تشریف لائے ہیں۔

یہ ہم نے علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تسلیغی **علامہ عثمانی اور تبلیغ عام کا حق** سرگرمیوں کے چند واقعات پیش کئے ہیں۔
 ورنہ متحدہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپ کی تسلیغی، سیاسی اور علمی تقریریں نہ ہوئی ہوں۔

گویا علامہ عثمانی نے ایک عالم ربانی کی حیثیت سے تمام ملک میں اللہ کے دین اور اس کے کلمے کو پہنچا دیا اور ساری عمر خدا اور اس کے رسول کی تعلیم حاصل کرنے اور پڑھانے اور دین پر کتنا میں نکھنے میں گزاری۔

فیض عثمانی کی ہمیشہ فراوانی | وہ اگرچہ دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی تفسیر گھر گھر ان کی یاد دلاتی ہے اور ان کا یہ کارنامہ قیامت تک جاری رہے گا۔ فعلیہ الترحمة۔



۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں بندہ یہ کتاب لکھ رہا تھا اس وقت مولانا موصوفی بقیہ حیات تھے لیکن اب جب میں ۱۹۶۹ء میں کتاب پر نظر ثانی کر رہا ہوں تو آپ کا انتقال جون ۱۹۶۳ء میں ہو چکا ہے۔ مصنف

آسمانِ علم و فضل پر آفتابِ عثمانی کی ضبابی

ہم نے آپ کے علم و فضل پر تجلیاتِ عثمانی " میں سب کچھ لکھ دیا ہے یہاں موصوف کے علم و فضل پر مزید خامہ فرسائی کی بظاہر ضرورت نہ تھی کیونکہ آپ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار زندگی کے جس بلند آسمان پر پہنچ چکا تھا وہ آفتاب آمد دلیل آفتاب ، گرد لیے خواہی از قوسے روستا کا مصداق بن چکا تھا۔

" تجلیات " میں ہم نے علماء ، فضلا ، سیاست داں ، محکّام ، اُدباء اور شعراء کے وہ تمام اقوال پیش کئے ہیں جن میں موصوف کی علمی لیاقت اور ان کے کمال سب نے بیک زبان خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے لیکن حیاتِ عثمانی " میں بھی قدرے روشنی ڈال کر سوانحِ زندگی کو مکمل کرنا مقصود ہے۔

مقامِ علم | قارئین نے گزشتہ اوراق سے اندازہ لگالیا ہے کہ علامہ کی شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی اور آپ کی علمی و خطابی اور قلمی طاقتوں کا لوہا تمام اہل علم و فضل نے مانا ہوا تھا۔ ذکاوت ، ذہانت ، سلامتی طبع ، حکمت اور اس پرشیریں کلامی اور قلمی زور کی آمیزش نور علی نور تھی۔ دماغ سلجھا ہوا اور دل روشن تھا اس لئے آپ کی علمی صلاحیتیں بے داغ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرین اور متاخرین ان کے علمی شاہکاروں کی طرف عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ مخالف مکتبہ ہائے فکر بھی ان کی فضیلت پر انجلی نہیں اٹھا سکے۔

بلکہ ان کی تصنیفات سے استفادہ کرتے ہیں۔ بریلوی مکتبہ خیال کے آدمی بھی ان کے تفسیری فوائد کو زیر مطالعہ رکھتے ہوئے دیکھ گئے ہیں۔

وہ جو کچھ فرماتے اور لکھتے پورے توازن اور پورے اعتماد کے ساتھ فرماتے اور تحریر کرتے تھے۔ پہلے بات کو پورے تولنے اور پھر تولتے تھے اور پھر اس پر ثبات قدم ہو جاتے تھے۔ علامہ کی تحریر اور تقریر میں کبھی متانت، سنجیدگی اور علمی وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔ ایک مضمون جس پر وہ قلم اٹھاتے، اور اسی عنوان پر کوئی دوسرا اظہار کرتا تو آپ اس میں بھاری نظر آتے تھے۔

اسی خیال کو استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ظاہر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:-

”تحریر کی شگفتگی مسلم تھی۔ ایک ہی مضمون کئی لکھتے اور اسی کو وہ قلمبند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی“

(رسالہ دارالعلوم ممبئی ۱۹۵۶ء)

مولانا محمد طیب صاحب کی مذکورہ تحریر میں حضرت عثمانی کی شگفتگی تحریر سے صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ ان کی تحریروں میں الفاظ آرائی ہی تھی بلکہ معنوی بلندی اور تحقیق مضمون کے ساتھ ساتھ تحریر میں فصاحت و بلاغت بھی ہوتی تھی۔ قاری محمد طیب صاحب کے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے ایسے مضامین پیش کرنے کے لئے قلم کو مجبور پاتے ہیں جن میں بعض متقدمین اور متاخرین یا معاصرین نے طبع آزمائی کی ہے اور اس پر علامہ عثمانی نے بھی عامہ فرسائی کی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں زبان، طرز بیان اور علمی و تحقیقی سامان میں تقابلی نظر ہے۔ سرسید اپنے دور کے سادہ اردو لکھنے والے سمجھے گئے ہیں اور علمی مقام میں ایک طبقے نے انہیں بہت اونچا کہا ہے۔ یوں تو ان کی کئی تصنیفات ہیں لیکن

زندگی کی آخری تصنیف جس کو وہ خود اپنا شاہکار زندگی تصور کرتے تھے ان کی تفسیر قرآن ہے جو صرف پندرہ پاروں تک لکھی گئی۔ اسی تفسیر میں سے ہم ہر سید کی بعض آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں جن پر علامہ عثمان نے بھی قلم اٹھایا ہے۔

قرآن کریم کے اردو اور فارسی میں ترجمے اور تفسیریں

تقابل کرنے سے پہلے ایک تاریخی مختصر خاکہ قرآن کریم کے اردو، فارسی میں تراجم اور تفاسیر کے بارے میں پیش کرتے ہیں،

جو حسب ذیل ہے :-

ترجمہ فارسی از شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۵۵ھ

سب سے پہلے فارسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ۱۱۵۵ھ میں کیا اور فوائد قرآنیہ مختصر آفتح الرحمن کے نام سے تحریر فرمائے۔ یہ ترجمہ مطبع مصطفائی میرٹھ میں چھپا جس کے حاشیے پر تفسیر عباسی شائع کی گئی۔

تفسیر فارسی از شاہ عبدالعزیز صاحب ۱۲۰۵ھ

بعد ازاں شاہ ولی اللہ کے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز نے تفسیر عزیزی کے نام سے فارسی میں تفسیر لکھی جو نامکمل رہی۔

ترجمہ اردو از شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدین ۱۲۰۵ھ

سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ فارسی کو بھی زوال آیا اور اردو نے ترقی کی تو شاہ ولی اللہ کے دوسرے صاحبزادے

شاہ عبدالقادر صاحب نے ۱۲۰۵ھ میں اردو میں ترجمہ کیا اور اردو میں تفسیری مختصر فوائد لکھے جو موضح القرآن کے نام سے موسوم ہیں۔ اور غالباً دو سال بعد ۱۲۰۶ھ میں شاہ رفیع الدین صاحب اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کے بعد ۱۸۰۴ء

اردو میں کتنی تفسیریں اور ترجمے ہوئے جن میں مولانا اشرف علی صاحب کی تفسیر بیان القرآن اور اردو ترجمہ فاضل دیوبند، مولانا عبدالحق صاحب مفسر تفسیر حقانی فاضل دیوبند، شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر ماثلاً فاضل دیوبند اور اس پر علامہ شبیر احمد عثمانی فاضل دیوبند کا ترجمہ، سرسید کی پہلے پندرہ پاروں کی تفسیر، میرزا جبریل دہلوی، مولوی فتح محمد جالندھری، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا عاشق الہی میرٹھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی فیروز الدین، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمے، تفسیریں اور فوائد طبع ہوئے۔

پاکستان اور ہندوستان میں جو ترجمے عموماً شائع اور ذائع ہیں ان میں شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولانا اشرف علی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن اور تفسیری فوائد علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہیں۔ آئندہ ادراک میں ہم سرسید اور علامہ عثمانی کی تفسیروں کے حصے پیش کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہی مضمون پردوں نے قلم اٹھایا ہے اور کون زیادہ کامیاب ہے۔

پہلا موازنہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا
وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا
بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (سورہ مائدہ ۷۰)

(یعنی) اے اہل ایمان جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں اور اپنے
ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور پاؤں
کو ٹخنوں تک دھوؤ۔

سر سید کی تفسیر

علامہ عثمانی کی تفسیر

(فَاغْسِلُوا وُجُوْهَكُمْ) اس آیت اور اس کی بعد کی آیتوں میں طہارت کا ذکر ہے۔ کوئی شخص قرآن مجید کی آیتوں اور ان حدیثوں سے جو طہارت کے باب میں ہیں یہ نہیں خیال کر سکا کہ طہارت سے مقصود اصلی صرف منہ اور ہاتھ پاؤں کا دھونا یا نہانا یا ظاہری نجاست کا بہانا ہے بلکہ اس سے مقصود اندرونی نجاست کا دور کرنا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ”بنی الدین علی النظافۃ“ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ ”الطہور و شطرا لایمان“ ظاہر ہے کہ ایمان یقین قلبی یا اعتقاد کا نام ہے۔ پس جو امر کہ دلی یقین قلبی اعتقاد پر مبنی ہو نہ اس کی بنیاد ظاہری نظافت پر ہو سکتی ہے اور نہ ظاہری طہارت کا اس کا جز ہونا ممکن ہے۔ ایمان ایک روحانی امر ہے اور اسی لئے روحانی نظافت اس کی بنیاد اور روحانی طہارت اس کا جز

امت محمدیہ پر جو عظیم الشان احسانات کئے گئے ان کا بیان سکرا ایک شریف اور حق شناس مومن کا دل شکر گزاری اور اظہار وفاداری کے جذبات سے مبرز ہو جائے گا اور فطری طور پر اس کی خواہش ہو گی کہ اس منع حقیقی کی بارگاہ رفیع میں دست بستہ حاضر ہو کر جبین نیاز خم کئے اور اپنی غلامانہ منت پذیری اور انتہائی عبودیت کا عملی ثبوت دے۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دربار میں حاضری کا ارادہ کرو یعنی نماز کے لئے اٹھو تو پاک صاف ہو کر آؤ جن لذائذ دنیوی اور مغربات طبعی سے متمتع ہونے کی آیت وضو سے پہلی آیت میں اجازت دی گئی یعنی طہیات اور محسنات وہ ایک حد تک انسان کی ملکوتی صفات سے دور اور ہیبت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور کل احداث (موجبات و مفعول) ان ہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں

ہو سکتی ہے۔ (اگے چکر لگتے ہیں) پس صاف ظاہر ہے کہ اللہ جس طہارت کو دوست رکھتا ہے وہ ہاتھ پاؤں پر پانی ڈالنا اور بدن پر پانی بہانا نہیں ہے بلکہ وہ دلی و روحانی طہارت ہے جس کو دوست رکھتا ہے۔ ہاں ظاہری طہارت کا بھی او یا تعمیسی جبکہ کوئی شخص کسی عبادت میں اور خصوصاً فرض عبادت میں مصروف ہو خدا نے حکم دیا ہے اور وضو کو شرط نماز یا طہارت کو مفتاح صلوٰۃ قرار دیا ہے یہ حکم بھی شل احکام محافظہ کے ہے جو غلط سے علاقہ رکھتے ہیں جیسے قیام و قعود سجود وغیرہ۔

تفہیم

ایک ہی آیت پر یہ دونوں تفسیریں آپ کے سامنے ہیں۔ سرسید کی تفسیر کی ظاہری خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان سادہ اور اس کی اردو بالکل عام فہم ہے۔ دوسرے پیرے کی عبارت کا آخری جز اپنی عبارت کے اعتبار سے چست ہے لیکن تیسرے پیرے کی عبارت میں ڈھیلا پن ہے۔ تینوں پیروں کی اردو میں یکسانیت اور ہموازی نہیں ہے۔

اس آیت تطہیر کا پہلی آیات سے رابطہ بیان نہیں کیا گیا جس کے باعث معانی کے تسلسل میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔

سرسید نے جیسا کہ ان کی تفسیر کے اس ٹکڑے سے ”کہ طہارت سے مقصود اصل صرف منہ اور ہاتھ پاؤں کا دھونا یا نہانا یا ظاہری نجاست کا بہانا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود اندرونی نجاستوں کا دور کرنا ہے۔“ صاف ظاہر ہے کہ طہارت کو صرف باطنی طہارت میں منحصر کر کے تفسیر کے جامع و مانع پہلو کو احتیاط ہی نہیں بلکہ اصلیت سے گرا دیا ہے۔ الطہور شطی الایمان وغیرہ کی حدیث کا صحیح مطلب وہ نہیں ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔ حکیمانہ انداز تو اس امر کا مقتضی تھا کہ تطہیر قلبی روحانی کا سرشتہ بھی ہاتھ سے نہ چھوڑتے اور آیت کے ظاہری صحیح محمل و مصداق یعنی تطہیر ظاہر پر بھی روشنی ڈالتے۔ معنی کے جس پہلو پر سرسید نے زور دیا ہے اس میں شدت اور یک جہانی کا پہلو زیادہ روشن نظر آ رہا ہے۔

اس عبارت سے تو انحصار تطہیر روحانی معلوم ہوتا ہے مگر آگے چل کر پھر یوں بھی فرماتے ہیں :

”ہاں ظاہری طہارت کا بھی اور بالتحصیص جبکہ کوئی شخص کسی عبادت

میں اور خصوصاً فرض عبادت میں مصروف ہو خدا نے حکم دیا ہے اور وضو

کو شرط نماز یا طہارت کو مفتاح صلوٰۃ قرار دیا ہے“

قاری اب خود فیصلہ کر لے کہ آیا ان دونوں تحریروں میں اجتماع ضدین اور تناقض و تباین نہیں ؟ اس کے برعکس اب مولانا عثمانی کی تفسیر پر نظر ڈالئے اور ظاہری و معنوی احتیاطات کا امتزاجی رنگ ملحوظ رکھئے۔

حضرت عثمانی کی اردو عبارت میں فصاحت، بلاغت، جامعیت اور سبب پائی جاتی ہے۔ کلام میں شکوہ لفظی و معنوی ابھر رہا ہے۔ علمیت کا پہلو نمایاں نظر آ رہا ہے۔ ظاہری تطہیر کے پہلو اور آیت کے صحیح مصداق کو پیش نظر رکھتے ہوئے تطہیر قلبی و روحانی کو کس حکیمانہ انداز میں ادا کیا گیا ہے کہ تفسیر آیت اور حکمت کے تمام

تقاضوں کا پورا احساس قائم ہے۔ پھر پہلی آیات سے ربط میں جو سرسید کے یہاں خلا تھا اس کو عثمانی کی تفسیر میں پُر کر کے پاٹ دیا ہے۔

علامہ عثمانی نے دونوں پہلوؤں پر برابر کا رنگ دیا ہے۔ عبارت میں ناہمواری نہیں۔ اوپر سے نیچے تک عبارت کی موجیں برابر کا مد و جزر دکھا رہی ہیں۔ احتیاط مقام اور حکمتِ کلام کی نزاکت کا احساس پوری عبارت میں موجود ہے۔ بہر حال ظاہری اور بدیہی طور پر مولانا کا پلہ مہجاری نظر آتا ہے۔

دوسرا موازنہ

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ط فَآمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ؕ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذْكُرُ إِلَّا أَهْلَ الْكِتَابِ ۚ

(ترجمہ) وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہ ہیں۔ لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں مگر اسی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے۔ اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سبجز اللہ کے (لیکن) پختہ اہل علم کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے کہ ہر ایک ہمارے رب کی طرف سے اتری ہیں۔ اور اہل عقل ہی سمجھتے ہیں۔

آیات مذکورہ کے متعلق

موسس کی تفسیر — اور — علامہ عثمانی کی تفسیر

نصاریٰ نجران نے تمام دلائل سے عاجز ہو کر بطور معاذرہ کہا تھا کہ آخر آپ حضرت مسیح کو ”کلمۃ اللہ“ اور ”روح اللہ“ مانتے ہیں پس ہمارے اثبات مدعا کے لئے یہ الفاظ کافی ہیں۔ یہاں اس کا تحقیقی جواب ایک عام اصول اور ضابطہ کی صورت میں دیا ہے جس کے سمجھ لینے کے بعد ہزاروں نزاعات و مناقشات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الہیہ میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جن کی مراد معلوم و متعین ہو خواہ اس لئے کہ لغت و ترکیب وغیرہ کے لحاظ سے الفاظ میں کوئی ابہام و اجمال نہیں نہ عبارت کئی معنی کا احتمال رکھتی ہے نہ جو مذلول کبھی گیا وہ عام قواعد مسلمہ کے مخالف ہے اور یا اس لئے کہ عبارت و الفاظ میں کوئی لکھ گئی معنی کا احتمال ہو سکتا تھا لیکن

محکمات اور متشابہات کی بحث بہت دقیق اور طویل ہے۔ علمائے اس کے بیان میں بہت بڑی علمیت خرچ کی ہے۔ مگر مختصریات یہ ہے کہ عربی زبان کے محاورے میں محکم اس بات کو کہتے ہیں جو ایسی صاف ہو جس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آدے اور دوسرے مطلب کو نہ آنے دے اور متشابہ اس بات کو کہتے ہیں جس کے کئی مطلب سمجھ میں آتے ہوں اور جو بلی تمیز ہو سکتی ہو کہ کونسا مطلب مقصود ہے۔ یا جو معنی اس کے الفاظ سے متبادر ہوتے ہوں وہ مقصود نہ ہوں بلکہ وہ الفاظ بطور مثال یا بطور مجاز و استعارہ کے آئے ہوں

(مثلاً) سب سے بڑا اصول مسلمانی مذہب کا توحید ہے اور اس کے بعد اعمالِ حسنہ، وہ اس خوبی و عمدگی اور

مگر زہار ایسی تاویلات اور ہر چیز کی
جو مذہب کے اصول مسئلہ اور آیات محکمہ
کے خلاف ہوں مثلاً قرآن کریم نے مسیح
علیہ السلام کے متعلق تصریح کر دی "إِنَّ
هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ" یا
"إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ
آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ".....
اور جامعان کی الوہیت اور ان کی
انیت کا رد کیا اب ایک شخص ان سب
محکمات سے آنکھیں بند کر کے "تَحْلِيْمُهُ
الْقَهْرَ إِلَىٰ مَرْتَبَةٍ وَدَرْجَةٍ مِثْلُهُ"
وغیرہ مشابہات کو لے دوڑے اور اس
وہ معنی چھوڑ کر جو محکمات کے موافق ہوں
ایسے معنی لینے لگے جو کتاب کی عام تصریحات
اور متواتر بیانات کے منافی ہوں تو یہ
کج روی اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا
ہوگی۔ بعض قیاسی قلبی چاہتے ہیں کہ اس
طرح مغالطہ دیگر لوگوں کو گمراہی میں چھپا
دیں اور بعض مکر و عقیدہ والے ڈھلے
یقین ایسے مشابہات سے اپنی رائے و
ہوا کے مطابق کھینچ تان کر مطلب نکالنا

نہے اور کوئی معنی ہمارے خیال میں نہیں
آسکتے مگر خدا تعالیٰ اس طرح سے تخت
پر بیٹھنے اور ایسے منہ کے ہونے سے مبرا
ہے۔ حشر اجساد، نعم جنت، غلبہ
دورخ کا جن آیتوں میں بیان ہوا ہے
وہ سب آیتیں مشابہات میں سے ہیں۔
..... جن لوگوں کی دلوں
میں کجی ہے وہ خرابی ڈالنے کے لئے ان کے
پچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کی غلط تاویل
کرتے ہیں اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ
کہتے ہیں کچھ بیان ہوا ہے وہ سب خل کے
پاس سے پہلے اس لئے وہ اس قسم کی تاویلوں
کے درپے نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ علت
العلل جسے خدا کہتے ہیں وہ خدا لاشرکی ہے
وہی علت العلل تمام چیزوں کی خالق ہے
ایسی علت العلل کے ضرور ہو کہ اس میں ایسی
چیز بھی ہو جس کو ہم زندگی کہتے ہیں، ایسی
چیز نہ ہو جس کو ہم موت کہتے ہیں۔ اس میں
کوئی ایسی چیز بھی ہونی ضروری ہو جس
کو ہم لفظ سمح و بصر و علم، رحم و غضب،
قہر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا

امر بھی ہونا ضرور ہے کہ جن کاموں کو ہم ہاتھ پاؤں منہ وغیرہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اس میں بھی منسوب کر سکیں کیونکہ اس کے علت العلل و خالق جمیع اشیاء کے ہونے کو ایسی چیزوں کا اس میں ہونا لازم ہے اس لئے ہم اس کے حوالیہ لایوت، سمیع، بصیر، علیم، رحمن، ورحیم، قہار و جبار ہونے پر یقین کرتے ہیں۔ مگر اس امر کی کہ اس کی حیات کیا ہے اور عدم موت کیا ہے اس کا سمیع و بصیر علیم ورحمن ورحیم و جبار و قہار ہونا کیا ہے اور کیسا ہے کچھ تاویل نہیں کرتے اور کہتے ہیں لَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهُ إِلَّا اللّٰهُ ہاں اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سا نہیں۔ پس ہمارے نزدیک آیات متشابہات پر ایمان لانے کے یہی معنی ہیں اور فطرت انسانی کا یہی اقتضا ہے۔

چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا صحیح مطلب صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ وہ ہی اپنے کرم سے جس کو جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہے کر دیتا ہے جو لوگ مضبوط علم رکھتے ہیں وہ محکمات و متشابہات سب کو حق جانتے ہیں انہیں یقین ہے کہ وہ لوگوں قسم کی آیات ایک ہی جیسے سے آئی ہیں جن میں تناقض و تہافت کا امکان نہیں اس لئے وہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا کر مطلب سمجھتے ہیں۔ اور جو حصہ ان کے دائرہ فہم سے باہر ہوتا ہے اسے اللہ پر چھوڑتے ہیں وہی بہتر جانتے ہیں ایمان بے کام ہے.....
.... رَاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ اِنِّیْ اَنْزَلْنٰہُ عَلٰی اُورْقُوتِ الْاِیْمَانِ پُر مغرور مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے فضل و عنایت کے طلبگار رہتے ہیں تاکمائی ہوئی پونجی ضائع ہو جائے اور خدا نکر وہ دل سیدھے ہونے

(تفسیر سرسید جلد اول، آل عمران
رکوع ۹)

کے بعد کج نہ کروئے جائیں حدیث
میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
(امت کو سنانے کے لئے) اکثر یہ
دعا کیا کرتے تھے ”يَا مُقَلِّبُ
الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى
دِينِكَ“

(فوائد القرآن عثمانی مطبوعہ مدینہ
پریس بیجور، آل عمران رکوع ۹)

ادبی تنقید

سرسید کی عبارت سادہ اور سلیس ہے۔ محکمات اور متشابہات کی تعریف
آسان لفظوں میں سمجھائی گئی ہے۔ مضمون ذہن نشین کرنے کیلئے بہت سی مثالیں تائیداً
پیش کی ہیں۔ حتیٰ کہ جہاں نقاط دئے گئے ہیں وہاں سرسید کی دی ہوئی مزید امثلہ
کو زیادہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے تاہم ان تائیدی امثلہ کے چھوڑنے سے توازن پر کوئی
اثر نہیں پڑتا ہے۔ بہر حال مفہوم دل نشین کرنے کے لئے عبارت میں وسعت
سے کام لیا ہے۔

سرسید کا پہلا ہی جملہ بولتا ہوا ہے لیکن دوسرا جملہ یعنی ”علمائے اس کے
بیان میں بہت بڑی علمیت خرچ کی ہے“ ادبیت سے ذرا اگر گیا ہے۔ ”علمیت
خرچ کی ہے“ تو پھر بھی نہ کہتا تھا لیکن ”بہت بڑی علمیت خرچ کی ہے“ قطعاً
نامانوس ہے۔ تمام عبارت میں بعض جملے فصیح و سادہ ہیں اور بعض غیر فصیح۔
سرسید کے اس جملہ میں کہ ”سب سے بڑا اصول مسلمانی مذہب کا توحید ہے“

مسلمانی مذہب کی ترکیب نامناسب ہے۔ اس جملہ کو یوں ادا کرنا چاہئے تھا کہ ”سب سے بڑا اصول مذہب اسلام کا توحید ہے“ لیکن پھر بھی ترتیب عبارت کے اصول کے پیش نظر یوں ہونا چاہئے ”مذہب اسلام کا سب سے بڑا اصول توحید ہے“ محکم کی تعریف کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں ”عربی زبان کے محاورے میں محکم اس بات کو کہتے ہیں جو ایسی صاف ہو جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آوے اور دوسرے مطلب کو نہ آئے دے“

اس عبارت کے آخری قطعہ یعنی ”جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آوے اور دوسرے مطلب کو نہ آئے دے“ کو قاری خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ یہ جملہ فورٹ ولیم کالج سے پہلی ابتدائی اردو کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ سید سے طریقہ پر یوں کہا جاتا ہو کہ ”محکم ایسی بات کو کہتے ہیں کہ جس کے صرف ایک ہی معنی ہوں اور دوسرے معنی کی اس میں کوئی گنجائش نہ ہو۔ اسی طرح آوے لاوے وغیرہ الفاظ غیر فصیح ہیں۔

سرسید کی تفسیر پر معنوی تنقید

تفسیر کے اس حصہ کی معنویت کا جہاں تک تعلق ہے تو سرسید کی محکم کی تفسیر محاورہ عرب کے مطابق ہے جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے مگر اصطلاحاً تعریف جامع و مانع نہیں کیونکہ ایک لفظ کے محاورہ عرب میں کچھ معنی ہیں لیکن اصطلاح قرآن میں اس کے کچھ اور معنی ہوں تو یہ تعریف مدعا کو فوت کر کے رکھ دے گی مثلاً صلوٰۃ کے معنی عربی لغت میں دعا کے ہیں لیکن اصطلاح قرآن میں اس خاص طریقہ کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے جس میں شکر، تحمید، رکوع، سجود، قومہ، جلسہ، سلام وغیرہ ہوں اور اوقات خمسہ کے مطابق جس میں رکعات کی تعداد کا لحاظ رکھا جائے۔ اسی طرح بالفرض محاورہ عرب میں ایک لفظ کے خاص معنی ہیں لیکن حدیث یا

قیاس یا اجماع اُمت میں اس کے معنی از روئے اصطلاح دوسرے ہوں اور وہی متعین کرنے گئے ہوں تو یہ تعریف کس طرح جامع ہوگی۔ حالانکہ لغت کے اعتبار سے اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے تعریف کا کوئی گوشہ تاریک نہیں چھوڑا۔

پھر متشابہات کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کے عرش اور اس کے لوازمات جو تعریف متشابہ کی سرسند نے کی ہے وہ ٹھیک ہے مگر اس کے ضمن میں جو حشر اجسام یعنی قبروں پر مردوں کا اجسام کے ساتھ اٹھنے کی مثال متشابہ میں دی ہے وہ جسامیر مفسرین، علماء، عقائدِ حقہ وغیرہ کے قطعاً خلاف ہے بلکہ قرآن کریم کی محکم آیات میں صاف طور پر مردوں کا انہیں اجسام کے ساتھ اٹھنا کفار کے مقابلہ میں معرکہ آرا نظریہ و عقیدہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح نعیمِ جنت اور عذابِ نرغ کو متشابہات میں سے قرار دینا درست نہیں۔

علامہ عثمانی پر ادبی تنقید

علامہ عثمانی نے جن الفاظ، جملوں اور عبارت میں مذکورہ آیات اور محکم و متشابہ کی تفسیر کی ہے وہ عبارت جامع، مانع، شگفتہ اور بلیغ ہے۔ اس میں وہی ادبی شکوہ ہے۔ یکسانیت کے ساتھ ایک ہی سادہ و قیادیت چلا جا رہا ہے۔ ایسا نہیں کہ کہیں ہونٹ چاٹتے رہ جائیں اور کبھی منہ سے لقمہ اگل دینے پر مجبور ہو جائیں۔ ہاں البتہ بعض الفاظ علامہ کے یہاں مشکل ہیں مثلاً نصوص مستفیضہ، اجماع معصوم وغیرہ۔

معنوی تنقید

علامہ عثمانی نے آیاتِ محکمات اور متشابہات کی جو تفسیر کی ہے وہ اصول تفسیر

کے مطابق جامع اور مانع تفسیر ہے جن کا ماخذ کتب متداولہ متقدمین متاخرین ہے۔ اور درحقیقت مختصر عبارت میں محتاط اسلوب کے ساتھ اس کی تعریف اس سے زیادہ جامع و مانع اور کیا ہو سکتی ہے جس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ سرسید کی تفسیر میں پہلی آیات سے رابطہ نہ دینے کی وجہ سے تفسیر میں خلا باقی رہ گیا ہے، لیکن عثمانی نے وفدِ نجران کے تاریخی پس منظر سے رابطہ ظاہر کر کے نہ صرف خلا کو بھر دیا ہے بلکہ آیات کی تفسیر میں جو جامعیت یہاں ہے وہ سرسید کی تفسیر میں نہیں ہے۔

مذکورہ بالا ہر دو تفسیری تقابل کے بعد اب ہم سرسید اور
تفسیر اموازنہ | جناب عثمانی کے دونوں کے تصادم میں دو عبارتیں پیش

کرتے ہیں۔ حضرت سرسید اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اس مفہوم کو پیش کرتے ہیں کہ مذہب میں جو چیزیں انسان کی عقل میں نہیں آتیں وہ دراصل کچھ اور ہی مطلب رکھتی ہیں ورنہ شریعت عقل سے باہر چیزوں کی انسان کو تکلیف نہیں دیتی بلکہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی شریعت تکلیف دے یا کوئی نظریہ اور حقیقت بیان کرے وہ سمجھ میں آ سکے۔ موصوف کے یہاں فرشتے، جنات وغیرہ جن کو وہ انسانی سمجھ سے باہر خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک فرشتوں سے نیکی اور جنات سے برائی مراد ہے۔ اسی طرح وہ معجزات کے بھی قائل نہیں کہ انسانی ادراک سے باہر اسی خیال کو سرسید نے حسب ذیل عبارت میں پیش کیا ہے اور مولانا عثمانی نے اس کی تردید کی ہے اور کہل ہے کہ شریعت کی کوئی چیز ایسی نہیں جو محقول نہ ہو البتہ عقلیات کا معیار مختلف ہے۔ دونوں صاحبان لکھتے ہیں :-

علامہ عثمانی

سرسید

میرا سرسید سے یہ سوال ہے کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے واسطے

ہمارا یہ اصول نہایت چنچا ہوا ہے کہ انسان صرف بسبب عقل کے

جو اس میں ہے مکلف ہوا ہے پس

جس بات پر وہ مکلف ہوگا ضروری

ہے کہ فہم انسانی سے خارج نہ ہو

معلول کا وجود بغیر علت کے لازم

آتا ہے جو محال و متنع ہے۔ پس جن

اخلاق کے پکڑنے اور پھوڑنے پر

انسان مکلف ہے وہ ضرور عقل

انسانی سے خارج تھیں۔

(تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۱۲۷)

علت قرار دیتے ہیں اس سے کیا مراد

ہے۔ آیا فقط قوتِ ارادہ کا انسان

میں موجود ہونا یا اس سے ہر چیز

کو تفصیلاً جاننا۔ اگر پہلی صورت

اختیار کی جائے تو بعض احکامِ اخلاقی

کے فائدہ و عیل پر مطلع نہ ہونے سے

علت و معلول میں جدائی کس طرح

لازم آئی اور اگر خدا خواستہ سرسید

نے دوسری شق کو لیا ہے تو میں تسلیم

نہیں کرتا کہ جو علت تکلیف کا سرسید

نے قرار دی ہے وہ صحیح ہے۔

(القول و نقل مقالات عثمانی ص ۲۹۱)

سرسید پر ادبی تنقید

جہاں تک ادبیت کا تعلق ہے سرسید کی مذکورہ

عبارت میں بعض ترکیبیں مثلاً ”بسبب عقل

کے جو اس میں ہے“ بیوقوفی ترتیب ہے، اسی طرح ”ہمارے اصول نہایت جنچا ہوا

ہے“ کی بجائے ”جنچا تلا ہے“ ہونا چاہئے۔ ”اخلاق پکڑنے“ کی ترکیب بھی اچھی

نہیں بلکہ ”اخلاق اختیار کرنے“ کے الفاظ موزوں تھے۔ غرض عبارت میں جھول

نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس حضرت عثمانی کی عبارت اوپر سے نیچے تک مربوط اور چست ہے

کہیں بھی لمبی نظر نہیں آتی۔ اس لئے ان کا طرزِ نگارش بہتر ہے۔

معنویت | معنویت میں بھی مولانا عثمانی کا پلہ بھاری نظر آتا ہے کیونکہ

سرسید مرحوم کا یہ فرمانا کہ مذہب کی ہر چیز انسان کے ذہن میں آجاتے ضروری نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے افراد انسانی کے اذہان اور عقول دہاں تک نہ پہنچ سکیں اگرچہ مذہب کی وہ باتیں قطعاً حکمت آمیز ہوں۔

مولانا نذیر احمدؒ مولانا شبیر احمدؒ

مولانا عثمانی اور سرسید کے مذکورہ بالا مشترک اور ہم مضمون خیالات کے موازنے سے گذر کر اب ہم قارئین کرام کو ضیافتِ طبع کے لئے مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی طرف لئے چلتے ہیں جو کہ راقم الحروف کے ہم ضلع یعنی قصبہ دیرانہ رٹھ ضلع بجنور تحصیل نگینہ کے رہنے والے تھے اور جن کو مہدی حسن مرحوم نے اردو کے عناصر خمسہ میں سے ایک عنصر کہا ہے۔ وہ مولانا نذیر احمد کے متعلق لکھتے ہیں:-

” اعلیٰ درجے کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرتِ بیان، وسیع

ذخیرۃ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدتِ خیال اور ظریفانہ نکتہ بینیوں

کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی ہیں؟ (افادات مہدی)

ڈاکٹر عبدالحق سیکریٹری انجمن ترقی اردو مولانا نذیر احمد صاحب کے متعلق

لکھتے ہیں:-

” روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح و شام ہماری آنکھوں کے

سامنے بہا رہے گھروں میں اندر اور باہر واقع ہوتے رہتے ہیں ان

کا بیان کرنا مولانا نے مرحوم پر ختم ہے۔“

رام بابو سکینہ ہسٹری آف اردو لٹریچر (تاریخ ادب اردو) میں مولانا

موصوف کے متعلق لکھتے ہیں:-

کا ترجمہ شروع کر دیا۔

اپنی چھاچھ کو کون کھٹا کہا کرتا ہے ہر کس را عقل خود بجمال، میں تو اپنے ترجمہ کی تعریف کروں ہی گا۔ مگر اپنے منہ میاں مٹھو کا طعنہ کون مٹے۔ میں تو بس اتنا ہی کہتا ہوں کہ میں نے ترجمے کے عیب و صواب ترجمے کی مشکلات کلام الہی کی عظمت ان سب باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ کر خالصہ لوجہ اللہ ترجمہ کے لئے قدم اٹھایا ہے وقت اور محنت اور زر کے صرف کرنے میں کسی طرح کا دریغ نہیں کیا۔

مقالہ نگار کو اس سے بحث نہیں کہ ڈاکٹر نذیر احمد کا ترجمہ کیسا ہے۔ صحیح یا غلط جیسا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے بہت سے علما نے ان پر کڑی تحقیر کی ہے اور بہت سی غلطیاں نکال کر رکھ دی ہیں۔ مولانا تھانوی نے ایک مستقل رسالہ ”اصلاح ترجمہ دہلویہ“ سے مخون تحریر فرمایا جس کا حوالہ مہینا المنذیر، میں سید افتخار عالم بلگرامی نے دیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

”ہاں مولوی محمد اشرف علی صاحب تھانوی کا ایک رسالہ ”اصلاح ترجمہ دہلویہ“ کے نام سے ہماری نظر سے اور گذرا ہے۔ اس میں مولانا نے صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ با محاورہ بے محاورہ ہونے کا فیصلہ کرنا تو اہل زبان کا کام ہے مگر دو چار متفرق مقام پر نظر ڈالنے سے اتنا معلوم ہوا کہ اس میں خود مطالب قرآنیہ بھی کہیں متن سے اور کہیں حاشیہ بتولی گئے ہیں۔ چونکہ ایسی حالت میں بجائے منفعت کے عام مسلمانوں کو اس سے مضرت پہنچنے کا قوی اندیشہ تھا اس لئے اس کا افساد ضروری ہوا۔ عام مسلمانوں کے حفاظت دین کی ضرورت سے ترجمہ مذکورہ بالا بالاستیجاب اول سے آخر تک دیکھنا پڑا جن لغزشوں کا گذر عقائد و احکام تک نہ تھا ان سے

زیادہ تعرض نہیں کیا گیا مگر جن کا اثر عقائد و احکام تک پہنچتا ہوا دیکھا
اور کوئی تو حیرت قریب بھی نہ بن سکی ان کو ضبط کیا گیا“ (اصلاح ترجمہ دہلویہ)
رام بابو سکینہ لکھتے ہیں :-

”مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا اردو ترجمہ قرآن شریف ہے
جو نہایت آسان اور بامحاورہ زبان میں کیا گیا ہے۔ مولانا نے چار عالموں
کی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت و جانکاهی سے تین برس کے عرصہ میں پورا
کیا۔ مگر اس میں بھی اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی متانت قائم نہ
رہی اور اصل الفاظ کا مطلب اردو الفاظ و محاورات کے بجا تصرف سے
جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافہ تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ
ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے“

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ”البوادر النور“ میں بھی اس ترجمہ
پر تبصرہ فرمایا ہے۔ غرض بہت سے محقول لوگوں نے اعتراضات کئے ہیں۔
علمائے ندوہ نے بھی بچاس اعتراضات چنے تھے جن کا حوالہ ”محیات النذیر“
کے مرتب نے دیا ہے۔ آخر کار مرتب نے یہ لکھ کر آگے قدم بڑھایا ہے :-
”اب رہی یہ بات کہ فاضل مترجم نے درحقیقت ترجمہ القرآن میں
کوئی غلطی کی ہے یا نہیں اس کا تصفیہ ہم سے متعلق نہیں۔ یہ کام ہے علماء
تفسیر و قرآن کا“

یہ غلطیاں ڈاکٹر نذیر احمد سے کیوں ہوئیں اس کا جواب ڈاکٹر نذیر احمد کا مقدمہ
قرآن خود دے گا۔ ڈاکٹر صاحب مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

”پس یہ ترجمہ براہ قرآن کا ترجمہ ہے نہ دوسرے ترجموں کی طرح کسی ترجمہ
کا ترجمہ۔ اس کا ماخذ قرآن کے الفاظ ہیں نہ کسی مفسر یا مترجم کے۔ پھر ہم

دونوں (یعنی مولانا نذیر احمد اور ابو عبد الرحمن محمد نجابی) نے ترجمہ پر نظر ثانی کی۔ مولوی محمد صاحب ترجمہ پڑھتے اور میں عبارت کی سلاست اور الفاظ کی نشست کا دھیان رکھتا اور ترجمے کو الفاظ قرآن سے ملاتا اور پھر ہم دونوں میں پہلے کی طرح بحث ہوتی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بحث میں رنجش ہو جاتی :-

آگے چل کر ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں :-

”ایسی کاوش کے ساتھ ترجمہ اور نظر ثانی کرنے پر بھی ہم نے بہتیرا چاہا کہ لوگ ترجمے کو دیکھیں اور نکتہ چینی کریں مگر کسی نے ہامی نہ بھری۔“
ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ترجمہ قرآن میں ڈاکٹر نذیر احمد نے خود اعتمادی کے ہاتھوں ٹھوکریں کھائی ہیں کہ محض اپنے اور محمد صاحب کے طے کئے ہوئے ترجمہ پر بھروسہ کر بیٹھے۔ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کی طرف رجوع نہیں کیا۔ پھر مولوی محمد صاحب بھی ڈاکٹر صاحب سے بگڑ بگڑ بیٹھے تھے معلوم ہوا کہ وہ بھی ان کے ترجمہ سے اتفاق نہ کرتے ہوں گے۔ پھر اس عبارت سے کہ ”ہم نے بہتیرا چاہا کہ لوگ ترجمے کو دیکھیں اور نکتہ چینی کریں مگر کسی نے ہامی نہ بھری“ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اپنے ترجمے میں تذبذب تھا اور دوسرے بھی بے اطمینانی کے باعث دیکھنا یا تنقید کرنا پسند نہ کرتے ہوں گے اور یہ ان کے زمانہ کے علماء ہی ہوں گے۔

میرا مقصد ڈاکٹر نذیر احمد کے قرآن کے ترجمہ اور تفسیر پر اس تنقید سے صرف اس قدر ہے کہ میں یہ بتا سکوں کہ علامہ عثمانی کی تفسیر کے متعلق ہندوستان کے کسی گوشے سے کوئی مخالف آواز سوائے تعریف کے نہیں اٹھی۔ اپنے اور پرانے سب نے اَحْسَنَتْ کہہ کر لبیک کہی۔

اس مرحلے پر پہنچ کر جبکہ ڈاکٹر نذیر احمد کی اردو ادبی کل کار یوں کے متعلق ناقدین کی رائیں آپ کے سامنے آچکی ہیں، اب تفسیر کی عبارتیں پیش کر کے علامہ شبیر احمد اور ڈاکٹر نذیر احمد کا ادبی اور علمی موازنہ کرنے کا وقت آگیا ہے۔

پہلا موازنہ

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ فَتَنُيُ السَّعَابَ بِأَنِّي مُطَهَّرٌ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ نِشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا فَنَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خَلَلِهِ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ نِشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۚ وَإِن كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لُمُبْشِرِينَ ۚ فَانْظُرْ إِلَى أَثَرِ رَحْمَةِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ ذَلِكَ لَمُنْبَغِي الْمَوْتَى ۚ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ

(ترجمہ) اللہ ہے جو چلاتا ہے ہوائیں پھروہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر چلاتا ہے اس کو آسمان میں جس طرح چاہے اور رکھتا ہے اس کو تہ بہ تہ پھر تو دیکھتا ہے مینہ کو کہ اس کے درمیان میں سے نکلتا ہے پھر جب اس کو پہنچاتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں تو وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں اگرچہ وہ اس سے پہلے ہی ناامید تھے پس دیکھ لو اللہ کی رحمت کی نشانیوں کی طرف کہ کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد بیشک وہی مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۝

(پارہ ۲ سورہ روم رکوع ۸)

علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر

ڈاکٹر تذریعہ دہلوی کی تفسیر

لے بادل کی اصل یہ ہے کہ وہ ایک طرح کی بھاپ ہے جو آفتاب کی گرمی کی وجہ سے ہر ایک گیلی اور سیلی چیز اور خصوصاً سمندر سے پیدا ہوتی ہے پھر ہوا بحکم خدا بھاپ کو اڑائے اڑائے پھرتی اور اوپر کی سردی پا کر وہ بھاپ پانی ہو کر برتی ہے بعینہ اسی صورت ہے جیسے دھجی میں پانی کرفا اوپر سے دھجی کو ڈھک دھگری پا کر پانی سے بھاپ اٹھے گی اور چنی سے لگ کر بوندوں کی شکل میں پٹکے گی مگر شروع سے اخیر تک یہ تمام تصرفات خدا ہی کے حکم سے ہوتی ہیں ورنہ سمندر اور سیلہ اور دھوپاؤ ہوا سبھی چیزیں ہوتی ہیں اور بھلا اور مہارٹ دونوں موسم سوکھے گزر جاتے ہیں پانی کی بوند بھی نہیں برتی اس لئے کہ خدا بوندوں کو ان کی نافرمانیوں کی سزا دیتا اور باران

لے پہلے فرمایا تھا کہ مقبول اور مردود جدا کر دے جائیں گے منکروں پر ان کے انکار کا وبال پڑے گا۔ وہ اللہ کو اچھے نہیں لگتے۔ اب بتلاتے ہیں کہ اس کا اظہار دنیا ہی میں ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اللہ کی عادت اور وعدہ ہے کہ مجرمین و مکذبین سے انتقام لے اور مومنین کا ملین کو امداد و اعانت سے دشمنوں پر غالب کرے۔ بیچ میں ہوا کا ذکر اس واسطے آیا کہ جیسے باران رحمت کے نزول سے پہلے ہوائیں چلتی ہیں اسی طرح دین کے غلبہ کی نشانیاں روشن ہوتی ہیں جاتی ہیں۔ لے یعنی پہلے کسی طرف اور پھر کسی طرف اسی طرح دین بھی پھیلنے کا چنانچہ پھیلا دیا۔ لے اسی طرح جو ایمانی اور دھمنا بارش سے منتفع ہوں گے وہ خوشیاں سنائیں گے لے یعنی پہلے سے لوگ

رحمت کو روک لیتا ہے۔

نبار دھوانا نہ کوئی ببار

زمین ناوردانہ کوئی ببار

لے زمین پڑتی پڑی ہوتی ہے تو

اس میں نباتات کی قسم کی کوئی چیز نہیں

ہوتی۔ زمین کی اسی حالت کو مٹا

فرمایا پھر جب زمین جوتی ہوئی گئی

اور اس کی پیداوار لگی ہوا سے

پلنے اور لہلہانے زمین کی اس حالت

کو اس کی زندگی سے تعبیر کیا کیسے

اچھے استعارے ہیں۔

(پارہ ۲ سورہ روم رکوع ۵)

نا امید ہو رہے تھے حتیٰ کہ بارش

آنے سے ذرا پہلے تک بھی امید تھی

کہ مینہ برس کر ایسی جگہ پر لوہو جاکے

گی۔ انسان کا حال بھی عجیب ہے

ذرا دیر میں نا امید ہو کر مٹھ جاتا

ہے پھر ذرا سی دیر میں خوشی سے

کھل پڑتا ہے وہ یعنی چند

گھنٹے پہلے ہر طرف خاک اڑ رہی

تھی اور زمین خشک، بے رونق

اور مردہ پڑی تھی ناگہاں اللہ کی

مہربانی سے زندہ ہو کر لہلہانے لگی

بارش نے اس کی پوشیدہ قوتوں کو

کتنی جلد ابھار دیا۔ یہی حال

روحانی بارش کا سمجھو اس سے مراد

دلوں میں جان پڑے گی اور خدا

کی زمین ظہر الفساد فی نابہ

والبحر والی موت کے بعد

دوبارہ زندہ ہو جائے گی۔ ہر

طرف رحمت الہی کے نشان اور دین

کے آثار نظر آئیں گے جو قالمیتیں

مدت سے مٹی میں مل رہی تھیں باران

رحمت کا ایک چھینٹا ان کو ابھار کر
 نمایاں کر دے گا۔ چنانچہ حق تعالیٰ
 نے بعثت محمدی کے ذریعہ سے جلوہ
 دنیا کو دکھلا دیا۔ ہمارے صوبہ کے
 شاعر حکیم نے کیا خوب کہا ہے
 ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرنے نکھار کر
 ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
 ہے یہ وہ نام ارض کو کرے سما ابھار کر
 اکبر اسی کا درد تو صدق سے شہار کر
 صَلَّی عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی عَلٰی مُحَمَّدٍ

ڈاکٹر نذیر احمد کی اردو نہایت ہی سادہ ہے۔ سلاست و روانی کوٹ کوٹ
 کر بھری ہوئی ہے۔ اردو بامحاورہ ہے۔ طرز ادبیانہ ہے۔ جملے نکھرے نکھرے
 معلوم ہوتے ہیں۔ درمیان تفسیر میں فارسی کے شعر نے بہار کا سماں پیدا کر دیا
 ہے جو ان کے ذوقِ ادب کا عنوان ہے۔ البتہ گیلی اور سیلھی نے عبارت کو پچھپسا
 بنا دیا۔ اسی طرح چینی کا لفظ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہی حال سمندر اور
 سیلھ اور دھوپ کے جملے کا ہے۔ اگر سیلھ کی بجائے رطوبت یا نمی کا لفظ ہوتا تو
 بہتر ہوتا۔ اسی طرح زمین پڑتی پڑتی ہوتی ہے بھی زبان پر اچھا نہیں لگتا۔

علامہ عثمانی کی عبارت میں بھی شگفتگی، شان و شکوہ، روانی اور تحریر میں
 تازگی معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ ستھرے ستھرے اور جملے نھرے نھرے ہیں۔
 تفسیر کے آخر میں اکبر کے اشعار نے رُوح میں عشق اور عشق میں حسن پیدا کر دیا
 ہے۔ بحال اشعار کی چسپیدگی نے آسمانِ ادب پر چار چاند لگا دئے ہیں جو

ان کے ادبی سلیقہ کی بہار ہے۔ صلّی علیٰ محمد کے تکرار نے ترنم کی کیفِ زرا
مستیوں سے رُوح میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔

علامہ شبیر احمد کی تمام عبارت میں خط کشیدہ جملے کتنے فصیح ہیں۔ ایک لفظ
بھی ساری تحریر میں غیر فصیح نظر نہیں آتا، جگہ پر لو کی ترکیب یہاں کتنی پیاری
معلوم ہوتی ہے۔

تفسیر کی معنوی صورت کا جہاں تک تعلق ہے ڈاکٹر نذیر احمد نے ان آیات کا
مطلب سمجھانے کی کوشش نہیں کی صرف ایک فلسفیانہ نکتہ حل ضرور کیا ہے جو علامہ
عثمانی نے حل نہیں کیا البتہ اس مضمون کی پیشتر کی آیات میں انہوں نے فلسفیانہ
نقطہ نگاہ سے بادل اور بخارات نیز بارش پر تبصرہ کیا ہے، اس وجہ سے یہاں
چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ان آیات کا پہلی آیات سے ربط ظاہر نہ کر کے
تفسیر کا حق ادا نہیں کیا۔ دکھانا یہ تھا کہ ان آیات سے بالائی سلسلہ میں کیا ربط
ہے اور اشار کلام میں ہواؤں اور بادلوں کا ذکر کیوں آیا اور پھر کفار کی حالت
کی طرف کلام ربّانی نے کیوں رخ پھیر لیا۔ آخر ان ہواؤں کے چلنے اور بادلوں
کے برسنے، زمینِ مُردہ کے زندہ ہونے اور پھر مُردوں کے زندہ کرنے اور آخر
میں ”عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدْرٌ“ کہہ کر قدرت کا اظہار کرنے میں کیا کیا مضامین
مستتر ہیں۔ علامہ عثمانی کی شروع سے لیکر آخر تک انہی آیتوں کے نمبروں کی
تفسیر نے ربط، استعارہ اور بارش سے زمین کے لہلہانے اور رحمتِ روحانی
کی بارش سے کفار کی مُردہ دلوں کو زندہ کرنے کی تمام شقیں اور کڑھیں واضح
کردی ہیں جس کے باعث آیات کے معانی سمجھنے میں کوئی تشنگی
باقی نہیں رہتی۔

دوسرا موازنہ

اللَّهُ نُورٌ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورِ مِصْبَاحٍ
فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجْجَةٍ الزُّجْجَةُ
كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ
زَيْتُونَةٍ شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيئُ
وَلَوْ كَذَلِكَ تَسْهُ نَارُ اللَّهِ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ
لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيُضِيئُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ
وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

ترجمہ: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کا مثال (ایسی ہے) جیسے ایک طاق میں ایک چراغ ہو۔ وہ چراغ ایک شیشے میں دھرا ہو۔ وہ شیشہ چمکتے ہوئے تارے کی مانند ہے۔ اس میں ایک بابرکت درخت زیتون کا تیل ہے۔ (وہ چراغ) نہ مشرق کی طرف ہے اور مغرب کی طرف، قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس میں آگ نہ لگی ہو۔ روشنی پر روشنی ہے۔ اللہ اپنی روشنی کی جس کو چاہے راہ دکھلائے۔ اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے (مرتب)

علامہ شبیر احمد

ڈاکٹر نذیر احمد

نور الہی سے ہدایت و عرفان کا جو خصوصی حصہ ملتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو گویا مومن قانت کا جسم

دنیا کا کوئی نور اللہ کے نور کو نہیں پاسکتا تاہم لوگوں کے سمجھانے کے لئے دنیا ہی کا کوئی نور لیا ہوگا

سو جس نور سے خدا کے نور کو تشبیہ
دی گئی ہے اس میں عمدہ صفتیں
جس میں کہ چراغ ہے تو یہ مطلق نور
ہوا۔ پھر طاق میں رکھا ہے
تاکہ روشنی منتشر نہ ہو پھر صرف
چراغ نہیں بلکہ شیشے کی قندیل
میں ہے اور شیشہ بھی نہایت شفاف
ہے اور تیل جو اس چراغ میں جلتا
ہے زیتون کا ہے کہ دنیا کے تمام
تیلوں سے اس کی روشنی صاف
ہوتی ہے اور یوں بھی زیتون
کا درخت بڑا مبارک درخت ہے
کہ لوگوں کے اس میں چند در چند
فائدے ہیں۔ اور زیتون بھی
سایہ پرور کہ باغ کے نہ پورب کی
طرف واقع ہے نہ بھیم کی طرف
بلکہ بیچ باغ میں ہے اور ہمہ
وقت سایہ میں رہتا ہے کہ ایسے
درخت کا تیل خواہی نخواہی عمدہ
سے عمدہ ہوگا۔ پھر وہ خسرار باغ
بت خانے یا مشرب خانے یا قمار خانے

ایک طاق کی طرح ہے جس کے
اندر ایک ستارہ کی طرح چمکدار
شیشہ (قندیل) رکھا ہو۔ یہ
شیشہ اس کا قلب ہوا۔ جس کا
تعلق عالم بالا سے ہے۔ اس
شیشہ (قندیل) میں معرفت
ہدایت کا چراغ روشن ہے یہ
روشنی ایسے صاف و شفاف اور
لطیف تیل سے حاصل ہو رہی ہے
جو ایک نہایت ہی مبارک درخت
(زیتون) سے نکل کر آیا ہے اور
زیتون بھی وہ جو کسی حجاب سے
نہ مشرق میں ہو نہ مغرب میں
یعنی کسی طرف دھوپ کی روک
نہیں۔ کھلے میدان میں کھڑا ہو
جس پر صبح و شام دونوں وقت
کی دھوپ پڑتی ہے۔ تجربہ سے
معلوم ہوا کہ ایسے زیتون کا تیل
اور بھی زیادہ لطیف و صاف
ہوتا ہے۔ غرض اس کا تیل اس
قدر صاف اور چمکدار ہے کہ

کا نہیں ہے بلکہ خانہ خدا میں
جل رہا ہے اور وہاں خدا پرست
لوگ خلوص دل سے خدا کی عبادت
میں مصروف ہیں۔ اتنی صفوں
کا حیرانگہ ہو تو کسی قدر اس
کو دور کی مشابہت ہو سکتی
ہے۔

(پارہ ۱۵ سورہ نور رکوع ۱۱)
ترجمہ تفسیر ڈاکٹر نذیر احمد)

بدون آگ دکھلائے ہی معلوم
ہوتا ہے کہ خود بخود روشن ہو جائے
گا۔ یہ تل میں میرے نزدیک اسی
محسن استعداد اور نور توفیق کا
ہوا جو نور مبارک کے القاسم
بد و فطرت میں مومن کو حاصل
ہوا تھا۔ اور جس طرح شجرہ
مبارکہ "لا شقیۃ ولا غمۃ"
فرمایا تھا وہ نور ربانی بھی جہت
کی قیاس پاک ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مومن کا شیشہ
دل نہایت صاف ہوتا ہے اور
خدا کی توفیق سے اس میں قبول
حق کی ایسی زبردست استعداد
پائی جاتی ہے کہ بدون دیا سلا
دکھلائے ہی جل اٹھنے کو تیار ہوتا
ہے۔ اب جہاں ذرا آگ دکھائی
یعنی وحی و قرآن کی تیز روشنی نے
ان کو مس کیا فوراً اس کی فطری
روشنی بھرک اٹھی اسی کو "نور
علیٰ نوری" فرمایا۔ باقی یہ

سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں
 ہے جس کو چاہے اپنی روشنی عطا
 فرمائے اور وہی جانتا ہے کہ کس
 کو یہ روشنی ملنی چاہیے کس کو نہیں۔
 ان عجیب و غریب مثالوں کی بیان
 فرمانا بھی اسی غرض سے ہے کہ
 استعداد رکھنے والا کو بصیرت
 کی ایک روشنی حاصل ہوتی تعالیٰ
 ہی تمثیل کے مناسب موقع و محل
 کو پوری طرح جانتا ہے۔ کسی
 دوسرے کو قدرت کہاں کہ ایسی
 جامع اور موزوں مثال پیش
 کر سکے۔ آگے فرمایا کہ وہ روشنی
 ملتی ہے اس سے کہ جن مسجدوں
 میں کامل لوگ صبح و شام بندگی
 کرتے ہیں (تفسیر عثمانی
 مطبوعہ مدنیہ پریس)

تنقید جو آیات پیش نظر ہیں اس میں توازن کی جولانیاں دکھانے کا
 مفسرین کو خوب خوب موقع ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ
 ان آیات میں نور ربانی کی تشبیہ سے وضاحت کی گئی ہے جس میں روحانی اولیاء
 جگمگ کر رہے۔ اس موقع پر مفسرین خصوصاً وہ جو اہل نظر ہیں اپنے قلم اور

صفائے قلب کی جلوہ آرائیاں کرتے ہیں۔ اسی لئے اس مقام کو شبیری اور نذیری توازن کا جولانگہ بنایا گیا ہے۔

نذیری تفسیر کی عبارت تمام کی تمام فصیح ہے کوئی لفظ غیر فصیح نظر نہیں آتا۔ عبارت میں سادگی، سلاست، صفائی کے علاوہ لوچ، گھلاوٹ اور شیرینی ہے۔ تحریر کے جملے آپس میں ایک دوسرے سے نہایت خوش اسلوبی سے مربوط ہیں کہ کوئی خلا نظر نہیں آتا۔

شبیری تفسیر کی خامہ طرازی میں بھی فصاحت و بلاغت، جوش و تلسل، یکسانیت، شان و شکوہ ہے۔ بندشیں چست، جملے اور الفاظ درست و سجا خود فصیح اور موزوں ہیں۔ نہ صرف شبیری و شستگی بلکہ تحریر میں ایک چمک ایک تئیر اور ایک خاص کشش ہے جو نگاہ اور دل دونوں کو بس میں لانا چاہتی ہے۔ نذیری عبارت اگر فصیح اور سادہ ہے تو شبیری تحریر فصیح تراورہ کی سی رنگین ہے جو تقاضائے مقام ہے۔

معنوی توازن | معنوی حیثیت کے وزن کا اندازہ لگانا دونوں کی مکی کاروں سے واضح ہے۔ نذیری تفسیر میں صرف اللہ کے نور کی مثال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بس لیکن تفسیر کی اندرونی تہوں کو نذیری قلم نے چھ نہیں کیا ہے۔ شبیری تفسیر میں حقیقتوں کے چہروں سے نقاب کو الٹ کر رکھ دیا ہے اور تشبیہ، مشبہ اور مشبہ وغیرہ سب کی بال کی کھال نکال کر رکھ دی ہے۔ نذیری تفسیر کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے قرآن کریم کے ترجمے سے زیادہ کوئی چیز نہیں سوائے ایک دو جملوں کے لیکن اس کے برعکس شبیری تفسیر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ”نور الہی سے ہدایت و عرفان کا جو خصوصی حصہ ملتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو گویا مومن قانت کا جسم ایک طاق کی طرح

ہے۔۔۔۔۔ الخ۔ پھر شیشہ کو قلب کہہ کر استعارہ کی وضاحت کی گئی ہے پھر عالم بالا سے تعلق قائم کرتے ہوئے اس شیشہ (قندیل) میں معرفت و ہدایت کا چراغ روشن کر کے دکھایا ہے۔ علامہ عثمانی نے زیتون کو درختوں کے درمیان میں قائم نہیں رکھا بلکہ علیحدہ ثابت کیا ہے جس سے لاشی قیۃ ولا غمیریۃ کی تفسیر پر کافی روشنی پڑتی ہے کیونکہ خدا کا نور کسی چیز سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے درخت زیتون کو درمیان باغ میں رکھا ہے حالانکہ یہاں اصل مقصود فوت ہوتا ہے کیونکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کا نور ہر گوشہ میں یکساں ہے۔ علامہ عثمانی نے درخت زیتون کے دھوپ میں رہنے سے شجر بتا اس کے تیل میں لطافت ثابت کی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے سایہ میں کھکھاس کے تیل کو عمدہ بتایا ہے۔ علامہ عثمانی نے پھر تفسیر کے آخر میں بطور خلاصہ تشبیہ کی وجہ تمام اور تفسیر کا مغز پیش کر دیا ہے ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں یہ جنس مطلق نہیں ملتی۔ ڈاکٹر نذیر کے یہاں انسان کی طلب نہیں سمجھتی۔ علامہ عثمانی کے یہاں سے تشنہ پیاس بجھا کر آ رہا ہے۔ تفسیر نذیری میں تفسیر کا حق ادا نہیں کیا گیا جس سے قاری کے سامنے غرض قرآنی کا آخری پہلو نظر آجائے۔ تفسیر شبیری میں تحقیق، علمیت، روحانیت اور حقیقت تشبیہ کی تکمیل ہے۔ انہوں نے زیتون کے تیل سے قاری کو یہ بتلایا کہ اس سے مراد وہ حسن استعداد اور نور و فiq ہے جو نور مبارک کے القاء سے بدو فطرت میں مومن کو حاصل ہوا ہے۔

تیسرا موازنہ

وَاَوْحِیْ رَبِّکَ اِلَی الْفَلَحِ اِنَّ الْاُنْحَادِی مِنْ الْجِبَالِ
 یَبُوْنَ قَاوٍ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَغْرِیْ شَوْنٌ ۝ ثُمَّ کُنِیْ مِنْ
 کُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاَسْأَلُکَی سُبُلَ رَبِّکَ ذُلًا ۝ یَعْمُرُ مِنْ

مِنْ بَطُونِهَا شَأْبٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (پارہ ۱۲، رکوع ۱۵)

(تس جگہ) اور (اے انسان) تیرے پروردگار نے (شہد کی) مکھی کے دل میں
یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں جہاں ٹھیاں باندھتے
ہیں پھر ہر طرح کے میوے کھا۔ پھر اپنے راستوں میں جو صاف پڑے ہیں چل
پھر۔ ان (شہد کی مکھیوں) کے پیٹ سے پینے کی چیز مختلف رنگوں کی نکلتی
ہے۔ اس (شہد) میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ یقیناً اس میں غور کرنے والوں
کے لئے نشانی ہے۔ (مرتب)

تفسیر شبیری

اللہ شہد کی مکھی کو حکم دینے کا
یہ مطلب ہے کہ اس کی فطرت ایسی
بنائی ہے جو باوجود ادنیٰ حیوان
ہونے کے نہایت کارگر مگرسی اور
باریک صنعت سے اپنا چھتہ پہاڑوں
درختوں اور مکانوں میں تیار کرتی
ہے۔ ساری مکھیاں ایک بڑی
مکھی کے ماتحت رہ کر پوری فرماں
برداری کے ساتھ کام کرتی ہیں،
ان کے سردار کو ”بحسب“ کہا
جاتا ہے جس کے ساتھ مکھیوں کا

تفسیر نذیری

لہ شہد کی مکھیوں کے عجیب
حالات ہیں کہ ان کے چھتوں کے
خانے اصول علم ریاضی کے مطابق
بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ
تھوڑی سی تھوڑی جگہ میں
بہت سے بہت شہد آئے شہد
کے چھتے میں ایک سلطنت کا سا
انتظام پایا جاتا ہے۔ مکھیوں کی
ایک ملکہ ہوتی ہے اور چھتے کی تمام
مکھیاں اس کی فرمانبرداری مکھیوں
میں کسی قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں۔

جلوس چلتا ہے۔ جب کسی جگہ مکانات
بنائی ہیں تو سب خانے "مسدس"
متساوی الاضلاع کی شکل پر
ہوتے ہیں۔ بدون مسطر و پرکار
وغیرہ کے اس قدر صحت و انضباط
کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ایک ہی
شکل پر تمام خانوں کا رکھنا آدمی
کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ جگہ
کہتے ہیں کہ مسدس کے علاوہ کوئی
دوسری شکل اگر اختیار کی جاتی تو
لااحمالہ درمیان میں کچھ جگہ فضول
خالی رہتی۔ فطرت نے ایسی شکل
کی طرف رہنمائی کی جس میں ذرا سا
فرجہ بھی بیکار نہ رہے۔

اللہ کئی اور فاسلگی سب اوامر
تکوینیہ میں یعنی فطرۃ اس کو ہدایت
کی کہ اپنی خواہش اور استعداد و
مزاج کے مناسب پر قسم کے پھولوں
اور میوؤں میں سے اپنی غذا حاصل
کرے۔ چنانچہ مکھیاں اپنے چتے
سے نکل کر رنگ برنگ کے پھول پھل

کچھ شہد جمع کرنے والی۔ کچھ پھرا
دینے والی۔ پہاڑی لوگ بیٹوں کے
جہیز میں شہد کے چتے دیتے ہیں۔
جو چھتا دینا منظور ہوا اس کی ملک
کو بچہ مکر حوالے کر دیا۔ سب
مکھیاں اس کے ساتھ ہولیں۔
مکھیاں بہار کے موسم میں شہد
جمع کرتی ہیں اور موسم خزاں کے لئے
اس کا ذخیرہ رکھتیں۔ جب ان
کو چتے کا چھوڑ دینا منظور ہوتا
ہے تو باقیماندہ تمام شہد
چاٹ جاتی ہیں۔ غرض ان
مکھیوں میں بہت سے عجائبات
قدرت الہی ہیں۔ جن طریقوں
سے مکھیاں شہد جمع کرتی ہیں
اس کی حفاظت رکھتی ہیں انہی
کی نسبت فرمایا ہے کہ یہ طے
خدا نے ان کو تعلیم کئے ہیں ۱۲
(فوائد تفسیر ڈاکٹر نذیر احمد)

چوتھی ہیں جن سے شہد اور موم وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔ غذا حاصل کرنے اور کھانپ کر چھتے کی طرف واپس آنے کے راستے صاف کھلے پڑے ہیں کوئی روک ٹوک نہیں چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ مکھیاں غذا کی تلاش میں بعض اوقات بہت دوڑ بکلا جاتی ہیں پھر بے تکلف اپنے چھتے میں واپس آ جاتی ہیں ذرا اسے نہیں مہولتیں۔ بعض نے قَائِلُ سُبُلٍ رَتَبٌ ذُلٌّ سے یہ مطلب لیا ہے کہ قدرت نے تیرے (مکھی کے) عمل و تصرف کے جو فطری راستے مقرر کر دیئے ہیں ان پر سطح و منقاد بن کر چلتی رہ مثلاً بھول بھول چوس کر فطری قوی و تصرفات سے شہد وغیرہ تیار کر (چھتے سے) مختلف رنگ کا شہد نکلتا ہے۔ سفید، سرخ، زرد۔ کہتے ہیں کہ رنگتوں کا اختلاف موسم، غذا اور مکھی کی عمر وغیرہ کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بہت سی بیماریوں میں صرف شہد خالص یا کسی دوسری دوا میں شامل کر کے دیا جاتا ہے جو باذن اللہ مریضوں کی شفا یابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک شخص کو دست آرہے تھے اس کا بھائی حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے شہد پلانے کی رائے دی۔ شہد پینے کے بعد اسہال میں ترقی ہو گئی۔ اس نے پھر حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت دست زیادہ آنے لگے، فرمایا صَدَقَ اللہُ وَكَذَبَ بَطْنُ أَخِيكَ ”اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے“ پھر پلاؤ۔ دوبارہ پلانے سے بھی وہی کیفیت ہوئی۔ آپ نے پھر وہی فرمایا۔ آخر تیسری مرتبہ پلانے سے دست بند ہو گئے اور طبیعت صاف ہو گئی۔ اطبانے اپنے اصول کے موافق کہا ہے کہ بعض اوقات پیٹ میں ”کیموس فاسد“ ہوتا ہے جو پیٹ میں پھینچنے وال ہر ایک غذا اور دوا کو فاسد کر دیتا ہے اس لئے دست آتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ

مسبلا دی جاتیں۔ تگلاہ ”کیوس فاسد“ خارج ہو۔ شہد کے مسہل ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ گویا حضور کا مشورہ اسی طبی اصول کے موافق تھا۔ مامون رشید کے زمانے میں شمامہ عیسیٰ کو جب اسی قسم کا مرض ہوا تو اس زمانے کے شاہی طبیب یزید بن یوحنا نے مسہل سے اس کا علاج کیا اور یہی وجہ بتلائی۔ آج کل کے اطبا شہد کے استعمال کو استطلاقِ بطن کے علاج میں بے حد مفید بتلاتے ہیں“ (تفسیر القرآن عثمانی)

ادبیت | دونوں تفسیری قارئین کے سامنے ہیں۔ تفسیری تفسیر کی عبارت کے سادہ ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن اس عبارت میں تسلسل اور روانی مفقود ہے۔ مثلاً

”پہاڑی لوگ بیٹوں کے چیز میں مکھیوں کے چھتے دیتے ہیں، جو چھتا دینا منظور ہوا اس کی ملکہ کو پکڑ کر حوالے کر دیا۔ سب مکھیاں اس کے ساتھ ہو لیں۔“

ان تینوں جملوں میں پہلے اور دوسرے دونوں جملوں کے افعال میں موافقت ہونی چاہیے۔ عبارت یوں ہوتی کہ جو چھتا دینا منظور ہوتا ہے اس کی ملکہ کو پکڑ کر حوالے کر دیتے ہیں اور سب مکھیاں اس کے ساتھ ہو لیتی ہیں۔

تفسیر ششیری کی تحریر میں اس قسم کی غلطی کا ارتکاب بالکل نظر نہیں آتا۔ شروع سے آخر تک عبارت کی زنجیر کی کڑیاں شہد کی مکھی کے ”متساوی الاضلاع“ چھتے کی مانند عین برابر اور ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہیں اور کہیں خلا آنکھ کو نہیں کھٹکتا۔

مختویت | تفسیر تفسیری میں مکھیوں کے نظام، چھتے کی ساخت، ان کا باہمی رعایا اور پر جا کا سار شہ حیات، ان کی فصل خزاں کے لئے شہد کی فراہمی پر

دور بینی، چھتے سے اڑنے پر شہد کا چاٹنا ان تمام امور کی مناسب حکمت عملیوں پر تبصرہ کر کے حکمت الہی کی حیرت زا کار فرمائیوں کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن نظم قرآنی کے بقیہ حصوں مثلاً ”فاسلکی سبیل ربک ذللاً“ ... ”شراب مختلف ألوانها“ ”شفاء للناس“ جیسی قابل فکر وغور آیات کو چھوا تک نہیں۔ ایک مفسر کی قابلیت کا تقاضا یہ ہے کہ آیت کے کسی گوشہ کو تشبیہ تکمیل نہ رہنے دے۔

تفسیر شبیری میں اس تمام آیت قرآنی کے چہرے کو روشن کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ چھتے کی ”مسدس متساوی الاضلاع ساخت کی حکمت“ چھتوں، پہاڑوں میں مسکن، راعی اور رعایا کا رابطہ، زندگی، غذاؤں اور پھولوں سے رس کا چوسنا، مکھیوں کے لئے راہوں کا کشادہ کر دیا جانا، شہد کا افضلے عمر و طبع کے لحاظ سے مختلف اللون ہونا، شہد کا شفا بننا، پھر حدیث پر بھی شبیری نگاہ کا ہونا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مریض کو شہد پلا کر علاج کا سائنٹفک تجربہ کرنا اور مزید برآں ”کیوس فاسد“ کا تجزیہ کرنا نیز ثمامہ عیسیٰ کا یزید بن یوحنا سے معالجہ کی مثال پیش کرنا، غرض شروع سے آخر تک یوں معلوم ہوتا کہ ملاحظاتی نہ صرف مفسر نہ صرف محدث، نہ صرف حکیم، نہ صرف ادیب بلکہ ان کی تاریخ پر بھی پوری نظر ہے۔ اور ان کی نگاہ سے مناسب مقام کوئی چیز اوجھل نہیں ہے۔

زفسرق تا بقدم ہر کجا کہ می بینم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جلا نیاست

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی

قلم کی رفتار میں تجتر سا نظر آتا ہے۔ شاید اس کے احساسات زیادہ تیز ہو چکے ہیں مقام یقیناً نہایت نزاکت کا ہے۔ اس لئے اگر دماغ خام بھی نازک خیال بن جائے تو حیرت کی کیا بات ہے۔ علم و فضل کے پھولوں کی خوشبوئیں مہک رہی ہیں، علمیت کے گلشن میں تازہ غنچے کھل کر پھول بن گئے ہیں۔ بہاریں ہی بہاریں ہیں۔ ناظرین دیکھئے گلشن فضل و ادب کے دو باغبانوں نے علم کے چمن سجائے ہیں۔ نوہالان چمن کیا کیا گل بداماں ہیں۔ ان دونوں گلچینوں نے چمن سے پھول لے کے کرگلدستے بنائے ہیں جو کبھی نہیں مرجھائیں گے۔

وہ دیکھئے علمی نمائش ہو رہی ہے۔ شبلی کے گلدستے کیسے قرینے سے سجے سجائے رکھے ہیں کہ نگاہیں فردوس بہار بن گئی ہیں۔ ناممکن ہے کہ ان گلدستوں کے پھولوں کی رنگت میں کوئی فرق آئے۔ اسے لو کیا نئے نئے قسم کے پھول ہیں اس سے پہلے اس طرح کے خوبصورت پھول شاید ہی دیکھنے میں آئے ہوں۔ سنو کوئی ان گلدستوں کے نام لیکر پکار رہا ہے۔ سیرۃ النبی، الفاروق، شعر العجم۔ یہ گلہائے رنگین علمی نمائش کے گلدستوں میں شبلی کے بہترین دیدہ زیب اور دل فریب مناظر پیش کر رہے ہیں۔ انہیں آنکھوں سے لگا کر دیکھو اور قوتِ شامہ کو ان کی خوشبوئیں شگھا کر لو چھو کہ ان کی مہک دماغ کے پردوں میں بس کر سکون و فرحت کے کیسے لٹائے سنگھار رہی ہے۔

سر سید کے پاس ذہن رسا تھا لیکن مذہبی کمند کو تاہ تھی۔ عقائے معانی کو پھانسنے میں کامیاب نظر نہیں آتے۔ جہاں حقیقت کی ضرورت ہوتی ہے تحقیق کے ہتھیار اٹھا کر بہت کچھ ماتھ پاؤں مارتے ہیں، ممکن ہے آپ کو

اختلاف ہو لیکن ہتھیار ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مولانا نذیر احمد اپنے دور کے بے نظیر ناول نگار ہیں مگر انہوں نے اپنے موضوعات کا آئینہ بعض کو مستثنیٰ کرتے ہوئے بلندی پر تعمیر نہیں کیا۔ اس لئے ان کا مقام بلند نظر نہیں آتا۔ نذیر احمد تحقیقات علمی کی گھاٹیوں سے پانی نہ پی سکے۔ میدان تدقیق و تحقیق کے نشیب و فراز سے بیٹھ بھر کر بھاگے اور سطاحت کے میدان میں اکھڑے ہوئے۔

مولانا حالی اپنے زمانے کے بے نظیر سوانح نگار ہیں۔ ان کی سادگی، واقعتاً و سوانح کی صحت بجائے خود قابلِ فخر و ناز ہے۔ ان کا میدان تصنیف ”سوانح نگاری“ ہے۔

افادات مہدی میں مہدی کی یہ رائے پڑھئے :-

”سر سید کے معقولات“ الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کچھ رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن محمد حسین آزاد صرف انشاء پر داز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔“

مہدی کی اس تنقید کا زور محمد حسین آزاد کی انشاء پر دازی پر پڑتا ہے۔ مجھے ان کی تائید یا تردید سے صرف اس قدر بحث ہے کہ آزاد لا ریب بجائے خود بہترین نثر ہے، حالی کی طرح سوانح نگاری، سر سید کی معقولات، شبلی کی طرح تاریخ کا سہارا لیکر چلنے کی اسے ضرورت نہیں مگر اس کے برعکس میں اپنے قلم کو یہ لکھنے پر مجبور پاتا ہوں کہ پروفیسر آزاد صرف انشاء نگار ہی ہیں اس کے بغیر وہ جی نہیں سکتے لیکن تحقیقی روایات میں آزاد بری طرح فیمل ہیں۔ مگر شبلی کی گہری نگاہیں،

تحقیق علمی کے دریا بہتے دیکھتی ہیں۔ ان کی نگاہیں ان سمندروں میں ناخدا یا نہ مہارت سے تیرتی غوطہ مارتی اور احتیاط سے باہر نکل آتی ہیں۔

علامہ شبلی کی علمی اور ادبی قوتوں پر تبصرے کے بعد ہم آپ کے سامنے ان کی اور علامہ عثمانی کی مشترک المضامین تصنیفات، اول الذکر کی الکلام اور موخر الذکر کی الاسلام رکھتے ہیں۔ لہذا علمی دیکھیوں کے سلسلے میں ہم آپ کے سامنے ان دونوں اہل علم، اہل قلم کے مشترک علمی مضامین پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وجود باری تعالیٰ کے متعلق ہر دو محققین لکھتے ہیں :-

وجود باری تعالیٰ

علامہ عثمانی	علامہ شبلی
انہوں (مادہ پرستوں) نے ہم کو ایک نہایت عظیم و حکیم اور بڑھ صفت موصوف خدا سے علیحدہ کر کے ایک ایسے خدا (مادہ) پر قناعت کرنے کی زائے دی جو بالکل اندھا بہرا، گونگا اور بے حس و بے شعور ہے جس کا کوئی کام نہ قصداً اختیار سے ہو سکتا ہے نہ مصنوعات میں کسی قسم کی ترتیب اور تناسب پیدا کرنے پر قادر ہے۔ نہ اس میں سمجھ کا مادہ ہے نہ وہ کسی قاعدہ و قانون	انسان کو آغاز تیز میں جن بدیہی اور حسی مقدمات کا علم ہوتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی کو مرتب، باقاعدہ اور منظم دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کسی دانشمند نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے۔ اگر کسی جگہ ہم چند چیزیں بے ترتیب رکھی دیکھیں تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ آپسے آپ یہ چیزیں اکٹھی ہو گئی ہوں گی لیکن جب وہ اس ترتیب اور سلیقہ سے

مچنی گئی ہوں کہ ایک ہوشیار صنار
 بھی بمثل ان چیزوں کو چن سکتا
 ہے تو یہ خیال کبھی نہیں ہو سکتا کہ
 آپ سے آپ یہ ترتیب پیدا ہو گئی ہوگی
 اس کو ایک اور واضح مثال میں سمجھو
 خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی شعر لو
 اس کے الفاظ الٹ پلٹ کر کے کسی
 معمولی آدمی کو دو اور اس سے
 کہو کہ الفاظ کو آگے پیچھے لکھ کر ترتیب
 دے۔ وہ سو سو طرح الٹ پلٹ
 کرے گا۔ لیکن اتفاقہ طور سے بھی
 کبھی یہ نہ ہوگا کہ حافظ اور نظامی
 کا شعر یکساں آئے۔ حالانکہ وہی الفاظ
 ہیں وہی حروف ہیں، وہی جملے ہیں
 صرف ذرا سی ترتیب کا پھیر ہے۔
 پھر کہیں ممکن ہے کہ نظام عالم
 جو اس قدر باقاعدہ مرتب اور
 موزوں ہے وہ خود بخود قائم ہو گیا
 ہو۔

(الکلام، از شبلی ص ۳۶ و ۳۷)

سے واقف ہے، نہ اس کو امور
 انتظامیہ کی اطلاع ہے حالانکہ جس
 عالم کے فاعل کی ہم کو کھوج لگانا
 تھی وہ عالم کائنات کا ایسا مجموعہ
 ہے جس کے ہر جز میں بیش قیمت
 حکمتیں ودیعت رکھی ہوئی ہیں جس پر
 کے عجیب و غریب اسرار کا مشاہدہ
 کرتے کرتے عقل انسانی تھک
 جاتی ہے اور جس کے بہت تھوڑے
 حصہ کا تتبع کرنے سے حکماء کو اور
 خصوصاً ان مادیوں کو یہ اعتراف
 کرنا پڑا ہے کہ مظاہر فطرت کی جس
 قدر بارہکیاں ہم معلوم کر سکے ہیں
 وہ اس سے بہت ہی کم ہیں جواب
 تک معلوم نہیں ہو سکیں علم تشریح،
 علم الافلاک، علم الحيوانات، علم
 نباتات اور علم طبقات الارض
 کے ماہرین سے دریافت کر دو، جو
 راز ہائے قدرت تم نے موجودات
 عالم میں آج تک دریافت کئے ہیں
 وہ کس قدر ہیں اور ان کی حفاظت

کے واسطے کتنے دفتر اور کتب خانے
تم کو درکار ہوئے ہیں۔

(الاسلام، از عثمانی ص ۱۶ و ۱۷)

وجود باری تعالیٰ پر علامہ شبلی اور علامہ عثمانی کا زور قلم، روانی اور شور کا
ایک دریا بہا رہا ہے۔ ادبی موجیں دونوں کی مسلسل عبارت میں کس طرح تیزی
اور جوش سے رواں دواں ہیں کہ قوت استدلال میں ایک خاص سطوت و دبیدہ
پایا جاتا ہے۔ فنِ خطابت میں دونوں علامہ شان امتیازی رکھتے ہیں چنانچہ ان
عبارتوں میں خطابت کا طرز خاص طور پر نمایاں اور اسبھرا نظر آتا ہے۔ علامہ
شبلی کی ذیلی عبارت ملاحظہ ہو :-

”اس کو ایک اور واضح مثال میں سمجھو۔ خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی
شعر لو اس کے الفاظ الٹ پٹ کر کے کسی معمولی آدمی کو دو اور اس سے کہو
کہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے“

شبلی کی یہ عبارت خطابی طرز نگارش کی آئینہ دار ہے۔ اب علامہ عثمانی
کی مذکورہ بالا عبارت حسب ذیل ٹکڑے پر نظر ڈالتے :-

”علم تشریح، علم الافلاک، علم الحیوانات، علم نباتات، اور علم طبقات
الارض کے ماہرین سے دریافت کرو جو راز مائے قدرت تم نے موجوداتِ
عالم میں آج تک دریافت کئے ہیں وہ کس قدر ہیں اور ان کی حفاظت کے
واسطے کتنے دفتر اور کتب خانے تم کو درکار ہوئے ہیں“

عثمانی کی عبارت کا یہ ٹکڑا بھی طرز نگارش خطابیہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔
غرض دونوں کی عبارتوں کو پڑھئے اور ملا کر مسلسل ایک کے دوسرے سے
ڈانٹے ملا دیجیئے کا شاہد لاہو بالکل نظر نہ آئے گا۔

جہاں تک مضمون کی معنویت اور قوت علمیہ کا تعلق ہے علامہ شبلی عالم کے نظام اور ترتیب سے وجود باری پر استدلال پیش کر رہے ہیں اور تمثیلیہ طور پر حافظ اور نظامی کے شعر کی ترتیب سے عالم کے نظام کی تائید کے ذریعہ اثبات باری تعالیٰ پیش کر رہے ہیں۔ علامہ شبلی کی اس عبارت میں صرف اتنی ہی چیز ہے اور بس، لیکن علامہ عثمانی کی عبارت میں مصنوعات عالم کی ترتیب اور تناسب کا بھی ذکر ہے اور اس کے علاوہ کائنات کی حکمت اور علوم تشریح، افلاک، حیوانات، نباتات اور علم طبقات الارض کی طرف توجہ دلا کر جو کچھ خزانے ان علوم میں قدرت و حکمت الہی کے دبے پڑے ہیں عثمانی ان سے وجود باری پر استدلال پیش کر رہے ہیں۔ غرض عثمانی کے یہاں ایک پیرے میں دو دلیلیں ہیں اور بہت سی چیزوں کی طرف اشارے ہیں اور علامہ شبلی کے یہاں صرف ایک ہی نظریہ ہے البتہ مثال سے اس کو واضح کیا گیا ہے۔

مسئلہ توحید

علامہ شبلی	علامہ عثمانی
حقیقت یہ ہے کہ جن اسباب	اس سارے سلسلہ عالم کی مثال
ہم کو خدا کے وجود کا یقین ہوتا ہے	ایسی ہے جیسے کہ مشینوں اور کلوں
بعینہ وہی اسباب اس بات کے	کے کارخانوں اور گھڑیوں وغیرہ
مجھے شاہد ہیں کہ خدا ایک ہی ہے۔	میں بہت سی کلیں اور پرزے
نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم	آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ پھر اگر کوئی کام
ہوتا ہے کہ گویا ہر وہ کثیر الاجزاء	لینا منظور ہوتا ہے اول کل کو ہلاتے
یا کثیر الافراد ہے لیکن سب ملکر	ہیں اور سب کلیں بہ ترتیب ہلتی

<p>ہیں اور آخر میں جو کام مقصود ہوتا ہے وہ اخیر کی کل سے ہوتا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ کلین خود بخود نہیں بنتیں کیونکہ وہ بے حس و حرکت جمادات میں سے ہیں ان کے واسطے جب تک کوئی ذی عقل اور صاحب ارادہ کام لینے والا نہ ہوگا ہرگز کام نہ چلے گا۔ اسی طرح سلسلہ عالم کے واسطے علت العلل اور فاعل حقیقی</p>	<p>ایک ہے۔ یعنی اس کل ایک ایک پُرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام پُرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو اسی دلیل کو قرآن مجید میں اس طرح ادا کیا ہے :</p> <p>لَوْ كَانَتْ فِيهِمَا إِلَهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا .</p>
-----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

ایک خدائے تعالیٰ ہے ۔

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی دونوں محققین کی اردو نگاری پر اس سے پہلے موارنے میں جو رائے قائم کی گئی ہے وہی یہاں بھی کار فرما ہے ۔ میں نے پہلے یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر ایک کی عبارت کے ساتھ دوسرے کی عبارت کو متصل کر لیا جائے تو عبارت کے زور اور قوت استدلال میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا ۔ بلکہ علامہ عثمانی کے کلام میں علامہ شبلی کی بہ نسبت خفیف سا جوش اور سطوت زیادہ نظر آتی ہے ۔ دونوں کی عبارت میں روانی ، حلاوت اور سلیقہ ادبیت موجود ہے ۔

توحید کے اثبات میں معنوی پہلو کی قدریں تقریباً برابر برابر ہیں نقطہ خیال میں فرق دین کی طرح پورا پورا توازن و تقابل نظر آتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے دو مقابل کے فلاسفر حکمت و علم کے میدان میں فلسفہ و کلام کے گولہ بارود سے قلم و دماغ کی توپیں اور ٹینک لیکر ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے کھڑے ہیں ۔

اثبات نبوت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی	علامہ عثمانی
<p>(۱) نبوت کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا ایک بدیہی مسئلہ نہ جاتا ہے، نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اجزائے ذیل سے مرکب ہے :</p> <p>۱۔ خود کامل ہو۔</p> <p>۲۔ دوسروں کو کامل کر سکتا ہو۔</p> <p>۳۔ اس کے علوم و معارف انسانی نہ ہوں بلکہ نبی اللہ ہوں۔</p> <p>یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذات مبارک میں موجود تھیں کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے ؟</p> <p>(۲) غور کرو وہ شخص جس نے کسی قسم کی ظاہری تعلیم نہ پائی ہو جس</p>	<p>انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں اولاً تو خدا کی محبت اور اخلاص اس درجہ ہو کہ ارادہ مصیبت کی گنجائش ہی نہ بچے۔ دوسرے یہ کہ اخلاق پسندیدہ جو اعمال حسنہ کی طرف ان کے اندر فطرتی طور پر راسخ ہوں تاکہ جو کام بھی وہ کریں قابل اقتداء اور جو فعل بھی ان سے سرزد ہو باعث ہدایت سمجھا جائے۔ تیسرے یہ کہ فہم و فراست ان امتیوں کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہو کیونکہ کم فہمی فی نفسہ عیب ہونے کے علاوہ اس وجہ سے بھی ان کے حق میں مضر ہے کہ کلام خداوندی کے اسرار غامض کا سمجھنا اور دقیق علل پر مطلق ہونا اور ہر ذکی وغبی کو احکام و نشانین طریقے سے سمجھا دینا بغیر عقل صحیح اور فہم کامل کے ہرگز متصور ہی</p>

آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش بُت
پرستی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا ہو ،
جس کے کانوں میں ناقوس کے
سوا اور کوئی آواز نہ آئی ہو جس
نے الہیات ، اخلاق ، اصول
معاشرت ، قانون تمدن کے
متعلق ایک حرف بھی کسی سے نہ
سنا ہو دفعۃً منظر عام پر آئے
اور ایک طرف تو فلسفۂ اخلاق
تزکیہٴ رُوح ، الہیات ، معاد
قانونِ معاشرت ، اصولِ تمدن
کے وہ دقائق اور نکات بتائے
جو کسی حکیم کسی فلسفی ، کسی مقنن ،
کسی پیغمبر نے کبھی نہیں بتائے
تھے ۔ دوسری طرف تمام قوم
کی قوم میں جو اس وقت جہالت
و وحشت ، جور و ظلم ، فسق و فجور ،
سفاکی و خونریزی میں ڈوبی ہوئی
تھی پاکیزہ اخلاقی اور بچائی کی
وہ رُوح چھونک دے کہ دفعۃً
ان کی کایا پلٹ جائے بحیر

نہیں

اس بدیہی معیار رسالت کے
مان لینے کے بعد جو میں ابھی عرض
کر چکا ہوں حضورِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی رسالت کا ثبوت بالکل آسان ہو
جاتا ہے کیونکہ آپ کے بے شمار
علمی و عملی کارنامے اس وقت
بھی دنیا کی آنکھوں سے اوجھل
نہیں ہیں ۔ اور نہ تمام اولوالعزم
انبیاء علیہم السلام کے معجزات
ملکہ آپ کے معجزات کی ہمہری
کر سکتے ہیں ، آپ کے فہم و اخلاق
کا موافق و مخالف کو اعتراف کرنا
پڑا ہے ۔

عرب کی جہالت ، درشت
مزاجی ، گردن کشی کون نہیں جانتا
جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ
کوئی کتاب ان کے پاس آسمانی
ہو نہ زمینی اور ان کے اخلاق کا
یہ حال ہو کہ قتل و غارت وغیرہ

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور کون ہو سکتا ہے ؟
 (۳) غور کرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تمام دنیا کی کیا حالت تھی ہندو اور مصری سینکڑوں خدا یا اوتار مانتے تھے ، عیسائی تثلیث کے قائل تھے ، صابین ستارہ پرست تھے ، مجوسی یزداں و اہرمین دو خدا تسلیم کرتے تھے ، یہودی توحید کے قائل تھے مگر جس قسم کا خدا مانتے تھے وہ انسان سے کچھ ہی بڑھ کر بلکہ بہت سی باتوں میں برابر یا گھٹ کر تھا۔ اہل عرب یا تو خدا کے سرے سے قائل ہی نہ تھے یا مانتے تھے تو اس قسم کا خدا مانتے تھے جس کے نہایت کثرت سے لڑکیاں (یعنی ملائکہ) تھیں ، بہت سے فرقے ہر دن کا الگ الگ خدا مانتے تھے ۔

ایک معمولی حرکت ہو عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھا لائے اور پوچھنے لگے اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں ، جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شادو خرم گزار دیں ، ایسے جاہلوں ، اور خود سروں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا چہ جائیکہ علم الہیات ، علم معاملات ، علم عبادات ، علم اخلاق ، علم سیاست مدن میں رشک حکما ر نامدار بنا دیا۔ یہاں تک کہ دنیا نے ان کے شاگردوں کی شاگردی کی ۔
 ڈاکٹر لیبیان کہتا ہے :

”اس پیغمبر اسلام ، اس نبی

امی کی بھی ایک حیرت انگیز

سیرگزشت ہے جس کی آواز

نے ایک قوم ناہنجا رکھو جس

وقت تک کسی ملک گیر کے زیر

حکومت نہیں آئی تھی رام

کیا اور اس درجہ پر پہنچایا
کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی
سلطنتوں کو زیر و زبر کر دیا
اور اس وقت بھی وہی نبی
امی اپنی قبر کے اندر سے
لاکھوں بندگان خدا کو کلمہ
اسلام پر قائم رکھے ہوئے
ہے۔“

اگر انصاف کرو تو آپ کے حسن
اخلاق کا اندازہ کرنے کے لئے یہی
کافی ہے کہ آپ نہ کہیں کے بادشاہ
تھے نہ بادشاہ کے گھرانے میں پیدا
ہوئے تھے نہ کچھ زیادہ مال و
دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا نہ
باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث
میں چھوڑا تھا نہ آپ کے پاس
تخوہ دار فوج نہ اہل وطن آپ کے
بمراہ تھے نہ قبیلہ والوں کو آپ کے
مذہب سے ہمدردی تھی ایسی کسی
اور بے بسی کے عالم میں آپ نے
ان تند خو گواروں کو ایک صدائے

(۴) یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو
خیال اس کے دل میں آتا ہے
وہ انہی واقعات، روایات
اور خیالات سے ماخوذ ہوتا ہے
جو اس کے گرد و پیش پھیلے ہوئے
ہیں، انہی سے وہ ادل بدل
کر ایک دوسری صورت بنالیتا
ہے۔ اب غور کرو کہ اگر اس
فطرت کی رو سے آنحضرت
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں
خدا کا خیال آتا تو اس قسم کا
ہوتا جو اس زمانے کے لوگوں کا
تھا لیکن آپ نے جس خدا کی
تلقین کی وہ ایسا خدا تھا جو اہم
محض ہے جس کی ذات اور صفات
میں کسی قسم کا اشتراک نہیں جو نہ
زمین میں ہے نہ آسمان میں نہ
اوپر نہ نیچے نہ دائیں نہ بائیں
نہ زمان میں نہ مکان میں اور
پھر ہر جگہ ہے، جو ایک ایک ذرہ
کو جانتا ہے، جیوٹی کے پاؤں

کی آہٹ سن لیتا ہے، ہمارے دل
 کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جاننا
 ہے، ایسا منزہ ایسا کامل ایسا
 بالاتر خدا انسان خود اپنے خیال
 سے نہیں پیدا کر سکتا بلکہ وہی
 خدا یہ خیال پیدا کر سکتا ہے
 جو ان صفات کے ساتھ موصوف
 ہو۔

نماؤں سے مخاطب کیا کہ جس سے
 بڑھ کر اس وقت ساری دنیا میں
 کوئی مکروہ آواز نہ تھی اور نہ ایسی
 صدا دینے والے سے زیادہ ان کے
 نزدیک کوئی شخص ان کا دشمن
 اور بدخواہ سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ
 وہی لالہ اللہ کی آواز تھی کہ جس
 نے دفعۃً تمام عرب میں تہلکہ
 ڈال دیا۔ جس سے باطل
 معبودوں کی حکومت میں بھونچا
 آنا شروع ہو گیا۔ اور جس کی چمک
 سے اس کفر اور جہالت کی تاریکیوں
 میں بجلی سی کوند گئی گویا وہ ایک
 زور شور کی ہوا تھی جس کے چلتے
 ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ
 گئے اور آفتابِ توحید ابر کے
 پردے سے باہر نکل آیا، یا ابلیس
 رست تھی جس کی بوجھاڑ نے مخلوق
 پرستی کے سیاہ ماتھیوں کے پر خچے
 اڑائے اور خدا کے گھر کو ان کی
 زد سے بچالیا۔

نبوت و سالتمآب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اثبات میں علامہ شبلی کا طرزِ تحریر ادبیانہ ضرور ہے لیکن منطقیانہ استدلال کے غلبہ نے ادب پر غلبہ حاصل کر لیا ہے، نگارش میں صفائی ہے، روانی ہے۔ شبلی کا دوسرا اور تیسرا قطعہ عبارت، شوکت و نشان میں پہلے اور چوتھے پیرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ چوتھے پیرے کی عبارت میں ضعف اور خستہ پید ہو گئی ہے جیسا کہ ذوقِ سلیم شہادت دے سکتا ہے۔

علامہ عثمانی کی عبارت میں شبلی کی بہ نسبت زیادہ جوش، زیادہ دہدہ، جزالت اور تسلسل ہے اور عبارت میں استعارہ، شوخی اور تشبیہانہ رنگینی اور جدتِ اسلوب ہے بالخصوص آخری قطعہ عبارت کا جواب شبلی کی متوازن عبارت میں مفقود ہے۔ قاری پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتا ہے۔ ذرا عثمانی کی عبارت کے حسب ذیل جملے دیکھئے۔

۱۔ آپ نے ان تند خوگنواروں کو ایک صرا سے نامانوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اس وقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ تھی۔

۲۔ یہ وہی لا الہ الا اللہ کی آواز تھی جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں جھونچال آنا شروع ہو گیا۔

۳۔ جس کی چمک سے اس کفر اور جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کو نڈی۔

۴۔ ایک زور شور کی ہوا تھی جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتابِ توحید ابر کے پردے سے باہر نکل آیا۔ یا ابابیلِ رحمت تھی جس کی بوچھاڑ نے مخلوقِ پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پرچے اڑائے۔

علامہ شبلی کی عبارت مذکورہ بالا عثمانی جملوں کے جواب سے قاصر ہے۔ علامہ عثمانی کی ساری عبارت کی موجیں پورے بہاؤ کے ساتھ ٹھاٹھیں مارتی

پلی جارہی ہے اور درحقیقت اس قسم کے کلامی مسائل میں ایک مشکل کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنی قوت استدلال کی خاطر بولتے ہوئے الفاظ اور جملے استعمال کرے۔
 رہا معنویت کا تعلق تو علامہ شبلی نے اثبات نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں :-

- ۱۔ (نبی خود کامل ہو۔
 - ۲۔ دوسروں کو کامل کر سکتا ہو۔
 - ۳۔ اس کے علوم و معارف اکتسابی نہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں۔
- علامہ عثمانی نے رحمتِ دو عالم کی نبوت کے اثبات میں جو اصول پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

- ۱۔ انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں محبت و اخلاصِ خداوندی اتنا ہو کہ معصیت کی گنجائش ہی نہ بچل سکے۔
 - ۲۔ اخلاق پسندیدہ جو اعمالِ حسنہ کی جڑ ہیں ان کے اندر فطری طور پر ہوں تاکہ وہ دوسرے کے لئے نمونہ بن سکیں۔
 - ۳۔ فہم و فراست امتیوں کے اعتبار سے زیادہ ہو تاکہ اسرار و غوامضِ الہیہ سمجھ سکیں اور دوسروں کو سمجھا سکیں۔
- ان اصولوں پر غور کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی نے پہلا معیار نبوت یہ قائم کیا ہے کہ ”نبی خود کامل ہو“ اور علامہ عثمانی نے یہ فرمایا ہے کہ نبی میں اخلاصِ خداوندی کے باعث معصیت کی گنجائش نہ ہو۔ خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ نبی میں نبوت کی استعداد کا کمال اور اطاعتِ خداوندی پر فطری ملکہ ہونا چاہئے۔

دوسرا اصول بھی شبلی اور عثمانی کا متحد نظر آتا ہے۔ علامہ شبلی نے فرمایا ہے

کہ نبی دوسروں کو کامل کر سکتا ہو اور علامہ عثمانی کا نظریہ بھی یہی ہے کہ نبی میں اخلاق پسندیدہ فطری طور پر راسخ ہوں کہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ بن سکیں۔ اس اصول کے صاف یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے کمال اخلاق سے دوسروں کو کامل بنا سکے۔

تیسرے اصول میں علامہ شبلی نے کہا ہے کہ نبی کے علوم و معارف کتابی نہیں بلکہ سنا نبی اللہ ہوں علامہ عثمانی نے اسی نظریہ کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کا علم تمام انسانوں سے بڑھ کر ہو۔ اور جب علم سب سے زیادہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہی سب میں نبوت کا حقدار ہوگا۔

الغرض دونوں کا توازن برابر کا نظر آتا ہے۔ البتہ شبلی نے مختصر الفاظ میں ان اصول کو پیش کیا ہے اور اصولوں کی علت بیان نہیں کی۔ عثمانی نے ان اصولوں کے ساتھ ان کی علتوں اور اسباب پر بھی مختصر سی روشنی ڈال دی ہے۔

ان اصولوں کے قائم کرنے کے بعد شبلی نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں یہ استدلال کیا ہے کہ آنحضرت نے باوجود اُمّی معضی ہونے کے اپنی قوم کو علوم و معارف، اقتصادیات و تمدن اور روحانیت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد شبلی نے تمام دنیا کی حالت کا نقشہ کھینچ کر اور شرک و بت پرستی کا بیان کر کے توحید کی ضرورت کا احساس دلایا ہے جس کی سرکار مدینہ نے توجہ فرمائی اور قوم کو موحد بنادیا۔

تیسری دلیل خدا کی وحدانیت کے ساتھ اس کی صفات پر روشنی ڈال کر پیش کی ہے کہ نبی کے ہی ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ خدائے واحد قید زمان و مکان سے پاک اور منزه ہے۔

علامہ عثمانی نے رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں آپ کے

علمی اور عملی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ دوسری دلیل میں نہایت شد و مد سے عرب کی سرکشی، خونریزی، نافرمانی اور جہالت کی تصویر کھینچ کر ایسی حالت میں اہل عرب کو دنیا و دین کے علوم و معارف سکھانے سے استدلال نبوت کیا ہے اور شبلی سے بڑھ کر کیا ہے اس کے ساتھ علامہ عثمانی نے ڈاکٹر لیلیان کا مقولہ تائید میں پیش کیا ہے۔ پھر عثمانی نے تیسرے استدلال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی و علمی کارناموں سے عرب کی کایا پلٹنے کا جو اظہار کیا ہے وہ ثمرۂ نبوت ہے اور ایک بات جو بے انتہا پتہ کی بتائی ہے وہ یہ ہے کہ غربت، بے کسی، بے بسی کا نقشہ کھینچ کر نبی اُمّی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ نبوت کی بہترین دلیل ہے۔ یہ ہے وہ توازن جس میں علامہ عثمانی کا پلہ جھکا ہوا نظر آتا ہے۔

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی کے ادبی و علمی توازن کا جائزہ لگانے کے لئے قاری کے سامنے جو کچھ مختصر سا مواد پیش کیا گیا وہ بصیرت کے لئے بظاہر کفایت کر سکے گا۔ البتہ اس مقام پر ایک اور شانِ تقابل پیش کرنا علمی و ادبی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اور وہ تقابل ہے عربی کی عبارت کا اردو میں صرف ترجمہ کا۔ یہاں تقابل ایک ہی عبارت کے ترجمہ سے وابستہ نہیں کیونکہ مجھے کوئی ایسی عبارت سمجھتی ہے جس سے عربی نہ مل سکی جو دونوں میں مشترک ہو اس لئے دو عربی عبارتیں اور ان کے ترجمے علامہ شبلی کی طرف سے اور اسی طرح دو عربی عبارتیں اور ان کے تراجم علامہ عثمانی کی طرف سے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے یہ اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اہل علم کے نزدیک یہ امر مسلم و محقق ہے کہ کسی کتاب یا عبارت کا دوسری زبان میں حیح، با محاورہ ترجمہ جس قدر مشکل ہے اس قدر کسی کتاب کا اسی فن میں تصنیف کرنا مشکل نہیں۔ کیونکہ ترجمہ میں مصنف کے کلام کا اسلوب، مد و جزر، قوت و شوکت الفاظ،

تسلسل بعینہ اسی طرز کا ہونا چاہئے جس سے اصل مصنف کے ادبی اور علمی تیور بگڑنے نہ پائیں۔ اس مختصر سی اہمیت کے بعد علامہ عثمانی اور شبلی کے ترجمے دیکھئے:-

از علامہ شبلی

ثم ان سبحانه و تعالیٰ	” پھر خدائے پاک نے ہم کو اس آرام
اخبرنا بما وعدنا به في	اور رنج کی خبر دی جس کا قیامت
الدار الاخره من النعم	میں وعدہ کیا ہے اور وہ اس طرح
والعذاب و اخبرنا بما	کہ طعام، شراب، ازدواج اور
يؤكل ويشرب و ينكح و	فرش کا ذکر کیا تو اگر اس قسم کی
يفرش و غير ذلك فلولاً	چیزوں سے ہم دنیا میں واقف
مع فتنا بما يشبه ذلك	نہو چکے ہوتے تو ان موعود چیزوں کو
في الدنيا لم يفهم ما	کیونکر سمجھ سکتے۔ تاہم ہم یہ بھی جانتے
وعدنا به و نحن نعلم	ہیں کہ یہ چیزیں دنیاوی چیزوں کے
مع ذلك ان تلك الحقائق	مانند نہیں ہیں یہاں تک کہ
ليست مثل هذا حتى قال	ابن عباسؓ کا قول ہے کہ دنیاؤ
ابن عباس ليس في الدنيا	آخرت کی چیزوں میں نام کے سوا
مما في الجنة الا الاسماء	اور کسی چیز میں مشارکت نہیں۔“

(الکلام شبلی)



علامہ ابن تیمیہ کی مندرجہ ذیل عربی عبارت کا ترجمہ

از علامہ عثمانی

فمن جرب ما يقولونه
(ای الانبياء) ويقوله
غيرهم وجد الصواب
معهم والخطاء مع
مخالفيهم كما قال
الرازي مع انه من عظم
الناس طعننا في الادلة
السمعية حتى ابتدء قولا
ما عرف به قائل مشهور
غیره وهو انها تضيد
اليقين ومع هذا فانه
يقول لقد تأملت الطوى
الكلامية والمناهج
الفلسفية فما رأيت هنا
تثنى عليلاً وتروى غليلاً
ووجدت اقرب الطرق
طريقة القرآن .

تو جو شخص انبیاء علیہم السلام کے
ارشادات اور لوگوں کے اقوال کا
تجربہ کرے گا وہ یقیناً انبیاء کو حق پر
اور ان کے مخالفوں کو خطا پر پائے
گا۔ دیکھو رازی جو سب سے زیادہ
سمعی روایات کو غیر معتبر ٹھہرانے
والے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے
ایسی بات کہی جو ان سے پہلے کسی نے
بھی نہ کہی تھی یعنی یہ کہ روایات سے
کبھی یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو
سکتا۔ اس رازی کو بھی یہ کہنا
پڑا میں نے فلسفہ اور علم کلام کے
طریقوں میں بہت تامل کیا مگر
ان کو ہرگز ایسا نہ پایا جو ایک ملغی
کو شفا بخشیں یا کسی پیاسے کو میراب
کر سکیں ہاں تمام راستوں میں
نزدیک تر راستہ قرآن کا ہے ۔

دونوں تراجم آپ کے سامنے ہیں۔ طبیعت سلیم اور ذوقِ ادب کی روشن شمع کو رہبر بنائیے اور دیکھئے کہ علامہ شبلی اور عثمانی دونوں کے تراجم بالماثورہ ہیں لیکن جو شستگی اور جزالت و حقیقی علامہ عثمانی کے ترجمہ میں ہے وہ شبلی کے یہاں نہیں ہے۔
اچھا تراجم کا ایک ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیے۔

ترجمہ عبارت امام غزالی از علامہ شبلی

ثم ان المتخيلة يفعل	”پھر قوت متخیلہ وہی عمل کرتی ہے“
مثل ما يفعل في حال	جو تعبیر خواب کی حالت میں کرتی ہے“
الرؤيا المحتلجة الى	یعنی یہ کمان واقعات کو لیتی ہے
التعبير بأن ياخذ تلك	اور ان کی نقل اتارتی ہے اور قوت
الاحوال ويعاكيها و	حقیقہ پر چھا جاتی ہے یہاں تک کہ
يستولي على الحسية حتى	یہ تخمیل قوت جس پر اس قدر اثر
يوشم ما يتخيل فيها من	ڈالتا ہے کہ قوت متخیلہ میں جو
تلك في قوة بنطاسيا بان	صورتیں تھیں وہ جس مشترک میں اثر
ينطبع الصورة الحاصلة	آتی ہیں تو اس حالت میں عجیب
فيها في البنتاسيا المشار	عجیب خدائی صورتیں نظر آتی ہیں
فيشاهد صور الهية عجيبة	اور خدائی آوازیں سنائی دیتی
مرئية واقاويل الهية	اور وہ ایسی ہوتی ہیں جیسے
مسموعة هي مثل تلك	کہ وحی کے مددکات اور یہ اس
المدركات الوحيية و	وصف سے جس کو نبوت کہتے
هذا دون درجات المعنى	ہیں کمتر درجہ ہے۔ (الکلام ص ۲۳)
المسمى بالنبوة۔	

ترجمہ عبارت امام غزالی از علامہ عثمانی

فلا تغناء بالعقل عن	۱۰ یہ عقل کو نقل سے ہستنا اور
السمع ولا تغناء بالسمع	یہ عقل نقل سے بے نیاز ہے جیسا
عن العقل فالداعی	کہ عقل کو معزول کر کے محض تقلید
الی محض التقليد معزل	کی طرف بلانے والا جاہل ہے اسی
العقل بالکلیۃ جاہل	طرح وہ شخص بھی دھوکے میں ہے
والمکتفی ببجاء العقل	جو قرآن و سنت کے انوار سے
عن انوار القرآن والسنة	علیحدہ ہو کر صرف اپنی عقل پر
مخبر ورفایا ان تکون	بھروسہ کرے تو تم کو ان دونوں
من الفرقین وکن جامعاً	گرد ہوں میں سے کسی میں بھی نہ
بین الاصلین فان العلم	ہونا چاہئے ۔ بلکہ عقل و نقل
العقلیۃ کالاعذیۃ و	کا جامع بننا چاہئے کیونکہ علوم
العلوم الشرعیۃ	عقلیہ عقل کی غذا اور علوم شرعیہ
کالادویۃ و الشخص المرضی	اس کی دوا ہیں اور جو مریض دوا
یستضر بالغذاء متى	کا استعمال نہ کرے اس کو غذا
فاته الدواء فکذلک	کے استعمال سے نقصان پہنچ جاتا
امراض القلوب لا یمکن	ہے یہی حالت دل کے امراض
علاجها الا بالادویۃ	کی ہے کہ ان کا علاج شرعی دوا
المستفادۃ من الشرعیۃ	سے یعنی ان عبادات اور اعمال
وہی وظائف العبادات	ہی ہو سکتا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام

والاعمال التي ركبها
 الانبياء صلوات الله عليهم
 لاصلاح القلوب من لاياد
 قلبه المريض بمعالجات
 العبادة الشرعية والكتفي
 بالعلوم العقلية استضر
 بها كما يستضر المريض
 بالغذاء وظن من يظن
 ان العلوم العقلية متنا^{قضة}
 للعلوم الشرعية وان
 الجمع بينهما غير ممكن
 ظن صادر عن عبي في عين
 البصيرة نعوذ بالله منه

نے اس کام کے لئے ترکیب دیا ہے
 ہیں جس کا دل بیمار ہو اور وہ
 طب شرعی کے بموجب اس کا معالجہ
 بھی نہ کرے اور علوم عقلیہ کو اپنے
 حق میں کافی سمجھے وہ اس طرح ہلاک
 ہو گا جس طرح بیمار آدمی غذا سے
 ہلاک ہو جاتا ہے ، باقی جو لوگ
 سچے علوم عقلیہ کو علوم شرعیہ کے
 خلاف تصور کرتے ہیں اور دونوں
 میں تطبیق محال سمجھتے ہیں یہ ان
 کا خیال اس درجہ سے ہے کہ ان
 کی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں ،
 خدا کی پناہ : (العقل والنقل)

علامہ شبلی اور علامہ عثمانی دونوں کے ترجمے عالمانہ ، ادبیانہ اور پرمساحرہ ہیں ،
 لیکن ترجمہ کی شان کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ ترجمہ ترجمہ نہ رہے
 بلکہ مترجم اس رنگ میں ترجمہ کرے کہ گویا اس نے مصنف کے اصلی جوہر کو اپنے مستقل
 او سلسل مضمون میں اپنا لیا ہے ۔ یہ خوبی عثمانی کے ترجمہ میں آپ کو زیادہ نمایاں
 نظر آئے گی ۔ علاوہ ازیں عثمانی کا ترجمہ زیادہ سلیس اور سبک ہے اور روزمرہ کے
 زیادہ مطابق ہے ۔

یہاں پیکر شبلی اور عثمانی کا توازن قاری کے لمحات فکر پر ختم کیا جاتا ہے ۔ ہم نے
 جو آپس میں توازن قائم کیا ہے یہ ہمارا اپنا ذوق ہے ، آپ کو اپنی رائے قائم کرنے کا حق ہے ۔

ابوالکلامؒ علامہ عثمانی

مولانا ابوالکلام کے علمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کے چرچے گھر گھر ہیں۔
 کوئی بزمِ فضل و ہنر ہے جہاں ان کی شمعِ علم و ادب روشن نہیں۔ ان کی لیاقت
 اور قابلیت نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ ان کے
 کارناموں سے فضائیں گونج رہی ہیں۔ وہ قلم و زبان دونوں کے مرد میدان ہیں۔
 ان کی تقریر میں جادو اور ان کی تحریر میں سحر ہے۔ آسمانِ شہرت پر ان کی ہستی
 ماہتاب بن کر اس وقت چمکی جب وہ البلال پر اپنے قلم کی گلگاریاں کر رہے
 تھے اور البلاغ کا دامن ہیروں سے بھر رہے تھے۔

۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم ہوئی اور ۱۹۱۱ء میں دربار میں اس کی تنسیخ کا
 حکم صادر ہو گیا۔ تقسیم میں مسلمانوں کے فوائد تھے اور تنسیخ میں مضار اس لئے
 ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی انقلاب نے ایک کروٹ بدلی انہی دنوں
 البلال نکلا۔ ۱۹۱۴ء بلال بدر بن چکا تھا اور اس کی چمک کے ساتھ مولانا
 ابوالکلام کی چمک بھی بڑھتی چلی گئی۔ فضل الدین احمد صاحب تذکرۃ ابوالکلام
 کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

”البلال کا سب سے کارنامہ جو ہمیشہ تاریخِ ہند میں یادگار رہے گا وہ
 پانڈار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اس کی دعوتِ حق سے
 پیدا ہو گیا“

”مذہبی دعوت و تبلیغ، پولیٹیکل پالیسی، علمی و ادبی مباحث،
 طرزِ تحریر و انشاء الفاظ و تراکیب کوئی بات ایسی نہیں ہے جس میں اس

(الہلال) نے اپنا مجتہدانہ رنگ ہاتھ سے دیا ہو۔ اسی خصوصیت کا

نتیجہ ہے کہ بیکایک ملک تمام پچھلے رنگ منٹ گئے :-

غرض مولانا ابوالکلام کی زندگی کا اٹھان قومی بیداری اور سیاسی وادبی مشاغل کا مرکز بن گیا۔ سلسلہ سیاست و آزادی ہند میں قید و فرنگ کی کڑیاں بھی جھیلیں چنانچہ غبارِ خاطر کے بہت سے ذرات خطوط کی شکل میں قلعہ احمد نگر کے روشن دانوں کی یادگار تازہ کر رہے ہیں اور اسی طرح تذکرہ کی تحریریں بھی جیسا کہ مقدمہ سے پتہ چلتا ہے، گورنمنٹ بنگال کے، بنگال بدر ہو جانے کے حکم پر اپریل ۱۹۱۶ء کے بعد ابوالکلام کے قیام رانچی کی دماغی تخلیق کے نتائج ہیں۔

مولانا ابوالکلام تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف، سیاست و انقلاب کے لمحوں سے کھیلے رہے تا آنکہ ملک کے نامور لیڈر بن گئے اور ادھر مشہور صاحبِ قلم اردو کے مشہور ادیب سجاد مرحوم بی۔ اے۔ ایل ایل، بی (علیگ) لکھتے ہیں:

”ایک طرف تمدن جدید کو ٹلے رہا تھا اور دوسری طرف ایک انسان کی ہمہ گیر قوتیں رو بہ کار تھیں جن کی ہر جنبش کنگرہ فرعونیت کو متزلزل اور وقارِ فرد کو پامال کر سکتی ہے۔ مولانا ابوالکلام کا دماغ ان معجزات میں سے ہے جو کارکنانِ قضاء و قدر کی حیرت انگیز کوشش طرازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں“

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف میں تذکرہ اور ترجمان القرآن رہتی دنیا تک ان کی یادگار رہے گی۔ یہی سجاد مرحوم لکھتے ہیں :-

”جب مولانا آزاد قرآن سیکر اٹھے مسلمان مبہوت ہو گئے کہ تیرہ سو برس کے صحیفے میں حال ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نکات و حقائق پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی شخصیت ان بلند نظر شخصیتوں

میں سے ہے جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جاسکتا۔ دورِ جدید میں اگر مذہب کو کسی نے سیاست سے صحیح طور پر ملا دیا ہے اور علماء کے کھینٹے اقتدار کو دوبارہ حاصل کر لیا ہے وہ تنہا مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔
غرض مولانا ابوالکلام ایک زبردست اہل علم ہیں۔ ان میں علم و فضل کے علاوہ ادبیت کا جو سلیقہ ہے اس سے بھی کسی کو انکار کی گنجائش نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ عربیت و فارسیت کے خمیری اور فطری اثرات نے انہیں الفاظ مشککہ کے استعمال پر مجبور کر دیا ہے جس سے اہل ادب کا ایک طبقہ بیزار ہے وہ ان کی کس قسم کی ادبیت ہے تذکرہ کی حسب ذیل عبارت پڑھیے :-
” فی الحقیقت یہی سخی ہیں دیگر صد ہا معانی و حقائق ثابتہ کے ساتھ

اس رفع ذکر کے کہ ”ودفعنا لک ذکرک“ اور یہی وہ مقام ہے کہ جب اصحاب کشف و مشاہدات کے سامنے کھلا تو انہوں نے حقیقت محمدیہ کے احاطہ و حیات اور عدم زوال و بقا و استمرار کو تمام انبیاء کرام کے حقائق تعینات سے مافوق اور بوجہ دائرۃ الدوائر اور مرکز اور ارتعاش مابعد اور نقطۃ الحیات فی الاصل و الحقیقت ہونے کے تمام افوار تعینات و وجود کو اس کی نورانیت کے سامنے بے فروغ و ماند پایا۔“

اسی قسم کی بے شمار عبارتوں سے تذکرہ بھرا پڑا ہے۔ سلیس اور سادہ عبارتیں بھی تذکرہ میں ضرور ہیں مگر کم۔ اگر تذکرہ پڑھ کر قاری کے کچھ پلے نہ پڑے تو وہ ادب سخی مشکور نہ بنے گا۔ اسی قسم کی عبارتوں کے متعلق ہسٹری آف اردو لٹریچر میں رام بابو سکسینہ کی یہ عبارت دیکھئے :-

”اگر لوگوں کا میلان طبع اس طرف ہے کہ عبارت میں مشکل مشکل اور غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کئے جائیں تاکہ عبارت

شاندار اور وقیع معلوم ہو ہمارے
 خیال میں اس طرز کے مختصر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جنہوں نے اپنے
 مشہور اخبار الہلال میں اس کو بہت برتا ہے۔ مولانا نے موصوف
 مذہب اور سیاسیات پر بڑے زبردست لکھتے والوں میں ہیں۔ (صفحہ ۹۷)
 اسی الفاظ مشکلمہ اور دقیق سنجی پر رجبوہن دتا ترکیفی نے بھی کڑی تنقید
 کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

”قاہرہ اور بیروت کی عربی اصطلاحوں کے باوجود مولانا ابوالکلام

آزاد استدلالی اسلوب کے آخری نمائندہ ہیں۔“ (کیفیت صفحہ ۲۹۸)

یہ سب کچھ مانا مگر ابوالکلام کی اردو روش اور اردو زبان میں شان
 و شوکت اور بے پناہ دبدبہ و سطوت ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج
 رہے ہیں اور بجلی کڑک رہی ہے اور اس عالم میں ایک دم بارش برسنے لگی اڈ
 بڑی بڑی بوندیں تر تر پڑنے لگیں۔ یا ایک دریا ہے جس کی بلند موجیں سنا
 سے بھی چلی جاتی ہیں۔ ان کی سلیس عبارتوں کے نمونے توازن عثمانی میں
 آپ دیکھیں گے۔

یہاں سچکیمجھے اپنے سلسلہ تحریر کو علامہ عثمانی کی طرف موڑنا ہے، اور
 پاکستان کے اس شیخ الاسلام اور ہندوستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام
 کا موازنہ کرنا ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ

علم و فضل کے ان دو سکولوں کے فیوض ہند اور بیرون ہند میں دور دور
 تک پھیلے ہوئے ہیں پہلے سکول سے علامہ عثمانی کا تعلق ہے اور وہ شیخ الہند

مولانا محمود الحسنؒ اسیر مالٹا جیسے بے مثل روحانی و سیاسی رہنما کے ارشد تلامذہ میں سے ان کے ایک محبوب شاگرد ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی حبیہ پیکرِ علم و تحقیق کے چیتے شاگرد اور تربیت یافتہ ہیں۔ دارالعلوم اسلاف کے قدیم مسلک روحانی اور خالص اسلامی خدمت کا علمبردار آزاد اور ندوہ جدید طرز اور علمی اقدار اور اردو زبان کا شگفتہ پھول ہے۔

الغرض علامہ عثمانی اور مولانا ابوالکلام علم و فضل کے دو ہموار ہیں۔ ان دونوں نے تفسیریں لکھی ہیں۔ دونوں کی تفسیروں کے اقتباسات بدریہ ناظرین ہیں ملاحظہ فرمائیں اور جائزہ لیں کہ علم و ادب کی کرنیں ان دونوں میں کس طرح ”نور علی نور“ کا مصداق بن رہی ہیں۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْمَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ
لِنُرِيَهُ مِّنَ الْيَتِيمَانِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ه

”پاک ہے (وہ ذات) جو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک
لے گئی جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا سے تاکہ ہم اپنی قدرت کے
نمونے دکھائیں۔ وہی سننے اور دیکھنے والا ہے۔“

مولانا آزاد ابوالکلام آزاد	علامہ عثمانی شیخ الاسلام
واقعہ اسریٰ کی نوعیت کیا	اس کی ذات نقص و قصور اور
تھی؟ یہ عالم بیداری میں پیش	ہر قسم کے ضعف و عجز سے پاک ہے
آیا یا عالم خواب میں، صرف روح	جو بات ہمارے خیال میں بے انتہا

پر طاری ہوا تھا یا جسم بھی اس
 میں شریک تھا اس بارے میں
 صحابہ و سلف کا اختلاف معلوم
 ہے۔ اکثر صحابہ و تابعین اس
 طرف گئے ہیں کہ رُوح و جسم دونوں
 پر طاری ہوا لیکن حضرت عائشہؓ
 حذیفہ بن یمان، حسن، معاویہ،
 ابن اسحاق وغیرہم سے مروی ہے
 کہ یہ ایک روحانی معاملہ تھا۔
 اصل یہ ہے کہ انبیاء کرام
 (علیہم السلام) کے احوال و حالات
 ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتے ہیں
 جس کے لئے ہماری عام تعبیرات
 کام نہیں دے سکتیں۔ ہماری ہر
 تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا
 کر دے گی جو عام طور پر ہمیں پیش
 آنی رہتی ہیں۔ لیکن انبیاء کرام کو جو
 جو حالات پیش آتے ہیں ان کی بحث
 ہی دوسری ہوتی ہے۔ وہ ہمارے
 محسوسات و مفہومات کے دائرہ
 سے باہر کے معاملات ہیں۔

عجیب معلوم ہوا اور ہماری ناقص عقلیں
 اسے مستحکم نہیں، خدا کی قدرت و
 معنیت کے سامنے وہ کچھ بھی مشکل
 نہیں (یہی قدرت ہے کہ رب قہریم)
 صرف ایک رات کے محدود حصے
 میں اپنے مخصوص ترین اور مقرب
 ترین بندہ محمد رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کو حرم مکہ سے بیت المقدس
 تک لے گیا۔ اس سفر کی غرض کیا
 تھی آگے چل کر یہ تشریح مٹ
 آیتنا میں اس کی طرف اشارہ
 فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خود
 اس سفر میں یا بیت المقدس سے
 آگے کہیں اور لے جا کر اپنی قدرت
 کے عظیم الشان اور حکیمانہ انتظامات
 کے عجیب و غریب نمونے دکھلانے
 منظور تھے۔ سورہ نجم میں ان آیات
 کا کچھ ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا
 ہے کہ آپ مدبرۃ المتنبیٰ تک تشریف
 لے گئے اور نہایت عظیم الشان آیات
 کا مشاہدہ فرمایا۔ وَكَذَٰلِكَ

خود نبوت کی حقیقت کیا ہے؟
 وحی کا معاملہ کیونکر انجام پاتا ہے؟
 کیا اس بارے میں ہماری کوئی تعبیر
 بھی حقیقت حال کی کامل تعبیر
 ہو سکتی ہے؟ صحیحین کی ایک
 حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا
 جب وحی آتی ہے تو ایسا معلوم
 ہوتا ہے جیسے مصلصۃ البحر جس کی
 آواز ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی
 تمثیل ہے جو اس لئے اختیار کی
 گئی کہ اس معاملہ کا ایک قریبی
 تخیل ہمارے اندر پیدا ہو جائے
 ورنہ وحی کی آمد محض گھنٹیوں
 کی آواز کی طرح نہیں ہو سکتی۔
 پس اسرئیل کے معاملہ کے لئے
 بھی ہماری محدود تعبیرات کام
 نہیں دے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ
 صحابہ کے تاثرات مختلف ہوئے۔
 جن لوگوں نے اس کی نفی کی کہ بیدار
 میں پیش آیا تھا وہ اس طرف
 گئے کہ یہ ہماری جسمانی نقل و حرکت

تَنَزَّلَتْ أَهْمًا عِنْدَ سِدْرَةِ
 الْمُنْتَهَى عِنْدَ هَاجِئَةٍ
 الْمَأْوَى إِذْ يَغْشَى السِّدْرَ مَا
 مَا يَغْشَى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ
 مَا طَغَى لَقَدْ رَأَى مِنْ
 آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى (النجم)
 علماء کی اصطلاح میں مکہ سے
 بیت المقدس تک کے سفر کو اسرار
 اور وہاں سے اوپر سدرۃ المنتہی
 تک کی سیاحت کو معراج کہتے ہیں
 اور لسا اوقات دونوں سفروں
 کے مجموعہ کو ایک ہی لفظ اسرار یا
 معراج سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔
 معراج کی احادیث تقریباً
 تیس صحابہ سے منقول ہیں جن میں
 معراج و اسرار کے واقعات
 بسط و تفصیل سے بیان ہوئے
 ہیں۔ جبہ و سلف و خلف کا عقیدہ
 یہ ہے کہ حضور پر نور کو حالت
 سیداری میں بچسیدہ الشریف
 (محجم اطہر) معراج ہوئی۔

کی طرح کا معاملہ نہ تھا۔ جن لوگوں نے اس پر زور دیا کہ سید کی میں پیش آیا تھا وہ اس طرف گئے کہ اے محض خواب کی طرح کا معاملہ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس میں شک نہیں کہ دونوں اپنے تاثرات میں برسرِ حق تھے۔ خود صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں اس وقت ایک ایسے عالم میں تھا کہ نہ تو سوتا تھا اور نہ جاگتا تھا۔ بین النائم والیقظان۔ اس معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آیا کرتا ہے نہ ایسا جیسا سوتے میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی۔ اور ہماری تعبیرات میں اس کے لئے کوئی تعبیر نہیں۔

(ب) آیت (۶۰) وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا

صرف دو تین صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ واقعہ اسرار و معراج کو منام (نیند) کی حالت میں بطور ایک عجیب و غریب خواب کے مانتے تھے۔ چنانچہ اسی سورت میں آگے چل کر جو لفظ ”وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ“ آتا ہے۔ اس سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں۔ سلف میں سے کسی کا قول نہیں کہ معراج حالتِ بیداری میں محض روحانی طور پر ہوئی جیسا کہ بعض حکماء و صوفیہ کے مذاق پر تجویز کیا جاسکتا ہے۔ روح المعانی میں ہے۔ وليس معنى الاسراء الذهاب بيقظة كالانسلاخ الذى ذهب اليه الصوفية والحكماء فانه وإن كان خارقاً للعادة ومحبلاً للتعجب أيضاً إلا انه أمر لا تعنفه العرب ولم يذهب

فتنة للناس میں روایا سے
مقصود یہی واقعہ ہے۔ چنانچہ
عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر،
حسن، مسروق، قتادہ، مجاہد،
عکرمہ، ابن جریج وغیرہم سے آیا
ہی مروی ہے۔ اور حافظ ابن کثیر
لکھتے ہیں کہ اس پر محققین تفسیر کا
اجماع ہو چکا ہے پس جن مفسروں
نے یہاں روایا سے مراد کوئی دوسری
روایا لی ہے مثلاً فتح مکہ کی روایا،
وہ قابل اعتنا نہیں کیونکہ سورت
بالاتفاق منکئی ہے اور وہ واقعہ
ایک عرصہ کے بعد مدینہ میں پیش
آیا تھا اور تطبیق کے لئے طرح طرح
کے تکلفات کرنا قرآن کو چیلستان
بنادینا ہے۔ ان مفسروں نے یہ
تکلفات اس لئے کئے کہ روایا کا
اطلاق خواب پر ہوتا ہے۔ اور اگر
اس روایا سے مقصود واقعہ
اسری ہو تو پھر ان صحابہ کا قول
تسلیم کر لینا پڑے گا جو اس کے

الیہ احد من السلف الخ
یشک ابن قیم نے زاد المعاد میں
عائشہ صدیقہ، معاویہ، حسن
بصری رضی اللہ عنہم کے مسلک کی
اس طرح توجیہ کی ہے لیکن اس
پر کوئی نقل پیش نہیں کی محض ظن
و تخمین سے کام لیا ہے۔ ابن اسحاق
وغیرہ نے جو الفاظ ان بزرگوں
کے نقل کئے ہیں ان میں کہیں حالت
بیداری کی تصریح نہیں بہر حال
قرآن کریم نے جس قدر اہتمام
اور ممتاز و درخشاں عنوان سے
واقعہ اسرار کو ذکر فرمایا اللہ جل
قدر جدد مستعدی سے محافلین
اس کے انکار و تکذیب پر تیار ہو کر
میدان سے نکلے، حتیٰ کہ بعض
مواقفین کے قدم لغزش کھانے
لگے یہ اس کی دلیل ہے کہ واقعہ
کی نوعیت محض ایک عجیب و
غریب خواب یا سیر روحانی کی نہ
تھی۔ روحانی سیر و انکشافات

میداری میں ہونے کے قائل نہیں۔
 لیکن تعجب ہے کہ ان لوگوں نے
 حضرت عبداللہ بن عباس کی
 تفسیر پر نظر نہ ڈالی۔ حضرت
 عبداللہ بن عباس ان صحابہ میں
 ہیں جو معراج کو عالم میداری کا
 واقعہ سمجھتے تھے اور اس مذہب
 کے سب سے بڑے پیشرو تھے۔ با
 این ہمہ انہوں نے بھی اس آیت
 میں رویا کی یہی تفسیر کی ہے کہ
 واقعہ اسری مراد ہے۔ س دیا
 عَمَّا رَأَىٰ مُحَمَّدٌ رَّسُولَ اللَّهِ
 صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری)
 ایک آنکھوں سے دیکھی ہوئی رویا
 جو لیلۃ الاسری میں آنحضرت
 کو دکھائی گئی تھی۔ اگر حضرت ابن
 عباس کو اس آیت کی تفسیر میں کوئی
 دقت پیش نہ آئی جو اس مذہب
 کے سب سے بڑے قائل تھے تو
 پھر اور لوگوں کو کیوں دور ازکار
 توجیہوں کی ضرورت پیش آئی۔

کے رنگ میں آپ کے دعاوی
 ابتدائے بعثت سے رہے ہیں دکھا
 اسراء کفار کے لئے کچھ ان سے بڑھ
 کر تعجب خیز وحیرت انگیز نہ تھا۔
 جو خصوصی طور پر اس کو تکذیب نہ
 تردید اور استہزار و تمسخر کا نشانہ
 بناتے اور لوگوں کو دعوت دیتے
 کہ آؤ آج مدعی نبوت کی ایک بالکل
 انوکھی بات سنو، نہ آپ کو خاص
 اس واقعہ کے اظہار پر اس قدر
 متفکر و متوشش ہونے کی ضرورت
 تھی جو بعض روایات صحیح میں مذکور
 ہے بعض احادیث میں صاف
 لفظ ہیں ”ثم اصبت بمكة“
 یا ”ثم اتيت مكة“ پھر
 صبح کے وقت مکہ پہنچ گیا، اگر
 معراج کوئی روحانی کیفیت تھی
 تو آپ مکہ سے غائب ہی کہاں ہو
 اور شداد بن اوس وغیرہ کی روایت
 کے موافق بعض صحابہ کیہ دریافت
 کرنا کیا معنی رکھتا ہے ”کہ رات

اور یہ جو حضرت ابن عباس نے فرمایا ”رویا عین، ادبھا“ اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا اور وہ حقیقت آشکارا ہو گئی جس کی طرف ابھی ابھی ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی یہ جو کچھ پیش آیا تھا تو رو یا لیکن کیسی رو یا۔ ویسی ہی رو یا جیسی عالم خواب میں ہم دیکھا کرتے ہیں؟ نہیں ”رویا عین“ ایسی رو یا جس میں آنکھیں غافل نہیں ہوتیں۔ بیدار ہوتی ہیں۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسے آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہو۔ وما زاغ البصر ما طغی، ولقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ۔

(ترجمان القرآن جلد دوم)

صفحہ ۳۶۸ و ۳۶۹)

میں نے قیام گاہ پر تلاش کیا حضورؐ کہاں تشریف لے گئے تھے؟ ہمارے نزدیک ”امسریٰ بعبدہ“ کے یہ معنی لینا کہ خدا اپنے بندہ کو خواب میں یا محض روحانی طور پر مکہ سے بیت المقدس لے گیا اس کے مشابہ ہے کہ کوئی شخص ”فَأَسْرٰی بِعِبَادِی“ کے معنی لینے لگے کہ اے موسیٰ! میرے بندوں (نبی اسرائیل) کو خواب میں یا محض روحانی طور پر میکہ مصر سے نکل جاؤ۔ یا سورہ کہف میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کا حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لئے جانا اور ان کے ہمراہ سفر کرنا جس کے لئے کئی جگہ ”فَانْطَلَقَا“ کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ یہ سب کچھ محض خواب میں یا بطور روحانی میر کے واقع ہوا تھا۔ باقی لفظ ”رویا“ جو قرآن میں آیا اس کے متعلق

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرما چکے ہیں ”رَوَّيَا عَيْنِ اُرْيَہَا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ مفسرین نے کلام عرب سے اس
کے شواہد پیش کئے ہیں کہ رَوَّيَا کا لفظ گاہ بگاہ مطلق رویت (دیکھنے) کے معنی
میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اگر اس سے مراد یہ ہی اسرار کا واقعہ ہے تو مطلق
نظارہ کے معنی لئے جائیں جو ظاہری آنکھوں سے ہوا تاکہ ظواہر خصوص اور جہور
امت کے عقیدہ کی مخالفت نہ ہو۔ ہاں شریک کی روایت میں الفاظ ضرور
ایسے ایسے آئے ہیں جن سے اسرار کا بحالت نوم واقع ہونا معلوم ہوتا ہے مگر
محدثین کا اتفاق ہے کہ شریک کا حافظہ خراب تھا، اس لئے بڑے بڑے
حفاظ حدیث کے مقابلہ میں ان کی روایت قابل استناد نہیں ہو سکتی۔
حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے اواخر میں حدیث شریک کے اغلاط شمار کرائے
ہیں اور یہ بھی بتلایا ہے کہ ان کی روایت کا مطلب ایسا لیا جاسکتا ہے جو
عام احادیث کے مخالف نہ ہو۔ اس قسم کی تفاسیل ہم یہاں درج نہیں
کر سکتے۔ شرح صحیح مسلم میں یہ مباحث پوری شرح و بسط سے درج کئے
ہیں یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ مذہب راجح یہی ہے کہ معراج و اسرار کا
واقعہ حالت بیداری میں مجسمہ الشریف واقع ہوا۔ ہاں اگر اس سے
پہلے یا بعد خواب میں بھی اس طرح کے واقعات دکھلائے گئے ہوں تو
انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شب میں اتنی لمبی مسافت
زمین و آسمان کی کیسے طے کی ہوگی یا کرۂ نار و زمہریر میں سے کیسے گزریے
ہوں گے یا اہل یورپ کے خیال کے موافق جب آسمانوں کا وجود ہی نہیں
تو ایک آسمان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر اُس شان سے
تشریف لے جانا جو روایات میں مذکور ہے کیسے قابل تسلیم ہوگا لیکن

آج تک کوئی دلیل اس کی پیش نہیں کی گئی کہ آسمان واقع میں کوئی شے موجود نہیں اگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ نیلگوئی چیز جو ہم کو نظر آتی ہے فی الحقیقت آسمان نہیں ہے تب بھی اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس نیلگوئی رنگ کے اوپر آسمانوں کا وجود نہیں ہو سکتا۔

رہا ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا تو تمام حکماء تسلیم کرتے ہیں کہ سرعت حرکت کے لئے کوئی حد نہیں ہے۔ اب سے ایک سو برس پیشتر تو کسی کو یقین بھی نہیں آ سکتا تھا کہ تین سو میل فی گھنٹہ چلنے والی موٹر تیار ہو جائے گی یا دس ہزار فٹ کی بلندی تک ہم ہوائی جہاز کے ذریعہ پرواز کر سکیں گے۔ ”اسٹیم“ اور ”قوت کہربائیہ“ کے یہ کرشمے کس نے دیکھے تھے کہ نہ تو آج کل ایک لفظ بے معنی ہے۔ ہاں اوپر جا کر ہوا کی سخت برودت وغیرہ کا مقابلہ کرنے والے آلات طیاروں میں لگا دئے گئے ہیں جو اٹنے والوں کی زہریلے سے حفاظت کرتے ہیں۔ یہ تو مخلوق کی بنائی ہوئی مشینوں کا حال تھا خالق کی بلا واسطہ پیدا کی ہوئی مشینوں کو دیکھتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ زمین یا سورج جو بیس گھنٹے میں کتنی مسافت طے کرتے ہیں۔ روشنی کی شعاع ایک منٹ میں کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔ بادل کی بجلی مشرق میں جھپکتی اور مغرب میں گرتی ہے اور اس سرعت سیر و سفر میں پہاڑ بھی سامنے آجائے تو پرکاش کی برابر حقیقت نہیں سمجھتی جس خدا نے یہ حیرتیں پیدا کیں کیا وہ قادر مطلق اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے براق میں ایسی برق رفتاری کی کلیں اور حفاظت و آسائش کے سامان نہ رکھ سکتا تھا جن سے حضور طبری راحت و تکریم کے ساتھ حتم زدن میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہو سکیں۔ شاید اسی لئے واقعہ امر آرا

کا بیان لفظ ”سبحان الذی“ سے شروع فرمایا۔ تاکہ جو لوگ کوتاہ نظری اور تنگ خیالی سے حق تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو اپنے دہم و خمین کی چہار دیواری میں محصور کرنا چاہتے ہیں کچھ اپنی گستاخیوں اور عقلی ترکنازیوں پر شرمائیں۔

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن ، کہ جانا سپر باید انداختن

(تفسیر عثمانی پارہ ۵۱۵ رکوع ۷)

تفسیر و ادب کے دونوں ترجانوں یعنی عثمانی اور ابوالکلام کی حکمت آرائیاں معراج نبوی کے معرکہ ارا اور دقیق مسئلہ پر آپ کے سامنے ہیں۔ میں نے اس خاص مسئلہ کو اس لئے پیش نظر رکھا ہے کہ در روشن دماغ ، وسیع القلب علماء اس نازک مقام پر اپنی علمی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآہوتے ہیں۔

۱۔ مولانا ابوالکلام نے ابتداء میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ مسئلہ معراج میں صحابہ و غیرہم کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت جو اکثریت پر مشتمل ہے وہ معراج جسمانی کی قائل ہے اور دوسری جماعت جو چند اصحاب پر شامل ہے وہ معراج روحانی اور خواب میں معراج کی قائل ہے۔

۲۔ مولانا ابوالکلام نے دونوں جماعتوں کا ذکر کر کے پھر یہ بتایا ہے کہ دونوں اپنے تاثرات میں برسر حق تھے۔ غرض یہاں تک مولانا ابوالکلام نے کسی جانب کو اختیار نہیں کیا اور ذمہ دارانہ طور پر دامن بچا کر چل رہے ہیں۔

۳۔ پھر آگے چل کر مصححین کی حدیث بین الناسم والیقظان کا ذکر کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ”اس معاملہ کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے ہیں پیش آیا کرتا ہے نہ ایسا جیسا سوتے میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی“ اور ہماری تعبیرات میں اس کے لئے کوئی تعبیر نہیں ہے۔“

۴۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام نے ”وما جعلنا الرأیٰ یا الذی ارینک الا فتنۃ للناس“ سے معراج کی کیفیت کو روایا کہہ کر اور رویا سے مراد معراج کا واقعہ بیان کر کے اپنا رجحان حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔

”جو کچھ پیش آیا، تھا تو رویا لیکن کیسی رویا؟ ویسی ہی رویا جیسی عالم خواب میں ہم دیکھا کرتے ہیں؟ نہیں رویا عین ایسی رویا جس میں آنکھیں غافل نہیں ہوتیں میدان ہوتی ہیں۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسا آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہو“

یہاں چکر مولانا ابوالکلام کا نظریہ معراج واضح ہو جاتا ہے یعنی وہ معراج کی کیفیت کو بیداری اور خواب کے درمیان کا مقام دیتے ہیں لیکن ان کی تقریر سے یہ بالکل واضح نہیں ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع جسم اطہر کے آسمان پر تشریف لے گئے تھے بلکہ ان کا رجحان دونوں اقوال کے درمیان نظر آتا ہے تاہم معراج جسمانی کے قائل نظر نہیں آتے۔

علامہ عثمانی

علامہ عثمانی کی تفسیر میں حسب ذیل تفصیلات پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ اسراء اور معراج کے متعلق علماء کی اصطلاح پر تبصرہ ہے۔ حرم محترم سے بیت المقدس تک کے سفر کو اسراء اور بیت المقدس سے عروج آسمانی کو معراج کہا گیا ہے۔ چنانچہ سبحان الذی اسہیٰ میں اسراء اور سورۃ نجم سے معراج کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ علامہ عثمانی نے صراحتہ معراج جسمانی کا دعویٰ کیا ہے اور حالت بیداری میں اسراء اور معراج پر زور دیا ہے اور یہی رائج قرار دیا ہے چنانچہ حدیث معراج جسمانی کے متعلق تین صحابہ کی روایت سے مہر تصدیق لگائی ہے۔

۳۔ جو چند اصحاب معراج روحانی یا رویا کے قائل ہیں ان پر روایتی جرح کی ہے۔ بعض صوفیاء کا بھی رد کیا ہے جن سے حالت بیداری میں معراج روحانی کے قول کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس کی علامہ عثمانی نے شد و مد سے رُوح المعانی کا قول نقل کر کے تردید کی ہے۔

۴۔ علامہ عثمانی نے رویا کے لفظ پر بحث کر کے * وما جعلنا السرا ذی الستی اریناک " سے رویت بھری پر محاورہ عرب کے مطابق استدلال کیا ہے۔ پھر اصیحت بمکة سے اپنے استدلال کو اور قوی بنایا ہے۔ مزید برآں شہادین اؤں کی روایت سے کہ رات میں نے قیام گاہ پر تلاش کیا حضور کہاں تشریف کے گئے تھے؟ معراج جسمانی کی تائید کی ہے۔ پھر جاہلیہ امت کا قول پیش کیا ہے۔

۵۔ چونکہ علامہ عثمانی نے معراج جسمانی کی تائید کی ہے اس لئے فلاسفہ کی مشکلات عقلیہ کے جوابات دے ہیں۔ مثلاً کرة زمہریر اور کرة نار یہ سے محفوظ رہ کر آسمانوں پر جانا۔ آسمانوں کے وجود سے بھی عہدہ برآ ہونے کا عثمانی نے ذکر کیا ہے۔ اس تیز سفری پر جو استحالہ مخالفین پیش کرتے ہیں اس سے بچاؤ کی بھی دلیلیں پیش کی ہیں غرض کہ عقلی اور نقلی تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر معراج جسمانی کا ثبوت دیا ہے۔ اب فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ البتہ اتنا کہنا مناسب ہوگا کہ علامہ عثمانی کی تفسیر بہت زیادہ محققانہ ہے۔

۲

اَلَا اِنَّ اَوْلٰیاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ
لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

(ترجمہ) یاد رکھو جو اللہ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مولانا ابوالکلام

علامہ عثمانی

قرآن نے ایمان اور اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات بھی اس قدر نمایاں نہیں ہے جس قدر کہ لا خوف علیہم ولا ہم یخزنون۔ خوف اور غم دونوں سے وہ محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ اس سورت کی آیت میں بھی یہی بات فرمائی ہے غور کرنا چاہئے کہ قرآن نے اس وصف پر کیوں اس قدر زور دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لئے اس زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی تشکو کی ساری سرگزشت انہی دو نقطوں میں سمٹی ہوئی ہے۔ خوف اور غم جو نہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادت اس کے قبضہ میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں سب

ابن کثیر نے روایات حدیثیہ کی بنا پر اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ کو آخرت میں اہوال محشر کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اُو نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوں گے۔ بعض مفسرین نے آیت کو کچھ عام رکھا ہے یعنی ان پر زندگی کے حوادث کا وقوع دنیا میں ہوگا نہ آخرت میں۔ اور کبھی مطلوب کے فوت ہونے پر وہ غمگین ہوتے ہیں گویا خوف سے خوفِ حق، یا غم سے غمِ آخرت کی نفی مراد نہیں بلکہ دنیا میں دنیوی خوف و غم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال مخالفت اعداء وغیرہ سے ہو سکتا ہے وہ مومن کاملین کو نہیں ہوتا۔ ہر وقت ان کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے اور تمام واقعات تکوینیہ کے خالی از حکمت نہونے کا اعتقاد رکھتے

ہیں۔ اس اعتماد و اعتقاد کے
استحضار سے انہیں خوف و غم
نہیں ستاتا۔

میرے نزدیک ”لاخوف
علیہم“ کا مطلب یہ لیا جائے
کہ ”اولیاء اللہ“ پر کوئی خوفناک
حیز (ہلاکت یا معتدبہ نقصان)
دنیا و آخرت میں واقع ہونے
والی نہیں۔ اگر فرض کیجئے دنیا میں
صورۃ کوئی نقصان پیش بھی آئے
تو چونکہ نتیجہ وہ ان کے حق میں نفع
عظیم کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے
اس کو معتدبہ نقصان نہیں کہا
جاسکتا۔ رہا کسی سبب دنیوی
یا اخروی کی وجہ سے ان کو کسی
وقت خوف لاحق ہونا وہ آیت
کی اس تقریر کے منافی ہوگا کیونکہ
آیت مذکورہ خبر دی ہے کہ ان پر کوئی
خوفناک چیز نہ پڑے گی یہ نہیں کہا
کہ انہیں کسی وقت خوف لاحق
نہوگا۔ شاید لایعینوں کے

کو ایک ایک کر کے چنوا اور دیکھو
خواہ جسم میں جھپٹے ہوں خواہ دماغ
میں، خواہ موجودہ زندگی کی حالت
میں خلل ڈالتے ہوں خواہ آخرت
کی تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے
باہر نہیں ہیں۔ یا خوف کا کاٹھا
ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے ایمان
کی راہ سعادت کی راہ ہے جس
کے قدم اس راہ میں جم گئے اس
کے لئے دونوں کانٹے بے اثر ہو
جاتے ہیں۔ اس کے لئے نہ کوئی
طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح
کی غمگینی۔ قرآن نے یہی حقیقت
دوسرے پیرایوں میں بھی بیان
کی ہے۔ مثلاً آخری پارہ میں
سورۃ عصر اسی حقیقت کا
اعلان ہے۔

مناسب لایجا فون نہ فرمانے اور لاخوف علیہم کی تعبیر اختیار کرنے میں یہی نکتہ ہو۔ باقی لایجنون کا تعلق میرے خیال میں مستقبل سے ہے یعنی موت کے وقت اور موت کے بعد غمگین نہ ہوں گے جیسا کہ فرمایا:

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَحْزَنُوا وَلَا تَحْسَبُوا
لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَنَاءُ الْأَكْبَرُ وَتَسْلَقَاهُمْ الْمَلَائِكَةُ
واللہ تعالیٰ اعلم (تفسیر عثمانی پارہ ۱۱ رکو ع ۱۲)

مولانا ابوالکلام

تبصرہ: قرآن کریم کی یہ مختصر سی آیت اولیاء اللہ کے لئے ایک پیغام امن و محبت ہے جس میں ایمان و عشق کی دو درادیں مضمون ہیں۔ جذبات محبت سے لبریز اس آیت کا انتخاب میں نے اسی لئے کیا ہے کہ یہاں قاری ان دونوں اہل علم و تحقیق کی رنگین قلمیوں سے آشنائے حقیقت ہو سکیں۔

ادبی تنقید:- جہاں تک ادبیت کا تعلق ہے مولانا ابوالکلام کی تحریک دوسرا پیرا ادبیت کا مرقع ہے۔ پہلے پیرے میں وہ جان نہیں۔ عبارت میں طمطراق اور جوش کے ساتھ درج ہے۔

معنویت:- جہاں تک تفسیر کی معنویت کا تعلق ہے اس میں زندگی کے جمالی اور دماغی کانٹوں سے استعارہ کے رنگ میں یہ بات پیش کی گئی ہے کہ دنیاوی زندگی ہر یا آخرت کی زندگی اس میں غم اور خوف کے دو کانٹے چھپتے رہتے ہیں لیکن ایمان کی سعادت جس شخص کے نصیب میں آتی ہے وہ دنیا و آخرت کے خوف اور غم سے مطمئن کر دیا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام کی تفسیر کا مرکز صرف اسی قدر ہو اور بس۔

علامہ عثمانی

علامہ عثمانی کی ادبیت میں ایک ہی قسم کی روانی اور تسلسل نیز فصاحت اور جامعیت ہے۔ مولانا ابوالکلام کے یہاں ادب میں جوش، طمطراق اور درد ہے۔ لیکن علامہ عثمانی کے یہاں ادبیت کے ساتھ روحانیت، نورانیت اور تحقیق علمی ہے۔ علاوہ ازیں عثمانی روایت و درایت کے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے تفسیر ابن کثیر کا نقطہ نگاہ پیش کر کے اپنی قرآنی بصیرت کے ماتحت اپنی علمی درایت و انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔ مولانا ابوالکلام کے یہاں انفرادیت ہی ہے۔

مولانا ابوالکلام کے یہاں اجمال ہے۔ علامہ عثمانی کے یہاں تفصیل ہے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اگر اولیاء کو غم لاحق ہو یا خوف کے حالات پیش آئیں تو ان کی توجیہ کیا ہے؟ لایحنت کے مقابلہ میں لایحجان کیوں نہ فرمایا گیا اس کی حکمت نحوی پر بھی اشارہ ہے۔ پھر غم کو مستقبل کے لئے قرار دینا اور اس کے تائید میں نظائر قرآنی پیش کرنا علامہ عثمانی کے مقام تفسیر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ میں نے تقابل میں اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ کوئی آیت اپنے وقت مضمون تحقیق علمی یا تنویر روحانی کے لحاظ سے کہاں تک تقابل کا سامان پیدا کر دے گی اس لئے انتخاب میں مختلف قسم کی دقتیں پیش آئی ہیں۔ ان میں سے دو مقام پیش کر دئے گئے ہیں کئی مقام ایسے ملیں گے جہاں مولانا ابوالکلام نے بہت طویل بحث کی ہے اور علامہ عثمانی نے مختصر عبارت میں بقدر ضرورت اس مضمون کو ادا کیا ہے اس لئے اگر مقابلہ میں ان عبارتوں کو پیش کیا جاتا تو بہت طویل سلسلہ بن جاتا لہذا ایسے مواقع کو درمیان میں لانے سے اجتناب کیا گیا ہے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَ
نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمًى

(ترجمہ) اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کے لئے گزران تنگ ہو جائے گی
اور ہم اس کو قیامت کے روز اندھا اٹھائیں گے۔

علامہ عثمانی

مولانا ابوالکلام

جو انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو کر
محض دنیا کی فانی زندگی ہی کو قبلہ
مقصود سمجھ بیٹھا ہے اس کی گزران
مکدر اور تنگ کر دی جاتی ہے گو
دیکھنے میں اس کے پاس بہت کچھ
مال و دولت اور سامانِ عیش
و عشرت نظر آئیں مگر اس کا دل
قناعت و توکل سے خالی ہونے کی
بنا پر ہر وقت دنیا کی مزید ترقی
کی فکر اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام
رہتا ہے۔ کسی وقت ننانوے کے
پھر سے قدم باہر نہیں نکلتا موت
کا یقین اور زوالِ دولت کے
خطرات الگ سوچان روح بہتے

جس نے ہمارے ذکر سے اعراض
کیا تو اسے دو حالتیں پیش آئیں
گی۔ دنیا میں اس کی زندگی ضیق
میں پڑ جائے گی یعنی وہ بظاہر
کتنا ہی نہال ہو جائے لیکن دل
کی طمانیت اور رُوح کا انبساط
اسے کبھی نہیں ملے گا۔ اور آخرت
میں بنیائی سے محروم ہو جائے گا
سعید انسانوں کی نگاہیں روشن
ہوں گی۔ اس کی اندھی۔ وہ جمالِ
الہی کا نظارہ کریں گی۔ اس کے
آگے پردہ پڑا ہو گا کَلَّا إِنَّهُمْ
عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
لَّمَّحْجُوْنَ۔

وہ اندھا کیوں ہو جائے گا؟
 اس لئے کہ آخرت کی زندگی دنیوی
 زندگی کا نتیجہ ہے۔ اس نے دنیا
 میں قدرت کی نشانیوں کو آنکھیں
 بند کر لی تھیں، اس لئے آخرت
 میں بھی اس کی آنکھیں بند
 رہیں گی۔ من کان فی هذه
 اعمى، فهو فی الآخرة
 اعمى واضل سبیلا۔
 یہاں سے معلوم ہو گیا کہ قرآن کے
 نزدیک ثواب آخرت کی حقیقت
 یہ ہے کہ نگاہیں جمال الہی کے
 نظارہ سے شاد کام ہوں گی۔
 عذاب کی یہ ہے کہ اندھی ہو کر
 محبوب ہو جائیں گی۔
 (ترجمان القرآن سورہ ظہر)

ہیں۔ یورپ کے اکثر متنعین کو
 دیکھ لیجئے کسی کو رات دن میں دو
 گھنٹے اور کسی خوش قسمت کو تین
 چار گھنٹے سونا نصیب ہوتا ہوگا۔
 بڑے بڑے کروڑ پتی دنیا کے محض
 سے تنگ آکر موت کو زندگی پر ترجیح
 دینے لگتے ہیں۔ اس نوع کی خودشی
 کی بہت مثالیں پائی گئی ہیں۔
 نصوص اور تجربہ اس پر شاہد ہیں کہ
 اس دنیا میں قلبی سکون اور حقیقی
 اطمینان کسی کو بدو یا دالہی کے
 حاصل نہیں ہو سکتا۔ "الْأَبْذَرُ
 كَرِهُهُ اللَّهُ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ"
 لیکن
 "ذوق این بادہ نرالی بخدا نامہ جیتی"
 بعض مفسرین نے "معیشت
 فنک" کے معنی لئے ہیں وہ زندگی
 جس میں خیر داخل نہ ہو سکے۔ گویا
 خیر کو اپنے اندر لینے سے تنگ ہو گئی۔
 ظاہر ہے کہ ایک کافر دنیا کے فتنے میں
 بدمست ہے اس کا سارا مال

دولت اور سامان عیش و تنعم آخر کار اس کے حق میں وبال بننے والا ہے۔ جس خوش حالی کا انجام چند روز کے بعد دائمی تباہی ہوا ہے خوشحال کہنا کہاں زیادہ ہے۔ بعض مفسرین نے ”معیشتہ ضنک“ سے قبر کی بزرگی زندگی مراد لی ہے یعنی قیامت سے پہلے اس پر سخت تنگی کا ایک دور آئے گا جبکہ قبر کی زمین بھی اس پر تنگ کر دی جائے گی۔ ”معیشتہ ضنک“ کی تفسیر عذاب قبر سے بعض صحابہ نے کی ہے بلکہ بزار نے باسناد جید ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ بہر حال ”معیشتہ ضنک“ میں یہ سب صورتیں داخل ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم

جو کافر دنیا میں ظاہری آنکھیں رکھتا تھا تعجب سے سوال کرے گا کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا جو آنکھیں چھین لی گئیں۔ (چونکہ دنیا میں ہماری آیات میں کر یقین نہ لایا نہ ان پر عمل کیا ایسا سمجھو لا رہا کہ سب مٹنی اُن مٹنی کر دی آج اسی طرح تجھے بھلایا جا رہا ہے۔ جیسے وہاں اندھا بنا رہا تھا یہاں اسی کے مناسب سزا ملنے اور اندھا کر کے اٹھلاتے جانے پر تعجب کیوں ہے؟ (تفسیر عثمانی طہ صفحہ ۴۱۵)

تبصرہ :- ورق گردانی میں یہ آیت سامنے آگئی۔ پہلے مولانا ابوالکلام ہی کی تفسیر پیش نظر تھی آیت بھی اپنی نوعیت میں خصوصی شان رکھتی تھی۔ اس تفسیر کے بعد تفسیر عثمانی پر نظر ڈالی تو قوت فیصلہ اسی کے توازن پر ٹھٹھک گئی۔ ادبیت کا رنگ دونوں عبارتوں میں چمک رہا ہے۔ دونوں کے قلم کی طاقت ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ادبی جواہر دونوں کے یہاں جھجک کر رہے ہیں۔

تفسیر کی نوعیتوں میں مولانا ابوالکلام کے یہاں جمال ہے علامہ عثمانی کے یہاں

قدرے تفصیل زیادہ ہے۔ مولانا ابوالکلام کے یہاں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ذکر الہی سے اعراض کرنے والے قیامت کے روز دیدار الہی سے محروم رہیں گے۔ علامہ عثمانی نے مطلق اندھے پن کا ذکر کیا ہے خواہ دیدار الہی سے ہویا اور مناظر محشر سے، علامہ عثمانی نے محشر کا یوم القیمة کے ماتحت حسب ذیل تفسیر کی ہے جو اختصار کی وجہ سے اوپر درج نہیں کی گئی:

”یعنی آنکھوں سے اندھا کہ کے محشر کی طرف لایا جائے گا اور (وہ)

دل کا بھی اندھا ہوگا کہ کسی محبت کی طرف رستہ نہ پاسے گا۔ یہ ابتدائے محشر کا ذکر ہے پھر آنکھیں کھول دی جائیں گی تارونخ وغیرہ احوال محشر کا معائنہ کرے۔“

علامہ عثمانی نے ابتدائے محشر کے وقت معرضین ذکر الہی کے نایاب ہونے کی وضاحت کی ہے۔ بعد ازاں بینا ہو جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام کی تفسیر اس سے خاموش ہے۔ نیز مولانا کے یہاں ”معیشتہ ضنکا“ کی صرف ایک توضیح کی گئی ہے یعنی ”دنیا میں اس کی زندگی ضیق میں پڑ جائیگی“ علامہ عثمانی نے اہل دولت و ثروت کے حالات زندگی اور گزران کی کشتی پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے متقدمین مفسرین کی روایات کو بھی اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے۔ بایں طور ہمارے سامنے علامہ عثمانی روایت و درایت، نیز متقدمین کے نظریات بھی پیش کر کے معلومات کا ذخیرہ پیش کر دیتے ہیں۔ بھرکتی خوبی کی بات ان کی تفسیر میں یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی علمیت و سہی و ذکاوت کے باوجود متقدمین و متاخرین سے مطابقت کا خاص خیال رکھتے ہیں لیکن اپنی بصیرت قرآنی کو بھی بالحد سے جانے نہیں دیتے۔

الغرض دونوں کی مکمل تفسیر پر نظر دوڑا جائے علامہ عثمانی نے بقدر ضرورت

فکر کی دقت و سلامت اور زبان و بیان کی فصاحت و حلاوت کی صفات ، اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان میں جمع کر دی تھیں کم از کم اس عاجز نے تو ابھی تک ان میں ان کا کوئی ثانی نہیں دیکھا۔ بارہا اپنے پر یہ گدڑا ہے کہ کسی علمی اشکال کو میسر حضرت مہر و ج کی خدمت میں حاضری ہوئی اور اس وقت پر جستہ جو کچھ فرمادیا وہی اس اشکال کا آخری اور شافی جواب تھا۔ کبھی کسی مسئلے کی سند کی تلاش و جستجو میں رجوع کیا گیا تو فوراً جواب ملا کہ فلاں فلاں کتاب میں اس کی تصریح موجود ہے۔ جن حضرات کو حضرت موصوفی علمی استفادے کا موقع ہوا ہوگا انہیں اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ زمانت و دکاوت فکر کی وقت و متانت اور دماغ کے سلجھاؤ میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔

اسی طرح اپنے مدعا کو بہترین اسلوب اور نہایت دلنشین انداز میں بیان کرنے اور دقیق سے دقیق علمی حقیقتوں کو آسان کر کے سمجھا دینے کا جو خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ ان کے لئے ان کے رب کا خاص عطیہ تھا۔

ایک مبصر ناقد نے مولانا کی بعض تقریریں سن کر ایک زمانے میں کہا تھا اؤ بالکل صحیح کہا تھا کہ جب لانا غیبی حقیقتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے سمجھانے، اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیب اب شاید غیب نہیں رہے گا بلکہ شہود بن کر سامنے آجائے گا۔

(الفرقان ماہ صفر ۱۳۶۹ھ۔ دسمبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۷)

اس مقام پر پہنچ کر ہم اپنے چھوٹے حقیقی سہائی متوفی ۱۹۵۸ء عزیزِ مریدانِ سخن فاضل دیوبند مرحوم کے قلم بند کئے ہوئے چشم دید واقعات جو مولانا عثمانی سے متعلق ہیں پیش کرتے ہیں۔ عزیزِ پاکستان سے پہلے اور بعد چند سال ملتان چھاؤنی ہائی سکول میں عربی کے ہیڈ تھے اور حضرت علامہ عثمانی دارالعلوم کے صدر مہتمم تھے اس وقت وہ دیوبند میں پڑھتے تھے۔

مشاہداتِ ریاض

۵۔ علامہ شبیر احمد صاحب اور مسئلہ تقدیر
پر معرکہ آرا تقریریں محرم ۱۳۶۱ھ

دورانِ تعلیم کا واقعہ ہے جبکہ میں دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ محرم الحرام ۱۳۶۱ھ میں دو حدیث کے تمام طلبہ نے جن میں خود راقم الحروف بھی شامل تھا حضرت شیخ الاسلام سے مسئلہ تقدیر کے بارے میں جا کر عرض کیا کہ کما حقہ ہماری تشقی نہیں ہوتی حضرت شیخ الاسلام کو وہ وقار اور علم کا بحر بیکران تھے اور ہمیں یقین تھا کہ آپ درخواست منظور فرمائیے۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام نے تقریباً ایک ماہ تک روزانہ ایک گھنٹہ مسئلہ تقدیر پر تقریر فرمائی میں خود بلا ناغہ حاضر رہتا تھا۔

الغرض ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ علوم اور وہ اسرار جو شاہ ولی اللہ کے حصہ میں آئے تھے ان کا جانشین اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ وہ مولینا کی ذات گرامی ہی تھی۔ اس تقریر سے میں یہ اندازہ لگا سکا کہ تمام دنیا سے اسلام میں عقائد، فلسفہ، کلام اور الہیات کی گتھیوں کو اگر کوئی سلجھا سکتا ہے تو مولینا اور صرف مولینا تھے۔

۶۔ بغداد و دمشق کے طریقہ تعلیم | مسئلہ تقدیر پر جب تقریر ختم ہوئی تقریباً
 اور موجودہ جدید طریق تعلیم میں | ایک ماہ بعد طلبہ نے اصرار کیا کہ بغداد
 فرق پر تقریریں صفر النظر ۱۳۶۱ھ | دمشق وغیرہ کی قدیم یونیورسٹیوں کے

طریقہ تعلیم اور طلبہ کے حصول تعلیم کے اطوار پر روشنی ڈالیں۔ چنانچہ تقریباً ایک ہفتہ
 تک علم کی صیغہ قدروں اور قدیم و جدید دور کے تدبیر کے طریقوں اور حصول علم
 کے لئے مفید اور کارگر طریقوں سے آگاہ فرماتے رہے۔ حصول تعلیم کے متعلق جس قسم
 کی معلومات اور ہدایات مولانا کی تقاریر میں تھیں ان کا عشر عشر بھی کہیں دوسری جگہ
 نہ پایا۔ علم کی اقدار کے بارے میں جو اشعار شیخ الاسلام نے پیش فرمائے ان میں سے
 مجھے اس وقت صرف ایک یاد ہے اس سے ان کے زور بیان کا کچھ اندازہ لگایا جا
 سکتا ہے تو لگالیں۔

وَمِمَّا أَذُنُ جَبْرِئِيلَ بِهٖ أَقْلًا مُّهْمَدُ

وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْ دِمِ الشَّهْدَاءِ

۷۔ فصاحت و بلاغت قرآن | حضرت شیخ الاسلام جامع علوم تھے، علم
 پر تقریر، ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ | ادب سے سید شغف اور لگاؤ تھا۔ دلائل

تقریر میں جس قسم کے ادبی نکات مولانا کی تقریر میں میں نے سنے وہ حیرتیں نہ پائی۔
 زمیر، اخرا نقیس کے کلام پر ایک بار جواب محاکمہ فرمایا۔ ایک بار دارالعلوم میں
 صدر الصدور ہونے کے زمانہ میں قرآن اور ”فصاحت و بلاغت“ کے موضوع پر
 تقریر فرمائی اور ایک ایسا حکمہ حل فرمایا جو مختصر المعانی کے مصنف علامہ تقی ساری
 اور تاجفیس کے مصنف عبدالرحمن دمشقی کو سمجھتے ہوں لیکن اس پوری تشریح اور ان
 نکات کو شاید یہ بزرگ بھی نہ پہنچ سکے ہوں۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ بلاغت و
 فصاحت کی اگرچہ جدا جدا تفرغیں ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو صحیح معیار استعمال

اور محل استعمال ہے چنانچہ مثال کے طور پر آپنجو القفل والجب ادا الضفادع
کو پیش کیا کہ ضفادع حد درجہ ثقیل ہے لیکن جملہ کی روانی اور استعمال نے اس کو فصیح
ہی نہیں بلکہ افصح بنا دیا ہے۔

۴۔ مقام دارالعلوم اور دیگر مدارس | ذوالقعدہ ۱۳۶۰ھ میں علامہ عبد السلام
عربیہ پر علامہ عثمانی کی تقریر،
ذوالقعدہ ۱۳۶۰ھ

کا مقصد وحید صرف یہ تھا کہ ہند کے مختلف اسلامی علوم کے مدارس کو ایک لڑی میں
پر دیا جائے گا اور ہر مدرسہ سے اس قسم کے خیر سگالی کے وفود آتے جاتے رہیں جس کے
ذریعہ اتحاد کا رشتہ استوار رہے۔ علامہ عبد السلام نے بھی تقریر کی۔ اور آخر میں صدر
جلسہ حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمدؒ نے نہایت مدلل و مفصل تقریر فرمائی جس میں
دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ کا مقابلہ کیا اور
بتلایا کہ اسلام کے دورِ اول سے علماء کا مقصد ہمیشہ ترویج علوم اور اشاعت اسلام
رہا لیکن اس زمانہ میں غیر مسلم حکومت اور غیر اسلامی نظام کی بنا پر معاشی مشکلات
کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بعد کچھ افراد تو ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے صرف دنیا
ترقی اور دنیاوی اعزاز ہی کو سب کچھ سمجھا اسلام اور مذہب کو اتنی اہمیت نہ دی۔
اس کے بعد فکر دنیا اور فکر عقبی اور دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء
کا مقابلہ کیا اور اکبر کے یہ اشعار پڑھے۔

ہے دل روشن مثال دیوبند ؛ اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
اب علیگڑھ کی بھی اک تشبیہ لو ؛ اک معزز پیٹ تم اس کو کہو

پیٹ ہے سب سے مقدم اسے عزیز
گرچہ فکر عاقبت ہے اصل چیز

ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ ، دارالعلوم علامہ عثمانی کی دارالعلوم میں وفد جامعہ ازہر کی آمد پر عربی میں تقریر

ہند کے تقریباً تمام مدارس میں علمی نظام اور کتب خانوں اور علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ دارالعلوم میں حضرت عثمانی صدر تھے۔ مولانا عثمانی نے آخر میں صدارتی تقریر عربی میں فرمائی حقیقت یہ ہے کہ ہندی علماء میں کون ایسا شخص علم و فضل کا مالک ہو گا جو کہ مولانا مرحوم کی عربی تقریر کا جواب پیش کر سکے۔ جامعہ ازہر قاہرہ کے وفد کے لیڈر کو فتح الملہم پیش کی گئی تو اس نے سجدہ تعریف کی اور کہا کہ تمام علمائے عرب مل کر اس کی مثال پیش کرنا چاہیں تو محال ہے۔

۹۔ لانگے خان کے باغ عام | حضرت شیخ الاسلام مدرسہ خیر المدارس ملتان شہر میں تقریریں ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لائے

اور اسی روز آل ورلڈ مسلم ایسوسی ایشن کی ملتان شاخ کا اجلاس تھا مخدوم مرید حسین ، علامہ اقبال شیدائی وغیرہ تمام موجود تھے۔ مولانا نے ورلڈ مسلم ایسوسی ایشن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ پاکستان خدا کا شکر ہے کہ عالم وجود میں آگیا اور اب اس کے استحکام اور شرعی نظام کی ترویج باقی ہے بعض لوگ شرعی حکومت کے نام سے بدکتے اور ڈرتے ہیں کہ ہمیں مولوی ہماری کرسیاں اور اعزاز چھین لیں لیکن میں اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں مولوی صاحبان ان کرسیوں کے خواہاں نہیں ہاں ہم آپ کو ہی مولوی بنانا چاہتے ہیں۔ اور آپ کو مولوی بننا پڑے گا۔

۲۔ علامہ کی صدارت میں مجتہد اصلاح | ۱۳۶۰ھ میں مولینا کی زیر پرستی اللسان کا قیام محرم ۱۳۶۰ھ مجتہد اصلاح اللسان کا قیام عمل

میں آیا جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے طلباء جو بیس گھنٹے عربی زبان استعمال کریں۔ چنانچہ اس کچنہ کے اجلاس عام طور پر مولانا ہی کی زیر صدارت ہوتے تھے اور مولانا کی عربی تقاریر سید موثر اور اعلیٰ پایہ کی ہوتی تھیں۔ اور مولانا کے فیض سے ہر طالب علم عربی بولنے پر قادر ہو گیا۔ اس عربی ادب کی ترقی کی شہرت جب ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پہنچی جو عربی زبان کا مرکز ہے تو سب حیران رہ گئے۔

۸۔ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ | مولانا عبدالحق لمبانی دارالعلوم دیوبند میں

مدرس ہو کر پہنچے تو بلا جھجک قاضی مبارک اور بیضاوی وغیرہ میں جہاں اشکال پیش آتے فوراً مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور حل فرما کر واپس لوٹتے۔

میں نے خود مولانا عبدالمسیحؒ سے سنا کہ حضرت

۳۔ علامہ اپنے زمانے کے

غزالی اور رازی تھے | اور غزالی ہیں۔ اور تقریباً یہی الفاظ مولانا

محمد دریس صاحب کاندھلوی مدظلہ سے سننے میں آئے۔ مولانا عثمانی زحقیقت

ایک آیت من آیات اللہ تھے۔

پھر دارالعلوم دیوبند کی طرف

مشاہدات راقم الحروف

علامہ کے علمی کارناموں کا درمیان میں ذکر آجانے سے ہمارے مشاہدات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ ہم علامہ سے متعلق اپنے آنکھ دیکھے واقعات پیش کر رہے تھے۔ آپ کی علمی اور علمی، سیاسی اور مذہبی خدمات کا تسلسل ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ واقعات ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء سے ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء تک کے ہیں جب راقم الحروف وہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں ۱۳۴۴ھ میں دارالعلوم کے سالانہ امتحان میں مولانا گل محمد صاحب ناظم مطبع و کنٹرولر انگریز مینسٹر کا طلبہ سے دست و گریبان ہونے کا واقعہ پیش آیا۔

۸ شعبان ۱۳۴۴ھ کا دن | چونکہ مولانا گل محمد خاں صاحب کے ذمے مطبع اور طلبہ سے متعلق بعض انتظامات کا معاملہ تھا اور وہ بھی کچھ سخت گیر سے آدمی تھے اس لئے طلبہ اور ان کی آپس میں چٹنک تھی۔ امتحان کے نگران ہونے کی حیثیت میں بھی وہ تشدد کو پسند کرتے تھے اس لئے ۸ شعبان ۱۳۴۴ھ کو میرے سامنے پیش آیا کہ طلبہ مولانا گل محمد خاں صاحب سے دست و گریبان ہو گئے۔ میرا اس روز متنبی کا چہرہ تھا میں نے سب واقعات آنکھوں سے دیکھے۔ اور ایسے واقعات کا ایسے مواقع میں ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں۔ میں خود پنجاب یونیورسٹی کے ایف۔ اے، بی۔ اے، مولوی فاضل، منشی فاضل وغیرہ میں ڈپٹی اور سپرنٹنڈنٹ رہا ہوں مجھے ان امور کا کافی تجربہ ہے کہ طلبہ کی نگرانی میں ذرا سا بھی تشدد طلبہ کو کتنا مخالف اور برا لگجھتے بنا دیتا ہے۔ بہر حال جو طلبہ مولانا گل محمد صاحب سے جین سمجھیں ہوئے ان میں

یوں تو بہت تھے مگر خاص طور پر جو سامنے آئے ان میں جان محمد بلیاوی، محمد ظہور
درہنگوی، عبدالحمان پشادینی، عبدالعزیز مظفرپوری، سلیم مظفرپوری اور
عبدالحق بیہاگلپوری تھے۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے مہتمم صاحب سے فرمایا کہ عبدالعزیز مظفرپوری
ان طلبہ میں شریک نہ تھا لہذا مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اس کے اخراج کا
حکم واپس لے لیا اور مولانا عثمانی کے اس فرمانے کے بعد مزید بحث اور تصدیق
کی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔

الحاصل ۱۳۴۳ھ گزرا اور ان حالات میں گزرا کہ ۸ شعبان کو یہ معاملہ
پیش آچکا تھا اور پھر ۱۳۴۵ھ آگیا۔ حضرت عثمانی نے دارالعلوم کے بعض انتظامات
میں جھول دیکھا تو نیک نیتی سے ایسی اصلاحات کی طرف مشورہ دیا جن سے
ایسے واقعات رونما نہ ہو سکیں جیسے کہ مولانا گل محمد صاحب اور طلبہ کے ساتھ
ہوئے تھے۔ نیز ان حالات کی چھان بین کا بھی مشورہ دیا جن کے باعث یہ واقعہ
ظہور میں آیا۔ بہر حال جو اصلاحی تجویزات انہوں نے پیش کیں ان کا ذکر سنئے۔

دارالعلوم دیوبند

علامہ شبیر احمد عثمانی کی طرف سے

بعض اصلاحات کا مشورہ

علامہ شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل، اعلیٰ مدرس اور ہندوستان کے مشارالینہ مصلح تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے متعلق ارباب انتظام کو وہ مناسب اور مفید مشوروں اور تجویزوں کے ذریعے فائدہ پہنچانے میں کبھی دریغ نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی وہ محسوس کرتے اپنے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نائب ہتم اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب ہتم سے وقت بے وقت دارالعلوم میں اصلاحات کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔

مجلس شوریٰ کے اجلاس ۲۴ شوال ۱۳۴۵ھ میں علامہ عثمانی کی اصلاحات کی مشکیش

دارالعلوم دیوبند ایک دینی ادارہ ہے لیکن دنیا کی زمین پر ہے۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کی بے شمار مذہبی اور ملی خدمات انجام دی ہیں لیکن اس میں اصلاحات کی گنجائش تو رہنی ہی چاہئے۔ ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۶ھ تک اور ۱۳۵۲ھ سے ۱۳۶۲ھ تک آپ نے بالخصوص اور ہمیشہ بالعموم ناظرین دارالعلوم کو تعلیمی اور انتظامی اصلاحات کی طرف برابر توجہ دلائی۔ ہم ۱۳۴۵ھ دارالعلوم دیوبند کی روئداد سے ایسی تجاویز پیش کرتے ہیں جو علامہ نے ہتم صاحب مولانا حبیب الرحمنؒ

اور مجلس شوریٰ کو مورخہ ۱۳۴۵ھ شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۷ اپریل ۱۹۲۷ء کو بعد نماز ظہر دارالعلوم میں پیش کیں۔ ان تجاویز پر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب اور حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کے بھی دستخط تھے۔ لیکن یہ تجاویز تھیں مولانا شبیر احمد صاحب کی لکھی ہوئیں۔ تجاویز یہ ہیں۔

۱۔ مجلس شوریٰ کے جلسے ہر سال ہونے چاہئیں۔ (ماخوذ از عبارت صفحہ ۲۲)

رپورٹ (۱۳۴۵ھ ص ۱)

۲۔ بزمانہ علالت حضرت ہتم مولانا محمد احمد صاحب و قیام مولانا حبیب الرحمن صاحب سمیدر آباد کن، دارالعلوم دیوبند کسمپرسی کی حالت میں رہا، اور منتظین میں ایک گونہ شخصیت پیدا ہوگئی۔ (ماخوذ صفحہ مذکورہ)

۳۔ ۱۳۴۴ھ میں طلبہ کے اضطراب کی وجوہات کا پتہ چلانا اور بعض ملازمین کی سختی کی طرف توجہ دلانا۔

۴۔ دیوبند اور اس کے قرب وجوار میں بعض اہل راستے اور متین حضرات کا تعین تاکہ وہ مدرسے کا جلد جلد معائنہ کرتے رہیں۔

۵۔ اراکین کی ایک خاص تعداد ایسی ہونی چاہئے جو مدرسے کے اہتمام اور ملازمین کے طرز عمل اور پابندی قواعد و دستور العمل کی بہت جلد جلد آزادانہ چانچ کر سکے۔

۶۔ دارالعلوم کی سالانہ روئداد ہر سال طبع ہونی چاہئے اور اس میں تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔

۷۔ مجلس شوریٰ کو چاہئے کہ وہ استبدادی کارروائیوں پر کڑی نظر رکھیں۔

۸۔ تعلیم کی اصلاح اور تبلیغ کے اہم فریضے کے مسائل پر، مدرسین کے طرز تعلیم اور ان کی قابلیت کی اصلاح کا صحیح توازن قائم رکھنے کے لئے اور

طلبہ کی شکایات یا جو کچھ تعلیمی یا اخلاقی خرابیاں ہوں ان کی طرف پیشقدمی ضروری ہے۔

۹۔ موجودہ اراکین اپنی ذمہ داری کو محسوس فرمائیں۔

۱۰۔ جماعت شوریٰ میں جلد از جلد ایسے چند اراکین کا اضافہ فرمائیں جو ان شروط کے موافق ہوں جو دارالعلوم کے اصول و قواعد اور اس کے گزشتہ تعامل و توارث سے ثابت ہو چکے ہیں۔

۱۱۔ تمام اعلیٰ عہدہ داروں مثلاً سرپرست، اہل شوریٰ، مہتمم، نائب مہتمم، سردفتر، صدر مدرس وغیرہم کے فرائض و اختیارات کی تشخیص و تحدید ہو جائے اور وہ شائع کر دی جائے۔

۱۲۔ روزہ مرہ کی عام ضروریات کے سوا جو کوئی غیر معمولی ضرورت ایسی پیش آئے جس کے فوراً انصرام کی ضرورت یا تاخیر میں نقصان ہے اور اس لئے رائے جماعت شوریٰ کی حاصل نہیں کی جاسکتی اس کے لئے ایک مختصر مجلس عالمہ بنادی جائے جس کے مشورے سے ایسی ضروریات بغیر مزید تعویق کے انجام دے سکیں۔ اور جو امور عام ضابطے کے خلاف مستثنیات کے طور پر کسی ضرورت سے کئے جاتے ہیں ان میں بھی مجلس عالمہ کی رائے حاصل کی جائے اور مجلس عالمہ کا خاص یہ کام ہو کہ وہ اس کی پوری نگرانی رکھے کہ دارالعلوم کے ہر شعبے میں قواعد اور دستور العمل کی پابندی کہاں تک ہوتی ہے۔ اور حساب و کتاب کہاں تک صحیح رہتا ہے۔ اس مجلس کے مفصل قانون بنانے کے لئے دو چار آدمی نامزد کروئے جائیں۔

۱۳۔ ممبران دارالعلوم میں سے ایک ایک دو ذمہ داری کے خاص خاص ممبر نامزد کئے جائیں وہ اس شعبے کی مخصوص طور پر نگرانی کیا کریں اور اس صیغے کی

اصلاح و ترقی کے متعلق غور و غوض کرتے رہیں۔

۱۴۔ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کو جہاں تک دارالعلوم کا مسلک قدیم اجازت دے بیش از بیش مفید اور وسیع الاثر بنانے کی کوشش کی جائے۔

۱۵۔ طلبہ کی تہذیب اخلاق کے لئے پوری تدابیر عمل میں لائی جائیں جن میں سحر بڑی یہ ہے کہ ان کے مربی عملی طور پر اسوہ (نمونہ) بنیں۔

۱۶۔ تعلیم مبلغین اور علمی تبلیغ کا اہتمام دارالعلوم کی شان کے مطابق ہو اور اس کام کے واسطے ایک خاص جماعت کو مامور کیا جائے کہ وہ اس کا خاکہ تیار کرے اور پھر اس کی سفارشات کو جہاں تک وسعت ہو منظور کیا جائے۔

۱۷۔ ہمارے خیال میں ممبران دارالعلوم دو قسم کے ہونے چاہئیں۔ ایک وہ جو اہل فضل و صلاح ہیں اور علم و دیانت کے ساتھ صاحب رائے ہوں۔ ایسے ممبروں کی جماعت کو جماعت منتظمہ دارالعلوم یا جماعت شوریٰ کہا جائے۔ دوسرے وہ جو پہلے طبقے کی طرح اگرچہ صاحب علم و فضل نہیں ہیں لیکن معاملات اور حساب و کتاب اور شعبہ انتظامیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں۔ دارالعلوم کے ہمدرد اور معین اور اس کے شرعی مسلک کو پسند کرنے والے اور اس کی فلاح میں ساعی ہوں ان کو اعزازی ممبر کہا جائے اور ان معاملات دارالعلوم میں جن کے وہ اہل ہیں ان کے مشورے اور عمل سے مدد لی جائے دارالعلوم کے وہ مسائل جو تعلیمی اور شرعی نقطہ نظر سے زیر بحث آئیں ان میں ان ممبران کی رائے کو قطعاً دخل نہ ہوگا۔ البتہ تعمیر، مطبخ، دفتر اور حسابی معاملات میں ان حضرات سے مدد لی جائے گی۔ باقی پہلا طبقہ یعنی جماعت شوریٰ یا جماعت منتظمہ تمام شعبہ دارالعلوم کی ہیئت حاکمہ ہوگی۔

یہ وہ اصلاحی خاکہ ہے جو علامہ شبیر احمد صاحب نے مولوی فصیح الدین ممبر

مجلس شوریٰ کی فرمائش پر مجلس شوریٰ میں پیش کیا۔ ان اصلاحات اور تجاویز کے بارے میں مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۴۵ھ کی رپورٹ میں تبصرو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سب تجاویز اور اصلاحات مہتمم صاحبان اور مجلس شوریٰ پہلے ہی کر چکی ہے چنانچہ رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

تفصیلات مذکورہ پر اجمالی نظر | اس تفصیل مذکور سے ظاہر ہو گیا کہ مولانا شبیر احمد صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے اس

میں تحت غنائک جو اصولی انتظام طلب درج فرمائے ہیں ان میں کوئی نامہ بھی ایسا نہیں ہے جو اصول و قواعد دارالعلوم میں داخل نہ ہو اور جس پر مجلس شوریٰ دارالعلوم نے توجہ مبذول نہ کی ہو..... امید ہے کہ خود مولانا شبیر احمد صاحب خصوصاً اور دیگر حضرات کو عموماً اطمینان ہوگا۔

خود مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم نے بھی دس تجویزیں لکھ کر مجلس شوریٰ کو بھیج دی تھیں تاکہ وہ مجلس شوریٰ میں شرکت سے پہلے ان پر غور کر لیں۔ ان تجویزوں میں وہ بھی ہیں جو علامہ شبیر احمد صاحب کی تجاویز کی موافقت میں ہیں۔ آخر میں مہتمم صاحب لکھتے ہیں :-

”جو تجاویز اصلاحی جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پیش فرمائی

ہیں ان میں سے بہت پہلے حضرت مہتمم صاحب اپنی اصولی تجاویز مذکورہ

بخدمت حضرت سرپرست صاحب (حضرت مولانا اشرف علی صاحب

تھانوی) مدظلہ (حال رحمۃ اللہ علیہ) و بعض ممبران کے پاس بذریعہ

ڈاک روانہ فرما چکے تھے۔ تاکہ ممبران اپنے موقع پر غور کر کے جلسہ شوریٰ

میں اپنی رائے مستحکم طور سے پیش کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ممبران نے

ہر ایک نمبر پر غور کر کے مجلس شوریٰ میں قواعد و ضوابط مرتب کیے“ (رپورٹ ۱۳۴۵ھ ص ۳۱)

مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس

۲۵ شوال ۱۳۴۵ھ ۲۸ اپریل ۱۹۲۷ء

مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس ۲۵ شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۸ اپریل ۱۹۲۷ء بروز جمعرات بوقت صبح دارالعلوم میں منعقد ہوا۔ منجملہ اور امور کے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے بحیثیت صدر مدرس اور ممبر مجلس شوریٰ، بتائید حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، تجویز پیش کی کہ مجلس شوریٰ میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث مدرسہ سلہٹ)، مولانا کفایت اللہ صاحب مفتی دہلوی کو مجلس شوریٰ کا ممبر بنایا جائے۔ یہ تجویز شاہ صاحب نے لکھ کر دی تھی جس پر طے ہوا کہ تھانہ بھون میں حضرت سرپرست کے سامنے یہ تجویز پیش کی جائے۔

مجلس شوریٰ کا جلسہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرصے سے باہر آمدورفت بند کر دی تھی۔ اس لئے ۲۹ شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۲۷ء پیر کے دن بمقام تھانہ بھون خانقاہ

امدادیہ میں ساڑھے تین بجے دوپہر کے بعد مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ جس میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا مولوی محمد حسن صاحب مراد آبادی رکن مجلس العلماء ریاست بھوپال و ممبر شوریٰ، مولوی حکیم جمیل الدین صاحب گینوی طبیب دہلی، مولانا مولوی عبدالرحمن صاحب سیوہاری ممبر و رکن مجلس العلماء و مہتمم مدرسہ احمدیہ عربیہ ریاست بھوپال، مولانا محمد اشفاق صاحب رانپوری نگران مدرسہ عربیہ سہارن پور، حافظ محمد نصیر الدین صاحب تاجر میرٹھ و ممبر نسیل بورڈ، مولوی شعیب الدین صاحب بہادر پبلشر گورنمنٹ

بھوپال شریک ہوئے۔ باقی مجلس شوریٰ کے تین ممبر یعنی مولانا نواب محی الدین خاں صاحب مراد آبادی، حکیم محمد اسحق صاحب کٹھوڑی اور مولوی مشیت اللہ صاحب بجنوری جو مجلس شوریٰ کے دیوبند کے اجلاسوں میں شریک ہوئے تھے رخصت ہو چکے تھے۔

الغرض حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کی تحریری تجویز بتائید حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب تھانہ بھون کے اجلاس میں پیش ہوئی حکیم جلیل الدین صاحب اور مولانا عبدالرحمن صاحب اور مولانا محمد حسن صاحب نے مفتی کفایت اللہ صاحب کو ممبر بنا لینے کی تائید کی لیکن بقیہ حضرات نے نہیں کی۔ پھر مولانا شبیر احمد صاحب کے متعلق حاجی فصیح الدین صاحب نے موافقت کی لیکن دوسرے خاموش رہے۔ لیکن مولانا حسین احمد صاحب کے متعلق کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مجلس شوریٰ میں مولانا مدنی کا کوئی موید نہ تھا اور ایک وقت وہ آیا جب مجلس شوریٰ میں مولانا مدنی کے سب تھے اور انہیں یہ کہنے کا حق تھا کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

انغرض سرپرست صاحب نے فیصلہ دیا کہ ”کثرت رائے ان تینوں حضرات کے ممبر نہ کیے جانے کی طرف ہے اسی پر فیصلہ کیا جائے۔“ (رپورٹ صفحہ ۳۲ و ۳۵)

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان میں سے تو کسی کو ممبر نہ بنایا گیا لیکن حافظ فصیح الدین کی تحریک پر شیخ رشید احمد صاحب تاجر دہلی کو اور حضرت تھانویؒ کی تحریک پر مولوی حکیم رضی الحسن صاحب کاندھلوی کو ممبر بنا لیا گیا لیکن شاہ صاحب نے دونوں کی مخالفت کی۔

ان امور کے علاوہ جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب کی شجادیز اور دیگر امور پر مجلس شوریٰ کے اجلاس ہوتے رہے اور ۳۰ شوال ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۹۱۶ء بمقام تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ میں آخری اجلاس ہوا اور پھر جلسہ شوریٰ کے بعض اجلاس دیوبند میں تھانہ بھون سے واپسی پر ہوئے۔

دلوں میں گرہیں پر لگیں | مجھے کتنا صرف یہ ہے کہ علامہ عثمانی کی اصلاحات کا کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوا مگر وہ بات

پوری نہ ہوئی جو شاہ صاحب چاہتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب کا مجلس شوریٰ پر پورا اثر تھا۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کی تجویز کہ مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا حسین احمد صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب کو ممبر بنایا جائے مسترد ہو جانے سے دلوں میں گرہیں پر لگیں اور یہ اچھا نہوا جن حضرات کا وجود دارالعلوم کے لئے باعث خیر و برکت ہوتا وائے ناکامی کہ ان کو مجلس شوریٰ میں اراکین مجلس نے لینے سے خموشی اختیار کی۔ آخر خموشی کس وجہ سے غ

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چلوا لعلی است

ناقدری اپنا سے روزگار | یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ چاہتے اور اراکان شوریٰ

کے کان میں ڈال دیتے کہ ان تینوں صاحبان کو مجلس شوریٰ میں لئے جانے کی حضرت سرپرست صاحب کے سامنے پُر زور تائید کریں تو دلوں میں صفائی ہو جاتی اور کدورت کا نام و نشان نہ رہتا۔ بس یہیں سے سمجھ لیجئے کہ میں چھوٹا منہ بڑی بات کہنے لگا ہوں کہ مولانا سہ مہتمم صاحب نے ان تینوں حضرات کی قدر نہیں کی۔ یہ تینوں حضرات تو اس قابل تھے کہ اگر میں مہتمم ہوتا تو تمام مجلس شوریٰ کو سرپرست کے سوا معطل کر کے ان حضرات کو فہرست کی اولیں سطروں میں رکھتا۔ مگر در

کے مقابلے میں صدف کی قیمت زیادہ نکلی۔ بقول انیس یہ دنیا والے سہ
 دُر کو تو گھٹاتے ہیں بڑھاتے ہیں صدف کو
 کھودیتے ہیں شیشے کے لئے دُر نجف کو

شوال ۱۳۴۲ھ سے
 شعبان ۱۳۴۵ھ

ایک سال شوال ۱۳۴۲ھ سے شعبان ۱۳۴۵ھ مطابق
 ۱۹۲۶ء تک کا سال اسی نشیب و فراز میں گذرا۔ شاہ
 صاحب نے اس سال بھی پوری بخاری شریف اور
 ترمذی شریف پڑھائی اور یہی شاہ صاحب کی صدر مدرس کی آخری سال تھا۔ اسی
 سال اس ناچیز نے شاہ صاحب سے بخاری اور ترمذی پڑھیں۔

شعبان ۱۳۴۵ھ

شعبان ۱۳۴۵ھ میں سالانہ امتحانِ بخیر و خوبی ہوا مگر
 سارے سال اختلافِ آراء کی کچھڑی بکتی رہی۔ یہاں تک
 کہ شوال ۱۳۴۵ھ سے نیا سال شروع ہوا جو شعبان ۱۳۴۶ھ پر ختم ہونا تھا بقول
 حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب مہتمم :-

”روداد ۱۳۴۲ھ سے معلوم ہو چکا ہے ۳۱ سال ایک عظیم الشان فتنہ
 دارالعلوم میں رونما ہوا اور ۱۳۴۵ھ میں بھی وہ فتنہ برابر جاری رہا۔“
 (روداد ۱۳۴۵ھ ص ۱)

آگے چل کر مہتمم صاحب لکھتے ہیں :-

”کیسی طرح مناسب نہیں ہے کہ (دارالعلوم کے) خوش کن حالات تو لکھے
 جائیں اور زنجیر واقعات پر پردہ ڈال دیا جائے۔ اس لئے گورنجرہ واقعات
 کا اظہار کتنا ہی خلافِ طبع اور ناگوار ہو مگر ہم روداد کے صفحات کو ان حالات
 سے خالی نہیں چھوڑ سکتے۔“ (رپورٹ دارالعلوم ۱۳۴۵ھ ص ۱)

مولانا حبیب الرحمن صاحب رپورٹ
میں تحریر فرماتے ہیں :-

”شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا

۴ شعبان ۱۳۴۵ھ کو شاہ صاحب کی
مسجد دارالعلوم میں تقریر

کہ : مجھے معلوم ہوا ہے کہ طلبہ کے مطالبات پورے نہیں ہوئے طلبہ کو چاہئے
کہ اپنے مطالبات لکھ کر مجھے دیں۔ میں ان کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب

کے پاس بھیج دوں گا۔“ (رپورٹ ۱۳۴۵ھ ص ۸۶)

اس تقریر میں شاہ صاحب نے فرمایا :-

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ طلبہ، مطالبات
کو لکھ کر دینے اور دستخط کرنے میں ہتم صاف

۵ شعبان ۱۳۴۵ھ کو شاہ صاحب
کی مسجد میں دوسری تقریر

سے خائف ہیں۔ لہذا طلبہ دورۂ حدیث کو چاہئے کہ مطالبات لکھیں اور اس
پر نام کسی کا نہ ہو۔ بلکہ بجائے دستخط کرنے کے طلبہ دورہ لکھ دیں اور مجھے

دے دیں۔“

غرض یہ معاملات بے ساختہ پن میں آگے بڑھ گئے۔ مطالبات کا معاملہ نہ معلوم
کیوں گول رہا، تا آنکہ شعبان ۱۳۴۵ھ میں مجلس شوریٰ اجلاس شروع ہوئے اور
علامہ عثمانی نے وہ مطالبات پیش کئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

شوال ۱۳۴۵ھ سے نیا سال شروع ہوا۔ طلبہ کا داخلہ
حسب دستور جاری رہا تا آنکہ سات سو طلبہ عربی درجے

شوال ۱۳۴۵ھ

میں داخل ہوئے۔

۱۲ رذی الحجہ ۱۳۴۵ھ کو لدھیانہ کارہنہ والا

ایک طالب علم رحمت اللہ صبح کی نماز کے وقت
پنڈت آسارام رئیس دیوبند کے باغ میں

فتنہ باغ آسارام پنڈت

۱۲ رذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

تفریح کے لئے چلا گیا۔ وہاں ایک مندر تھا۔ اس میں ایک مالی اور تین پنڈت تھے۔ پنڈت پوجا پاٹ میں مصروف تھے کہ یہ طالب علم ان کی عبادت کا طریقہ دیکھنے کے لئے مندر کے چوترے پر چڑھ گیا۔ ایک پوجاری نے سختی سے روکا اور سخت مسست کہہ کر سب مارنے لگے اور پھر پنڈت آسارام کے پاس لے گئے۔ انہوں نے طالب علم سمجھ کر چھوڑ دیا اور مولانا حبیب الرحمن صاحب کو اطلاع دی۔ طلبہ کو جب خبر ہوئی تو باغ پیچھے اور پنڈتوں کی مرمت کڑالی۔ معاملہ حکومت تک پہنچا لیکن مولانا حبیب الرحمن صاحب کی حکمت عملی اور پنڈت آسارام کی شرافت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

شوال سے ذوالحجہ ۱۳۴۵ھ جو ماہ و سال ختم ہوا۔ تا آنکہ ۱۳۴۶ھ
 ۱۳۴۶ھ کا سال گزر رہا ہے مگر دلوں میں تاہنوز اضطراب ہے جو بے چین کر رہا ہے تا آنکہ شعبان ۱۳۴۶ھ آگیا۔ جو امتحان کا زمانہ ہے۔ دارالعلوم میں تقریری امتحانات رجب کے آخر میں اور تحریری امتحانات شعبان میں ہوتے ہیں۔ ہنوز طلبہ کے مطالبات کا معاملہ درمیان میں ہے اب کیا ہوا، اسٹرانگ کا آغاز ہوا۔

دارالعلوم دیوبند میں اسٹرانگ

رجب و شعبان ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء

علمائے ربانی کا باہمی اختلاف اپنے اندر بے شمار علمی معلومات اور حکمتوں کے سر بستہ راز کے انکشاف کا باعث ہوتا ہے۔ ہم اس کو ظاہری نظروں سے دیکھتے ہیں تو اس کے اسباب کو نظر آتے ہیں لیکن قدرت کا منشا کچھ اور ہوتا ہے۔
 آپ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی زبانی پہلے پڑھ چکے ہیں کہ علامہ ثنائی

کو اپنے برادر بزرگوار مولانا حبیب الرحمن عثمانی سے مختلف امور میں اختلاف ہو جایا کرتا تھا اور میں (مولانا محمد طیب) ان کو منانے کے لئے مامور ہوتا تھا۔ بس اسی قسم کا اختلاف مدرسے کے امور انتظامیہ سے متعلق حضرت عثمانی کو ان دنوں ہوا۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا بدر عالم صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب سکریٹری، مولانا حافظ الرحمن صاحب سیو ہاروی، مولانا عتیق الرحمن عثمانی، یہ سب حضرات ایک طرف تھے اور مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی جو مدرسے کے مہتمم تھے اور ان کے ساتھی دوسری جانب تھے۔ اختلاف کی خلیج نے وسعت اور شدت اختیار کر لی۔ طلبہ بھی بعض امور میں انتظامیہ سے عین یکجہیں تھے۔ ہم ان تمام واقعات سے پردہ اٹھانا پسند نہیں کرتے جو درمیش تھے نہ یہ محاکمہ پسند کرتے ہیں کہ کون حق پر تھا اور کون نہیں۔ ہاں اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ انتظامیہ کو مختلف قسم کی مشکلات پیش آیا کرتی ہیں اور جس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے ان سے بعض لغزشوں کا ہو جانا بھی بشریت سے خالی نہیں ہوتا۔ لہذا ادب کا مقام یہ ہے کہ ایسے مواقع سے خموشی کے ساتھ گزر جانا ہی مناسب ہے۔ حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ لہذا صراطِ مستقیم جو اعتدال کی راہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ خموش رہا جائے۔ البتہ ایک خاص ہستی جن کا ہاتھ ہمارے خیال میں اسٹرائک کی ڈور ہلانے میں خصوصیت سے حصہ لے رہا تھا وہ مولانا بشیر احمد عرف بھٹہ مرحوم تھے۔ ان کا دارالعلوم میں تو کوئی دخل نہ تھا لیکن انہوں نے دیوبند میں بھٹہ لگایا تھا اور مدرسے کی تعمیرات کے لئے اس زمانے میں وہ اینٹیں سپلائی کرتے تھے اسی لئے ان کو بھٹہ کہنے لگے تھے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بڑے حوصلے کے زندہ دل آدمی تھے۔ کنگر لیس کے سرگرم ممبر جمعۃ العلماء

کے کارکن اور ذہین آدمی تھے۔ وہ اسٹرائیک میں زبردست حصہ لے رہے تھے۔
 خوب یاد ہے کہ مرحوم نے اس زمانے میں طلبہ اور مذکورہ بالا حضرات کا بڑا ساتھ دیا۔
 بہر حال تمام طلبہ نے اسٹرائیک کر دی۔ باہر سے رہبرانِ قوم مصاحبت
 کے لئے آئے۔ مگر معاملہ سلگتا ہی رہا۔ یہ ستمبر ۱۹۲۴ء کا سال تھا۔ اس اسٹرائیک
 میں، میں عجیب کشمکش میں تھا۔ میرا وہی حال تھا کہ
 دل کو ردوں کہ بیٹوں جگر کو
 میری دونوں سے ہے آشنائی

ایک طرف تو میرے اساتذہ میں حضرت شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد
 صاحب اور مفتی عزیز الرحمن صاحب جیسی شخصیتیں تھیں اور دوسری طرف جن اساتذہ
 سے میرے ذاتی تعلقات تھے ان میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری ناظم
 تعلیمات دارالعلوم دیوبند، حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب، مولانا
 محمد ابراہیم صاحب لیاوی، مولانا اعجاز علی صاحب شیخ الادب اور مولانا
 عبد السمیع صاحب تھے جو اسٹرائیک کرنے والوں کے مخالف تھے۔ کچھ طلبہ ایسے
 تھے جو درسگاہوں میں سبق پڑھنے چلے جاتے ہیں یہ کرتا کہ چپکے سے اسباق میں
 جا کر شرکت کر لیتا اور دوسری طرف طلبہ کے جلسوں میں بھی شامل ہو جاتا۔ میں
 اپنی اس دورِ حرجی پالیسی سے سخت پریشان تھا کہ

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنون را
 بلائے فرقت لیلیٰ و محبت لیلیٰ

ایک روز بعد نماز مغرب دیوبند کی جامع مسجد میں ایک زبردست جلسہ
 ہوا۔ تمام طلبہ اس میں موجود تھے۔ مولانا حفیظ الرحمن صاحب سیوہاری نے
 مجھے سالانہ امتحان کے بائیکاٹ کا ریزولوشن پیش کرنے کو کہا، بلکہ انہوں نے

خود لکھ کر دیا تھا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کالو تو بدن میں خون نہ تھا۔ کیلچہ پتھر کی سل رکھ کر ذرا جھپتی سے اٹھا مباداد و نلوں طرف کے اکابر سے محبت کا بھرم کھل جائے۔ بہر حال امتحان سے اسٹرائیک کی مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم کے کہنے پر بادل ناخواستہ میں نے تحریک کر دی ڈالی اور متفقہ طور پر تمام طلبہ نے اس کی تائید کی۔ اور تائید تو طے شدہ معاملہ تھا۔ میرے اس ریزولوشن کی خبر بن میں آگ کی طرح، دارالعلوم میں پھیل گئی۔ اب میں اہل طائفہ مدرسہ میں داخل ہونے کے قابل نہ تھا۔ امتحان کا تو بائیکاٹ ہو گیا ادھر اسہتمام کی جانب سے طلبہ پر مدرسے کے دروازے بند ہو گئے۔ یہ جاڑوں کا موسم تھا، رفتہ رفتہ طلبہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ چند جو رہ گئے تھے وہ مولوی مشفق صاحب کے مکان میں جہاں مولوی عزیز گل کی شادی ہوئی تھی منتقل ہو گئے۔ یہ ایک بڑا مکان تھا اس میں ہی مولانا بشیر احمد بیٹہ، مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولوی عبدالوحید صدیقی غازی پوری مدیر اخبار ”نئی دنیا“ دہلی، مولانا حامد الانصاری غازی، میں، مولوی محبوب الہی منگلوری اور بعض اسٹرائیکر اسی مکان میں رہتے تھے۔ میں اور مولانا محبوب الہی اور مولانا شکر بیہاری مولوی فاضل کی تیاری میں مصروف تھے۔ ہم لوگوں کے اخراجات مولانا بشیر احمد بیٹہ مرحوم ہی اٹھاتے تھے۔ مہاجر اخبار کا اجرا انہی مولانا بشیر احمد اور پارٹی کی طرف سے ہوا۔ مدرسے سے اخبار الانصار نکلتا تھا۔ میں بھی مہاجر کے بعض حصوں کی کتابت کر دیا کرتا تھا اس لئے روٹی کھانے کا استحقاق ہو جاتا۔

اختلاف آراء کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دارالعلوم میں شوال ۱۳۴۶ھ میں طلبہ کا داخلہ شروع ہو گیا اور قدیم و جدید کی رونق افزایاں سے دارالعلوم کی فضا پھر جگمگا اٹھی۔

شوال ۱۳۴۶ھ
مطابق ۱۹۲۸ء

اس سلسلے کی تاریخ جو سوال ۱۳۴۶ء سے شروع ہوتی ہے آپ دارالعلوم کی اس سال کی رپورٹ میں پڑھئے۔ تاہم موافقت کی صورت اور اختلاف کو دور کرنے کے لئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی ایک تحریر ان کے گھر سے ہمیں کراچی سے ملی جو علامہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہمارے پاس موجود ہے جس پر حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے دستخط موجود ہیں تحریر یہ ہے:-

بسم الله الرحمن الرحيم . بعد الحمد لله والصلوة والسلام على نبيه الكريم . چونکہ دارالعلوم دیوبند کے اختلافات و مناقشات نہایت ہی ناخوشگوار صورت اختیار کر چکے ہیں جس میں دارالعلوم کے لئے نقصان عظیم ہے اس لئے ہمارا ہم نے یہ چاہا اور کوشش کی کہ کوئی معقول و معتدل اور طمانیت انگیز صورت اس نزاع اور اختلاف کے ختم کرنے کی نکل آئے چنانچہ اس سلسلے میں کئی مرتبہ جدوجہد ہوئی جو ناکامیاب رہی ۔ اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس اختلاف و نزاع کے تمام کرنے کی بہترین صورت تحکیم ہے ۔ یعنی کوئی ایسا بے لوث شخص جس پر فریقین کو دینا پورا اعتماد ہو اس کو حکم ٹھہرایا جائے ۔ بناء بریں ہم تینوں جن کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں اس باب میں عالیجناب خواجہ ابوالمتین شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی ممبر دارالعلوم دیوبند کو بصدق و دل حکم قبول کرتے ہیں اگر مجلس شوریٰ اور حضرت سرپرست صاحب دارالعلوم بھی اس تحکیم کو قبول فرمالیں تو جو فیصلہ امور متنازع فیہا کا شیخ صاحب ممدوح فرمائیں گے ہم کو اس کے ماننے میں کسی طرح کا انکار نہ ہوگا ۔ اگر شیخ صاحب ممدوح اپنے ہمراہ کسی دوسرے صاحب کو بھی فریقین کے بیانات سننے اور حالات کی تحقیق کرنے میں شریک

فرمائیں تو ہم کو اس میں بھی کوئی عذر نہیں ہے ۔ ۱۹ اشوال ۱۳۴۶ء
عزیز الرحمن عفی عنہ محمد انور عفا اللہ عنہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

ڈا بھیل کو روانگی

شوال ۱۳۳۶ھ کے بعد

تقدیر ربانی کا تدبیر | علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب، حضرت شاہ صاحب،
انسانی پر غلبہ؛ | مولانا سراج احمد صاحب، مولانا بدر عالم صاحب،

مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈھوی، مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاری، مولانا
مفتی عتیق الرحمن صاحب اور اسٹرانک میں حصہ لینے والے اور شرکت کرنوالے
تمام اساتذہ شوال ۱۳۳۶ھ کے بعد ڈا بھیل (سملک) ضلع سورت چلے گئے یہاں
مدرسے کے ناظم شیخ احمد، شاہ صاحب وغیرہم کو مدرسے میں لے آئے اور مولانا
محمد صاحب سورتی جو شاہ صاحب کے چیتے شاگرد تھے اور اسٹرانک میں بڑھ چڑھ کر
حصہ لے رہے تھے ان صاحبان کو ڈا بھیل لے جانے کا باعث ہوئے۔ تقدیر
ربانی، انسانی تدبیر پر غالب آئی اور اس طرح فقہ، حدیث اور تفسیر کے یہ
ائمہ دارالعلوم سے مجدا ہو گئے۔ ہم تو جب جانتے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب
مرحوم ان حضرات کو منالیتے اور کسی قیمت، کسی صورت، کسی انداز، کسی حالت
میں بھی ان کو دارالعلوم سے جانے نہ دیتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

ان حضرات کے عوض مولانا حبیب الرحمن صاحب | حضرت مولانا حسین احمد
نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ | صاحب کی آمد
کو صدر مدرس پر لایٹھایا، وہی ہوتا ہے جو

منظور خدا ہوتا ہے۔

جامعہ اسلامیہ ڈا بھیل سملک ضلع سورت میں ان حضرات | حاصل
کی وجہ سے جان پڑ گئی اور اس کی شہرت دور دور ہو گئی۔

بہت سے اسٹراکٹر طلبہ بھی وہاں جا داخل ہوئے اور جس جس کے جہاں سینگ
سمائے وہ وہاں چلا گیا۔

بہر حال ڈاھیل کا نصیب کھل گیا اور ان حضرات کی وجہ سے اس خطر ارضی
میں تعلیم دین کے چشمے ابلنے لگے۔ بس یہی حکمت ان حضرات کے یہاں اختلاف
کی نظر آئی۔ عَسَىٰ اَنْ تَكُنْ هُوَ الشَّيْءُ وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ اَنْ تُجِبُوْا
شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

میں دارالعلوم میں شاہ صاحب سے دورہ پہلے پڑھ چکا تھا یہ سال فنون کا تھا
بہر حال فارغ ہو چکا تھا مگر یہیں سندیں دینے سے انکار کر دیا گیا۔ بعد میں جب
۱۲۵۳ھ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم دارالعلوم میں صدر کی حیثیت سے
تشریف لائے اس وقت ہم لوگوں کے لئے راہ کھلی اور حضرت عثمانی نے سندیں دلائی
مولانا حبیب الرحمن صاحب کا سنہ ۱۹۳۷ء میں اسٹراکٹ سے دو سال بعد انتقال ہو گیا
اور حافظ محمد احمد صاحب انہی دنوں میں انتقال فرما چکے تھے۔ بہر حال میں تو
مولوی فاضل پاس کر کے ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہو گیا اور وہاں سے او۔ ٹی
کا سرٹیفکیٹ لیکر مشن ہائی سکول جالندھر اور پھر زندہ صیر کالج کپورتھلے میں پروفیسر
بن کر چلا گیا۔ اس اشار میں مولوی فاضل سے پہلے دیوبند کی سند منہونے سے تلاش
معاش میں دھکے کھائے۔

کرنال میں ایک تبلیغی ادارہ غلام بھیک نیرنگ سر رحیم بخش کے زیر انتظام کھولا گیا
اس کا اشتہار شائع ہوا۔ ابتدا میں ساٹھ روپیہ تنخواہ رکھی گئی تھی۔ انٹرویو کے لئے
اسید واروں کو بلا یا گیا۔ میں نے بھی انٹرویو دیا۔ تقریر کی لیکن قسمت برگشتہ تھی،
سند پاس نہ تھی اس لئے مجھے نہیں لیا گیا۔

حضرت شاہ صاحب، مفتی صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے

اس دوران میں دیوبند کی فضیلت کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ یہ حضرات ہم لوگوں سے
 بڑی ہمدردی فرماتے تھے کئی دفعہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری
 کا اتفاق ہوا بڑی محبت فرماتے اور حال پوچھتے۔ ایک دفعہ شام کو حضرت کی
 خدمت میں آپ کے دولت خانے پر پہنچا۔ راستے میں حکیم صفت احمد کے گھر کے سامنے
 سے گزرا تو ایک کتیا نے میرے پاؤں میں زور سے کاٹ لیا میں اسی حالت میں پہنچا
 تو مولوی محفوظ علی سے فرمایا کہ ان کے زخم کو دبا دبا کر خالص سر کے سے دھوؤ
 اور مرہیں پیس کر اس کی ٹھیکہ باندھ دو۔ الحمد للہ سب تکلیف رفع ہو گئی۔
 لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور مجھے مولوی فاضل میں اس نے پاس کر دیا
 ملازمت دے دی۔ ملازمت کے بعد کوئی معاشی تکلیف آج تک نہیں پہنچی اور
 اب بھجد اللہ اسلامیہ کالج لائپور میں پروفیسر کی حیثیت سے تصنیف کتاب ۱۹۵۹ء
 میں تقریباً پانسو روپیہ اور پھر ۱۹۶۵ء میں ساڑھے چھ سو روپیہ جبکہ کتاب پر
 نظر ثانی کر رہا ہوں ماہوار مل جاتے ہیں اور خدائے کریم کا شکر ادا کرتا ہوں مگر
 سچ تو یہ ہے کہ سب دارالعلوم دیوبند کی جوتیوں کا صدقہ کہ دیاں جو پڑھا اس
 نے میرے لئے علم کی راہیں کھول دیں۔ اور اب نظر ثانی کے وقت ۱۹۶۲ء میں
 ریٹائرمنٹ سے دو چار ہوں۔

میں کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ عہد ماضی کی یاد نے آنکھوں کے سامنے
 دھندلے نقوش ابھار کر چمکا دئے۔ رفتہ رفتہ سب معاملات ٹھیک ہو گئے۔
 ہاں تو علامہ شبیر احمد صاحب، حضرت شاہ صاحب اور مفتی عزیز الرحمن
 صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ، ڈا ہمیل چلے گئے اور اختلافات کی بدلیاں یوں جہلی
 کے دھندلکوں میں چھنٹ گئیں۔

ابھی علامہ عثمانی ڈاٹ اجمیل تشریف نہیں لے گئے | علامہ عثمانی ڈاٹ اجمیل پہلے حیدر آباد دکن میں تھے کہ شعبان ۱۳۲۵ھ یعنی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ خیال یہ تھا کہ ”فتح الملہم شرم مسلم“ جو علامہ عرصے سے لکھ رہے تھے اور اس کی دو جلدوں کا مواد تیار بھی تھا اس کی طباعت کی کوئی صورت نظام دکن کی چشم التفات سے ہو جائے۔ کیونکہ اسلامیان ہند کے لئے اُس دور میں نواب عثمان علی خاں صاحب والی دکن جیسا علماء و فضلاء اور اہل فن کا کوئی قدر داں نہ تھا۔

حیدر آباد میں مولانا کے شاگردوں اور متعارفین کی کوئی کمی نہ تھی ان میں سے حکیم مقصود علی خاں صاحب جو مدرسہ عالیہ دیوبند کے رکن مجلس منتظم تھے وہیں موجود تھے ان کے علاوہ آپ کے شاگردوں میں مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا محمد علی حیدر آبادی ذی اثر صاحبان تھے۔ اور خود علامہ کی شخصیت معمولی شخصیت نہ تھی وہ تو ایسی شمع تھے جس کے روشن ہونے پر ہر طرف سرور آنے لگا ہوتا تھا۔ حیدر آباد میں آپ کی تقریروں کا آغاز ہونا تھا کہ تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ نواب صاحب کے کانوں میں بھی یہ غلغلہ پڑا انہوں نے مکی مسجد میں جس میں نظام صاحب جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے تقریر کی خواہش کا اظہار کیا چنانچہ حضرت عثمانی نے اس روز جمعہ مکی مسجد میں پڑھا۔ اتفاق سے ان دنوں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم بھی حیدر آباد میں تھے، ان کی بھی مکی مسجد میں تقریر ہوئی تھی بلکہ پوری تھی کہ نظام صاحب پہنچ گئے کچھ دیر ان کی تقریر سن کر فرمایا کہ یہی ہیں وہ دیوبندی صاحب جن کی تقریر کی دھوم تھی۔ مصاحبین نے کہا نہیں حضور وہ دوسرے صاحب ہیں جو تشریف رکھتے ہیں۔ مولانا عثمانی کا یہ خود بیان ہے جو میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ نظام صاحب نے انہیں بیٹھ

جانے اور علامہ کو تقریر کرنے کی خواہش کی۔ چنانچہ موصوف نے اپنی سحرالبیانی سے نہ صرف تمام عہدین کو مت بلکہ نظام صاحب کو گرویدہ بنالیا۔ اتنا سے تقریر میں حضرت عثمانی نے صحابہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا :

”اگر نواب عثمان علی خان صاحب کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پیرہن کا ٹکڑا بھی مل جائے تو اس کو اپنے تاج میں ٹاٹیکنا باعث فخر تصور فرمائیں گے“

اس جملے پر نواب صاحب جو سامنے بیٹھے تھے اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور فرما گئے ”بیشک مولانا“

مولانا عثمانی نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کہ نظام پر تفضیلت کا رنگ آتا جا رہا تھا۔ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تمام صحابہ پر فضیلت کے قائل تھے لیکن دوسرے صحابہ کا ادب ملحوظ رکھتے تھے۔

الغرض نظام صاحب پر آپ کی تقریر کا بہت اثر ہوا۔ مولانا عثمانی نے ایک مجلس میں اپنی نشستگاہ پر فرمایا جس میں یہ راقم الحروف بھی موجود تھا کہ مجھ سے نظام صاحب کے مصاحبین نے فرمایا کہ آپ اس طرح تقریر فرمائیں اور اس طرح اور اس بات کا خیال رکھئے اور اس بات کا۔ میری تقریر ہو رہی تھی اور نظام صاحب جھوم رہے تھے۔ نظام صاحب کی خوشی کا یہ ایک واضح ثبوت تھا کہ اگر وہ اپنے خاصے میں سے کسی کو دعوت کے طور پر کچھ بھیجتے تو گویا اس سے بہت زیادہ مسرور ہونے کی نشانی بھی مانتی تھی، علامہ کو نظام صاحب نے کئی دفعہ کھانا یعنی خاصہ بھیجا۔

الغرض شہر میں آپ کی متحدہ تقریریں ہوئیں اور تمام حیدر آباد آپ کا لوہا مان گیا۔ نظام صاحب نے علامہ کو محکمہ رفقوی کے لئے کو تو ال شہر کے ذریعہ ایک ہزار روپیہ ماہوار پر اپنی خدمات سپرد کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی لیکن آپ نے

ملازمت سے انکار فرما دیا۔ تاہم نظام صاحب نے تاحیات پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔

علامہ عثمانی کی نظام ادکن سے ایک خاص علمی ملاقات

اس سفر کے بعد علامہ ہر سال حیدرآباد تشریف لے جاتے کیونکہ نظام صاحب نے آپ سے فرمایا تھا کہ اگر آپ جامعہ عثمانیہ سے مستقل تعلق پر راضی نہیں تو کم از کم یہاں سال میں کچھ دنوں کے لئے ضرور تشریف لا کر اہل حیدرآباد کو شرف بخشا کریں۔ دوسرے اسفار میں علامہ کو نظام صاحب نے ملاقات کے لئے کئی مرتبہ اپنے محل میں یاد فرمایا اور مختلف علمی باتیں دریافت کیں جن کے جوابات سے نظام صاحب بہت متاثر ہوئے۔ ایک دفعہ نظام صاحب نے ملاقات کیلئے یاد فرمایا آپ تشریف لے گئے۔ نظام صاحب نے فرمایا کہ سر حیدری (وزیر اعظم حیدرآباد) کو میں نے وقت دیا ہے اور وہ ہمارے متعلق لندن جا رہے ہیں تھوڑا سا وقت ہے جو آپ کی ملاقات کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ لیکن پھر نظام صاحب علامہ عثمانی سے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ علامہ کی تحقیقات اور علمی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ نظام صاحب سر اکبر حیدری سے ملاقات دلاقات کو بھول گئے۔

حیدرآباد کا دوسرا سفر
۱۳۴۶ھ، ۱۹۲۸ء

علامہ پھر ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور آپ نے محکمہ امور مذہبی کے اعلیٰ حکام کے مشورے سے فتح الملہم شرح مسلم کی طباعت کے اخراجات کے متعلق نظام صاحب کو درخواست پیش کی۔ چنانچہ درخواست اپنے مراحل سے گذرتی ہوئی نظام دکن نواب میر عثمان علی خاں صاحب نکتہ سنجی اور آپ نے اس سلسلے میں علامہ عثمانی کو ملاقات کے لئے بلایا۔ مسودہ پیش کیا جس کو دیکھ کر نظام صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور پانچ جلدوں

کے لئے یکمشت پچیس ہزار روپیہ بحساب پانچ ہزار فی جلد منظور فرمایا۔ اور دو سال کے لئے فتح الملہم کی تیاری اور تصنیف کے دوران چار سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر فرمایا۔ مگر تین جلدیں چھپ کر تیار ہوئی تھیں کہ کچھ تو علامہ بیمار رہے اور کچھ پاکستان سے متعلق سیاسیات ملکی نے فرصت نہ لینے دی۔ پھر پاکستان بنا تو آپ یہاں تشریف لے آئے اور یہاں بھی ملکی امور سے متعلق کام کا اتنا ہجوم ہوا کہ فرصت نہ مل سکی۔

مئی ۱۹۴۸ء میں جب میں کراچی گیا اور علامہ سے ملا

علامہ عثمانی سے کراچی میں میری ملاقات

تو میں نے فتح الملہم کی تکمیل کے لئے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ ذرا کچھ سستالوں اور امور ملی سے فرصت پالوں تو اس طرف توجہ دوں گا مگر افسوس کہ آپ بیمار ہو گئے اور بیماری کی اس طوالت نے دسمبر ۱۹۴۹ء تک پیچ کر دم لیا اور آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بہر حال آپ کو ان وجوہات کے باعث نظام اور حیدر آباد اور دہلی کے لوگوں سے محبت اور دلچسپی ہو گئی اس لئے تقریباً ہر سال ہی حیدر آباد تشریف لے جاتے رہے۔

حیدر آباد میں اسی دوران میں جب علامہ دہلی تشریف

اصلاح فتنہ شیعہ دسنی صاحبان

لے جایا کرتے تھے اوپر کے لوگوں میں سنی اور شیعہ کا اختلاف کا فتنہ برپا ہونے والا تھا مولانا عثمانی

نے اس کو فرو کرنے میں بڑی مدد کی اور اپنے حسن تدبیر اور علمی بصیرت نیز خداداد تقریری قابلیت اور بڑے طبقے کے لوگوں میں رسوخ سے باہمی نزاع اور اختلاف کو ایسی خوبی سے دور کیا کہ اچھے اچھے مدبر اور حکام بھی ایسی صورت حالات سے مشکل ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ

لے ناظرین کی اطلاع رکھئے عرض ہے کہ اس کی تکمیل کی ذمہ داری حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنے سر لی ہے اور اس پر کام کرنا شروع کر دیا ہے بلکہ معتد بہ کام کر بھی چکے ہیں ناظرین سے اس کی تکمیل کی درخواست ہو ۱۱ شافعی احمد قاسمی

والہمد للہ اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چچا بیکریٹری
کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچا کہ آپ کو فروری تک قیام کی اجازت ہے۔

(مکالمۃ الصدرین ص ۴۷)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ آپ کا حیدر آباد میں تقرر ہو گیا تھا یہ دسمبر ۱۹۲۵ء
بات ہے اور فروری ۱۹۲۶ء کے بعد آپ کو حیدر آباد جانا تھا لیکن سیاسیات ملکی
کے باعث فرصت نہ ملی اور پاکستان بننے تک مصروف رہے اور پھر پاکستان تشریف
لے آئے، واپس نہ جاسکے۔

دارالعلوم دیوبند | اس میں شک نہیں کہ دنیا نے اسلام پر نظام دکن کی سخاوت
بے حد تھی۔ ہندو میروں ہندو کے اسلامی اور قومی اداروں
نظام دکن کی امداد | اور مدرسوں پر ان کا روپیہ پانی کی طرح بہتا تھا۔

علماء، صلحاء پر ان کا دست کرم پھیلا ہوا تھا۔ انہی اداروں میں دارالعلوم
دیوبند اور اس کے متعلقین بھی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کو میر عثمان علی خاں کے
والد نے اڑھائی سو روپیہ ماہوار کا حکم دیا تھا۔ بعد ازاں میر عثمان علی خاں حب
جانشین ہوئے تو انہوں نے ڈھائی سو روپیہ کا اور اضافہ فرمایا۔ لیکن رمضان
۱۳۲۲ھ اگست ۱۹۱۶ء میں جب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد احمد
صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے اور آپ نے مزید امداد کی تحریک کی تو نظام
صاحب نے گرانٹ میں تین سو روپیہ کا اور اضافہ فرما دیا۔ اس خبر کو حلقہ دارالعلوم
میں نہایت مسرت سے سنا گیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں :-

”شمس العلماء جناب مہتمم صاحب قبلہ حیدر آباد تشریف لے گئے۔“

اور دارالعلوم کی طرف حضور کی توجہ منعطف کی۔ اعلیٰ حضرت نے دارالعلوم
دیوبند کے نام کو سننے ہی اسی وقت تین سو روپیہ ماہوار مستقل وظیفے کی

اپنے رنگ میں تقریر اور مدرسے کے اساسی فلسفے پر اظہار خیال ان کی خصوصی شخصیت کا آپ جوہر ہے جو سب سے ممتاز ہے۔ مولانا گیلانی کے ان الفاظ ”ترجمان القاسم“ حضرت الاستاذ جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سے حضرت مولانا محمد قاسم کی بھائی کا شرف علامہ عثمانی کے لئے طے شدہ حقیقت کا اظہار کرتا ہے جو ان کے لئے مایہ ناز ہے اس لئے جو لوگ مولانا عثمانی کو جانشین شیخ الہند کہنے سے اک گونہ انکار کرتے ہیں ان سے اختلاف نہ کیا جائے بلکہ علامہ شبیر احمد صاحب کو جانشین و ترجمان قاسم کہا کیجئے۔

بھارت کا حیدر آباد پر حملہ اور مولانا عثمانی کا اضطراب

الحاصل مولانا عثمانی ہمیشہ میر عثمان کے شکوگذا رہے اور جب ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بھارت کی حکومت نے ریاست حیدر آباد پر حملہ کیا تو مولانا عثمانی تڑپ اٹھے آپ نے بھارت سرکار کے خلاف مذمت اور حکومت پاکستان کو نظام کی مدد کے لئے آمادہ کرنے پر کراچی میں زبردست تحریک کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پاکستان بھی میر عثمان علی خان کا بے حد ممنون ہے کہ انہوں نے پاکستان بننے پر اس کی اقتصادی بد حالی پر ازہ اسلامی ہمدردی اپنے رویہ سے غیر معمولی مدد کی اور یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

ڈابھیل میں

ہم ابھی گزشتہ صفحات میں علامہ اور ان کے رفقاء کے ڈابھیل کی طرف رخت سفر باندھنے اور دارالعلوم دیوبند سے جدا ہونے کا ذکر کر چکے ہیں۔ قدرت کو یہاں علوم و فنون کے چشمے بہانے تھے اس لئے وہاں ان حضرات نے اس سرزمین پر علم و فضل کی بارشیں برسانا شروع کیں۔

ڈابھیل میں قیام

جامعہ ڈابھیل | ان حضرات کی تشریف آوری سے پہلے ڈابھیل (سہلک، گجرات) میں یہ ایک مدرسہ تھا جس کو مولوی بام صاحب نے جاری کیا تھا اور جس کا نام مدرسہ تعلیم الدین تھا۔ ان حضرات کے پہنچنے کے بعد اس کا نام جامعہ اسلامیہ ہو گیا۔ ان صاحبان کو یہاں لانے کا سہرا مولانا محمد ولید محمد موسیٰ صاحب فاضل دیوبند کے سر پر جو میرے بھی دیوبند میں کلاس فیلو تھے۔

حضرت الاستاذ امام انور شاہ صاحب شیخ الحدیث اول اور علامہ عثمانی شیخ الحدیث دوم مقرر ہوئے، حضرت شاہ صاحب، بخاری اور ترمذی پڑھایا کرتے تھے اور علامہ، مسلم اور بیضاوی، حدیث اور تفسیر کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب اور علامہ جب ڈابھیل پہنچے تو پہلے حاجی محمد صاحب سُورتی کے مکان پر قیام کیا۔ بعد ازاں مدرسے کے ایک بڑے کمرے میں اقامت اختیار فرمائی۔ یہ بڑا کمرہ اور دوسرے مفتی سیٹھ سُورت والے نے اساتذہ کے لئے بنوائے تھے۔

مولانا عثمانی کی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی صرف گزارے کے طور پر سو روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ بعد ازاں سو کی بجائے دو سو ملتے رہے۔

حضرت شاہ صاحب کا انتقال ۱۳۵۲ھ | حضرت شاہ صاحب کی وفات ۱۳۵۲ھ کے بعد علامہ، بخاری اور ترمذی پڑھانے پر شیخ الحدیث

مقرر کئے گئے۔ اب شاہ صاحب کی جگہ کام کرنے پر آپ کو بطور مصارف تین سو پچاس روپیہ ملتے تھے۔

سلسلہ تقاریر | ڈابھیل کے دوران قیام میں علامہ عثمانی کی اس علاقے میں اکثر جگہ تقریریں ہوئیں۔ تبلیغی سفر ہوئے۔ بمبئی کئی دفعہ

تشریف لے گئے جہاں آپ کے زبردست وعظ ہوئے۔ بمبئی کے علاوہ راندر، نوساری تحصیل، موضع لاجپور، موضع کفلیتہ، سورت، رنگن، موضع گھلوڑ وغیرہ کے لوگوں کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفید فرمایا۔ ایک دفعہ مولانا شوکت علی حرم آپ کے پاس ڈابھیل تشریف لائے۔ وہ اس زمانے میں مسلم لیگ میں کام کر رہے تھے مولانا عثمانی نے انہیں چندہ کر کے ایک ہزار کی تعمیلی پیش کی۔ غرض یہ ہے کہ اس گرد و نواح میں بھی مولانا نے دس بارہ سال دین کی خدمت انجام دی۔

تفسیر قرآن شرح مسلم | اور سب سے بڑی حکمت ڈابھیل پہنچنے میں یہ نکلی کہ یہاں قرآن کریم کی تفسیر لکھنے اور مسلم کی شرح تحریر

فرمانے کا موقع مل گیا۔ اگر آپ تفسیر اور شرح نہ تحریر فرماتے تو وہ خصوصیات جو قدرت نے آپ کو عطا کی تھیں فنا ہو کر رہ جاتیں اور دنیا فائدہ حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی یہیں کہ قیام میں آپ نے خوارق عادات مقالہ لکھا جو اپنی نوعیت کا بے نظیر رسالہ ہے۔

علامہ عثمانی کی یاد دیوبند میں

دارالعلوم دیوبند میں حضرت انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ مولانا حبیب الرحمن عثمانی مرحوم نے اسٹرٹنگ کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو

پھر دارالعلوم دیوبند میں
بحیثیت مہتمم

شیخ الحدیث مقرر کیا تھا۔ مہتمم صاحب بڑے ماہر سیاست تھے انہوں نے اپنے تدبیر کے ماتحت ایسا کرنے کو اپنی فتح سمجھی۔ اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی کے چلے جانے کے بعد حضرت مولانا مدنی سے بہتر اور کوئی شخصیت اس منصب کے لئے فٹ نہ تھی۔ لیکن دارالعلوم کے منتظم اور ارکان انتظامیہ دارالعلوم میں کسی صاحب اثر شخصیت کے تقرر کو بحیثیت ہائی کمان محسوس کرنے لگے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب اپنی جگہ دارالعلوم کے لئے بغایت مفید مہتمم ثابت ہوئے اور ان کے دور میں دارالعلوم کو بہت ترقی ہوئی۔ میں علی وجہ البصیرت یہ لکھتے ہوئے قلم میں پوری قوت محسوس کر رہا ہوں کہ ان کا عہد استہام دارالعلوم میں بڑا سنہری دور ہے۔ لیکن پھر بھی بعض اراکین انجمن نے محسوس کیا کہ دارالعلوم جیسے مذہبی مشہور ادارے میں علامہ شبیر احمد کے ہوتے ہوئے جس کی دارالعلوم سے متعلق بے شمار خدمات ہیں اس مادر علمی سے جدا رہنا ایک زبردست خلا رکھتا ہے۔

مجھ سے خواجہ فیروز الدین کپور تھلوی ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے بیان کیا کہ مولانا عثمانی کو ہم چند اراکین مجلس منتظمین میں حکیم مقصود علی خاں صاحب حیدر آبادی اور مولانا مناظر حسن گیلانی بھی تھے دارالعلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے لانا چاہتے تھے چنانچہ ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا عثمانی تمھارے بھون تشریف لے گئے ہیں ہم مجلس منتظمہ کے جلسے میں دیوبند گئے ہوئے تھے۔ حکیم مقصود علی اور میں نے سوچا کہ حضرت عثمانی کو وہیں تمھارے بھون میں راضی کر لیں اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب جو کہ مدرسے کے سرپرست ہیں اور سیاسیات ملکی کے باعث ان کے اور مولانا عثمانی کے درمیان اختلاف رہا ہے اس کو دور کرادیں۔ چنانچہ مولانا عثمانی ہیں سہارنپور کے اسٹیشن پر مل گئے ہم نے اس بات کا ان سے تذکرہ کیا اور ان کو

خواجہ فیروز الدین
کپور تھلوی کا بیان

ان کے سخت انکار کے باوجود مجبور کر کے منالیا اور حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لے جانے پر بھی راضی کر لیا۔ جب ہم تھانہ بھون پہنچے تو ہم نے حضرت تھانویؒ کو بھی رضامند کر لیا اور وہ مولانا عثمانی کی صدارت اہتمام پر راضی ہو گئے۔ یہ سب کچھ جب ہو لیا تو ہم دیوبند لوٹے اور ہم نے مدرسے کی مجلس شوریٰ میں اس مسئلے کو پیش کر دیا۔ اس بات سے مدرسین اور اراکین میں ایک خاص قسم کی موافق اور مخالف حرکت پیدا ہو گئی، باہم سرگوشتیاں اور کنولیسنگ کا رد عمل جاری ہو گیا۔ اور ایسا ہونا فطری تقاضے کے موافق تھا۔ عرصہ ہوا علامہ دارالعلوم کے دائرۂ اہتمام سے ناراض ہو کر اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اُس وقت معاصرین مدرسین میں دو جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایسے بھی تھے کہ جن کے روابط دارالعلوم کو چھوڑ کر جانے والوں سے ایسے نہ رہے تھے اور ان میں کے کئی حضرات موجود تھے اور ایسے بھی تھے جو علامہ عثمانی کو دل و جان سے خوش آمدید کہنے کو تیار تھے۔ مجھے اس معاملے میں علم الیقین کا مقام حاصل ہے کہ حضرت میاں اصغر حسین صاحب محدث دارالعلوم اور اکابر میں جو بڑی روحانی شخصیت کے مالک تھے علامہ عثمانی کی دارالعلوم میں آمد کو ضروری خیال کرتے تھے۔ میاں صاحب اگرچہ اسٹرائک والوں کے مخالف تھے لیکن اب ان کے حالات بدل چکے تھے اور مولانا عثمانی کے موافق تھے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب پر جب حلقہ دارالعلوم میں علامہ عثمانی کی صدارت اہتمام کی تجویز کا انکشاف ہوا تو ان کے بیان کے مطابق جو میرے کانوں نے سنا مدت

حضرت مولانا محمد طیب
صاحب کا بیان

خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسے پر ایک صبح کی چائے نوشی کی مجلس میں ذکر کیا گیا حضرت میاں صاحب کو مولانا عثمانی کے دیوبند میں آنے کے بارے میں کوئی کشف ہوا ہے تو ان کے برادر خور مولانا محمد طاہر مرحوم نے کہا کہ ہاں کشف ہی ہوا

ہے جس کے باعث میاں صاحب مولانا عثمانی کی آمد کو مفید سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مولانا محمد طاہر صاحب مرحوم بھی حضرت علامہ کی آمد کو بدل و جان چاہتے تھے اور اس بارے میں کوشاں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا محمد طاہر مرحوم کو کوشاں تھے مگر اس کوشش میں حاجی رشید صاحب میرٹھی حکیم مقصود علی حیدر آبادی خواجہ فیروز الدین کپورتھلوی، مولانا مناظر حسن گیلانی ممبران مجلس شوریٰ اور بعض مدرّسین مدرّجن میں حضرت میاں صاحب بھی شامل ہیں یہ پوری جماعت ان کو مدرسے میں لانے کی خواہشمند تھی۔

سرگوشیاں | بہر حال موافقین اور مخالفین میں نیچے سے اوپر تک اور مدرّسین سے لیکر مجلس شوریٰ تک ایک موافقانہ اور مخالفانہ رنگ آتا تھا اور جاتا تھا۔ لیجئے اس سلسلے میں ہم آپ کے سامنے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے دو خطوط پیش کرتے ہیں جن سے اس وقت کے ماحول اور اضطراری کیفیت مجلسوں کے جھنے اور منتشر ہو جانے کا پورا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے گا اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ علمائے ربانی جب آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو کس طرح وہ قرآن و سنت اور اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھاتے ہیں۔ دراصل ہمارے نزدیک اختلاف تو کوئی بُری چیز نہیں البتہ اختلاف میں حد سے آگے نکل جانا اچھی بات نہیں اور نہ ہی اس سے معاشرے کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔

مکتوب گرامی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح

وَالْكَافِرِينَ الْغَيْظُ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ

اور وہ لوگ جو غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کردینے والے ہیں

سیدنا المحترم زادت معالیکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرصہ دراز سے ارادہ کر رہا ہوں کہ عریضہ ادب ارسال خدمت کروں مگر عزمِ الغرضی نے آج تک اس شرف کے حامل کرنے میں تعویق کی۔

مجھے افسوس اور صدمہ ہے کہ جو اس بحث مجلس شوریٰ میں پیش آئیں ان کا انجرا یہاں تک ہو کہ ناقلین کے الفاظ باعث تکدر ہوئے۔

محترم! اس بحث اور ان کے نقل کے اندر ضرور افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے مگر اتنی بات یقینی ہے کہ میں جناب کے لئے وظیفہ اہتمام خواہ بصورت صدارت ہو یا بغیر صدارت مناسب نہیں جانتا ہوں (ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو) میں نے اس مجلس میں آنجناب کے علمی کمالات تحریر و تقریر میں فائق و ماہر ذکاوت و حافظہ میں بے نظیر ہونے کا خود اقرار کیا تھا اور اب بھی اقرار کرتا ہوں اور اسی بنا پر میں یہ خیال کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں کہ جناب کے لئے صدارت تدریس مناسب اور شایان ہے۔ اس کو لوگ پالیسی یا ڈپلومیسی پر حمل کرتے ہیں۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں اپنی استعداد اور قابلیت علمی اور تقریری و تحریری آپ کے شاگردوں کے پایہ کی بھی نہیں پاتا۔

میرا بختہ اور صحیح خیال ہے کہ جناب کے شایان شان صدارت تدریس ہے اگر آپ کے لئے وہ جگہ تجویز ہو تو میں اپنا علیحدہ بھی ہونا خوشی و تحریمی منظور کروں گا اور ماتحت رہ کر خدمات مدرسہ بھی بخوشی منظور کروں گا۔ ہر دو میں

نہ مجھ کو عار ہوگا اور نہ مخالفت۔ میری کبھی بھی سعی اس کے نہ خلاف ہوئی اور نہ ہوگی (انشاء اللہ) مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ میرا خیال ہے کہ آپ میں بعض کمزوریاں بھی ہیں جن میں سے عدم استقلال، اور کان کا کچا ہونا، اور انتظام سے طبعی تناسب نہ ہونا ہے۔ میرے نزدیک واقعات اس کے لئے موجود ہیں مثلاً آپ کو یہ خبر دی گئی کہ سیاہ جھنڈیوں سے آپ کا استقبال کیا جائے گا آپ نے اس کی تصدیق کر لی اور سخت متاثر ہوئے۔ واللہ باللہ اس امر کا ادنیٰ سا بھی خیال نہ آیا تھا۔ تذکرہ یا ارادہ تو درکنار اسی طرح عدم استقلال کی حالت ہے یہ امور اس عہدہ کے لئے مضر ہیں۔ ایک صدر اہتمام کے کان میں ہر صاحب غرض اپنی اغراض کو تذکرہ کر کے اس طرح ظاہر کرے گا کہ اس پر ظاہری طریقہ پر کوئی شبہ دروغ گوئی کا نہ کیا جاسکے گا۔ ایسی صورت میں اذن ہوگا سخت مضر ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ میرا خیال (ممکن ہے کہ غلط ہو) یہ ضرور ہے کہ یہ کمزوریاں آپ میں ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ سینکڑوں کمالات بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے عطا فرمائے ہیں جن کے سُرِ اوقات تک بھی ہم نالائقوں کی رسائی نہیں۔ جیکہ ممبران مشورہ نے کنج کا دیا تو اس کا تذکرہ ضرور آیا مگر کوئی ایسی چیز جو کہ آپ کے اخلاق کریمانہ یا آپ کی شرافت شخصی میں اثر رساں ہو تذکرہ نہیں کی گئی۔

میں نہیں جانتا کہ آپ تک آیا ہی خبریں پہنچائی گئی ہیں یا کم و بیش۔ بہر حال میں نے جو کچھ کہا یا کیا وہ صفائی سے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے اور میں اس اپنے عقیدہ اور خیال پر ابھی تک قائم ہوں۔ آپ کے لئے عہدہ موزوں نہیں سمجھتا واللہ عند اللہ۔ پس اگر آنجناب کو صدمہ اور رنج مجھ سے ان اقوال کی بنا پر پہنچا ہے اور اخبار دلالت کرتی ہیں کہ ضرور پہنچا

ہے تو غرض معافی کا طالب ہوں۔ خیال اب بھی اس وجہ سے وہی ہے کہ ہر شخص کے مناسب حال کوئی کام ہوتا ہے۔ جس طرح آپ کے مناسب طباعت، ڈاکٹری، انجینئری نہیں ہیں اسی طرح یہ عہدہ بھی آپ کے لائق نہیں ہے اس پر نہ آپ کو توہین کا خیال ہونا چاہئے اور نہ صدمہ کرنا چاہئے۔ میری اصل غرض اس عریضہ سے یہ ہے کہ جناب کے صدمہ کا ازالہ ہو جائے اور اگر میں خطا وار ہوں تو اس کی معافی ہو جائے۔ میں صدارت تدریس کے لئے آپ کی ذات کو بدل و جان قبول اور منظور کرنے والا ہوں۔ ایک مجھ جیسے پر دیسی غریب الوطن کی حالت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ بنا بریں اُمیدوار ہوں کہ دل سے رنج اور صدمہ کو میری طرف سے حسب ارشاد خداوندی نکال دیں۔ حقیقت وہ ہے جو عرض کی گئی۔ اور چونکہ خواہشہی کی نعمت بفضلہ تعالیٰ حاصل ہے اس لئے ہمارا آپس کا جنگ و جدال اور تخالف وغیرہ بھی عداوت اور دشمنی پر محمول نہ ہونا چاہئے۔ ایک وقت میں لڑیں گے اور دوسرے وقت میں ملیں گے۔ عداوت قائم اور عداوتِ قلبیہ نہ ہوگی۔ واللہ یصلح الاحوال ویرزقنا اتباع اسلافنا الکرام ثم لا یخفی لکم انی منعم فی بحال الخطایا والذنوب و تقصیر حقوق من لہ الحقوق علی و مقیسات انواع التقصیر و لکم الفضل والمنة والسلام

۲۱ رجب ۱۲۵۲ھ

والسلام

نگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

زبانِ علم سن کر ہو کہ اس کو اصرار
کیا ہے؟ رہی اس لئے دار فنا

خط حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

بجواب حضرت مولانا حسین احمد صاحب عثمانی

از منہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

نخدمتہ گرامی کر مفاد محترم مکرم و معظّم دَامِ مَحْجَمِ

بعد سلام مسنون نیاز مشحون آنکہ۔ الطاف نامہ غیر متوقع طور پر پہنچا۔

جس محبت و اخلاص اور حسن نیت کے جذبہ سے وہ لکھا گیا ہے اُسی روشنی

میں بندہ نے پڑھا۔ سچ یہ ہے کہ یہ مکتوب میرے نزدیک جناب محترم کی سیادت

و شرافت اور جانشینی اور سادہ مرحوم کا مرقع ہے۔ آپ کے بزرگانہ اخلاق سے

ہم نیاز مند ہی توقع رکھتے ہیں۔ فحجۃ اکرم اللہ تعالیٰ احسن الخیراء ووفقنا

وایاکم لما یحب ویرضی۔

اس کے بعض چند حقائق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ ان یقین کریں

فبہا و نعمت۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ زمانہ کسی سچی بات پر جو بلا آمیزش

تکلف و تفسیح کہی جائے یقین کرنے کا نہیں ہے تاہم آپ کی ذات سے

امید رکھتا ہوں کہ مجھے اس بیان میں کاذب خیال نہ فرمائیں گے۔

وظیفہ اہتمام کی بحث میں جو کچھ گفتگو آپ نے مجلس شوریٰ میں فرمائی وہ بلا کم

و کاست آپ کے تحریر فرمودہ الفاظ میں نہایت ثقہ راویوں کے ذریعہ سے

مجھے پہنچی تھی۔ جہاں تک اہتمام کے متعلق آپ کا دعویٰ ہے وہ بالکل صحیح اور

درست ہے واللہ العظیم میں خوب جانتا ہوں کہ میں نہ اس کا اہل ہوں نہ سیر

لئے مناسب ہے نہ بحمد اللہ ادنیٰ ترین خواہش دل میں ہے بلکہ اگر آپ یقین

فرمائیں تو کہہ سکتا ہوں کہ میں اس چیز سے انتہائی حد تک نفور اور کارہ ہوں جس کا اظہار بعض ان حضرات پر بھی قوت کے ساتھ کر چکا ہوں جو اس میں مسامحہ تھے۔ مجھے زیادہ صدمہ اس چیز سے پہنچا کہ جس مسئلہ سے میں خود اس قدر بیزار ہوں اسی کو زیر بحث لا کر ناخوشگوار مناقشات و منازعات کا دروازہ کھولا گیا۔ اور خواہی خواہی میرے ملکات و خصال پر آپ کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن جب یہ چیز زیر بحث آگئی تھی تو آپ کی رفعتِ شان اور خواجہ تاشی کا تعلق اس کو مقتضی تھا کہ آپ میری ذات کے متعلق یونہی بے تحقیق ریمارک شروع نہ کر دیتے۔ بحمد اللہ آپ کا میرا ایسا انقطاع نہیں تھا کہ آپ میرے احوال و خیالات کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کر سکیں۔ کبھی ایک مرتبہ بات کر کے تجربہ تو کر لیا ہوتا۔ یہ ہی شکوئی تھا جو میں نے مولوی سعید احمد صاحب بنگالی ممبر دارالعلوم کے سامنے کیا۔ میں نہایت صفائی سے کہتا ہوں کہ آپ کا دعویٰ کہ میں منصبِ اہتمام کے لائق نہیں یا اہتمام میرے مناسب نہیں بالکل صحیح ہے۔ لیکن جو دلائل پیش کی گئیں ان کے بعض اجزاء یقیناً غلط ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ طبعاً و فطرۃً مجھے کارِ اہتمام سے مناسبت نہیں اور اس سے زائد کہ جو شروطِ اہتمام دارالعلوم کے لئے میرے خیال میں معتبر ہیں ان سے میں محروم ہوں۔ مگر کانوں کا کچا ہونا اور عدم استقلال۔ اللہ کے فضل و رحمت سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کسی صحیح معیار کے مطابق ان کو ثابت نہ کر سکیں گے۔ اور اگر کر دیں گے تو میں ممنون ہوں گا کہ آپ نے ان عیوب اور آفاتِ نفس پر مجھے مطلع فرما دیا جن پر باوجود محاسبہ نفس کے مطلع نہ ہو سکا تھا۔ آپ نے سیاہ جھنڈیوں کے جس قفسہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ مجھ سے ایک ثغیرِ راوی نے جو آپ سے پوری عقیدت رکھتا ہے بیان کیا۔

لیکن اس نے نہیں کہا نہ میں نے یہ سمجھا کہ یہ چیز آپ کے اشارے یا اطلاح سے ہوئی ہے نہ اس سیاق میں کہی میں نے آپ کا نام لیا۔ ہاں میں یہ سمجھ بیخصل کے قاعدہ سے جب بعض طلبہ کی نسبت میں نے ایسا تو صد مہ کا اظہار کیا کہ آج ہمارے طلبہ کی حالت یہ ہو گئی ہے اور جب مجھ سے بعض طلبہ نے جامع مسجد میں بیان کرنے کی خواہش کی تو میں نے یہی جواب دیا کہ جو لوگ میرا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کرنا چاہتے ہیں وہ میرے بیان کو کیسے گوارا کریں گے معاف کیجئے اگر میں کہوں کہ آپ کانوں کے کچے ثابت ہوئے۔ آپ سے کسی نے کہہ دیا کہ میں آپ کی طرف اس تجویز کی نسبت کرتا ہوں چنانچہ آپ مجھے اس خط میں یہی بطور تبری لکھ رہے ہیں کہ تذکرہ تودرکنار اللہ باللہ اس امر کا ادنیٰ سا خیال نہ آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ارادہ ادا دانی ترین خیال کی نفی تو آپ اپنے ہی سے کر سکتے ہیں دوسروں کے قلوب پر کون ایسا جزم کر سکتا ہے۔ پس آپ کو رادی کی تصدیق کرنے سے پہلے ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کر لیتا تھا۔ میں بقیہ عرض کرتا ہوں کہ میں نے اس سلسلے میں ایک حرف بھی آپ کی نسبت نہیں کہا نہ یہ خیال میرے دل میں گذرا کہ ایسے رکیک فعل کی نسبت آپ کی طرف کو دیا میرے محترم اور بزرگ بھائی! اگر یہی معیار کانوں کے کچے ہونے کا ہے تو دنیا میں شاید ہی کوئی شخص کانوں کا پکا ثابت ہو سکے۔ پچھلے قلموں بڑے بڑے مستقل مزاجوں اور بچے کان والوں کو دیکھ لیا کہ کس طرح محض اپنے حاشیہ نشینوں کی رطب و یابس روایات پر اعتماد کر کے بعد و حجر اور اختلافات کی خلیج کو وسیع کرتے رہے۔ اگر اخبار میں تبیین و تثبت سے کام لیتے تو ہرگز یہ صورت پیش نہ آتی۔ اگر آپ چاہیں گے تو اس کا نہایت پختہ تحریری ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ مگر افسوس کہ ان کا اذُن ہوتا تو اذُنِ خیر پر

لے جو شخص ہنسنا ہے تو خیال کرتا ہے۔

عمل کر لیا جاتا ہے جو مقرر نہیں لیکن میرا اذن شر ہو نا متعین ہے جو مجھ ضرر کے کوئی دوسرا پہلو نہیں رکھتا۔

رہا میرا عدم استقلال۔ یہ وہ پروپیگنڈہ ہے جس کا ڈھول دسوں برس سے میرے حاسد بڑے زور شور سے پیٹ رہے ہیں۔ اگر عدم استقلال کے معنی یہ ہیں کہ ایک کام کو اچھا سمجھ کر اختیار کرنے کے بعد محض کم ہمتی اور کسل کی بنا پر چھوڑ دیا جائے تو میں مستثنی ہوں کہ آپ کی چند نظائر پیش فرما کر میرے نفس اتار دہ کی اصلاح و تنبیہ کا اجر حاصل کریں اور اگر عدم استقلال سے یہ مراد نہیں تو کم از کم سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا یہ قول ضرور مستحضر رکھیں :-

<p>(سچا آدمی ایک دن میں سو مرتبہ بدلتا رہتا ہے۔ اور ریاکار ایک ہی حالت پر سو سال تک قائم رہتا ہے۔)</p> <p>(مؤلف)</p>	<p>الصادق يتقلب في يوم واحد مائة مرة والمرأى يثبت عا حاله واحداً مائة سنة.</p>
----------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	--------------------------------------------------------------------------------

دیکھیے برا نہ مانئے آپ خود سیاسیات کے کتنے تقلبات اور اطواریں سے گزر رہے ہیں کیا اسے عدم استقلال کہیں گے۔ آپ نے فوائد قرآن کی تکمیل شروع کی فرصت نہ ہوئی نہ کر سکے اور خدا جانے کتنے کام ایسی نوعیت کے ہوں گے۔ میں تو بخدا آپ کو غیر مستقل مزاج نہیں سمجھتا بہر حال عدم استقلال کا کالفاظ استعمال کرتے ہوئے صرف عام شہرت اور طویل پروپیگنڈے کا شکار نہ ہونا چاہئے۔ عوام اور عیار پروپیگنڈہ کرنے والے تو سائد عدم استقلال کا صحیح مفہوم بھی ادا نہ کر سکیں۔ اہل علم و دیانت کی شان ان سے اعلیٰ و ارفع ہے وہ ایک لفظ زبان سے نکالیں تو

وَلَا تَقْعُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ
عِلْمٌ اَوْ مَا يَلْفِظُ مِنْ
قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ
عَتِيدٌ

(جس کا تجھے علم نہیں اس کے درپے
نہ ہونا چاہئے۔ انسان جو کچھ
زبان سے نکالتا ہے تو اس پر محافظ
نگران موجود ہے) (مؤلف)

کا پہلے خیال رکھیں۔ اور یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ انسان کے اصول بتاتے
رہتے ہیں۔ اگر ایک وقت اس میں عدم استقلال ہو تو لازم نہیں کہ ہمیشہ
ایسا ہی رہے۔

اس تحریر کا حاصل آپ یہ سمجھیں کہ مجھے غیر مستقل یا اذن کہنے پر غصہ آ رہا
ہے یہ تو کوئی چیز نہیں جو کمزوریاں اور نقائص مجھ میں ہیں ان کے سامنے تو یہ
معائب شاید محاسن سمجھے جائیں اور مجھے معتمم سمجھنا چاہئے کہ اللہ کے بندوں
کی نظر میرے ان واقعی معائب و مساوی پر نہیں پڑی۔

مجھے رنج اور تاسف اس پر ہے کہ آپ عیسیٰ بزرگ اور عالی مرتبہ ہستی
محض مسمیٰ سنانی چیزوں سے متاثر ہو کر میرے مجمع میں عیب چسپی کرنے
لگے اور اتنی زحمت گوارا نہ کرے کہ خود صاحبِ قصہ سے تحقیق حال کرے۔

مولانا المحترم! آپ میرے معاملے میں اپنے ان بعض حاشیہ نشینوں
پر اعتماد نہ فرمائیں جنہیں پندرہ بیس برس تک میرے کرشم اور عیبہ
رہنے کا دعویٰ ہے اور جن کے احوال سے میں بھی اسی قدر واقف ہوں جتنا
وہ مجھے جانتے ہیں۔ ان کا اور میرا انصاف خدائے قدوس کرے گا۔ میں تو
اپنی طرف سے ہمیشہ کے لئے یہ ہی کہوں گا۔

لَئِنْ بَسَطْتُ اِلَيْكَ
لَيَقْعَنَّ لِي مَا اَنَا بِبَاسِطٍ

(اگر تو میرے قتل کے لئے میری طرف
ہاتھ بڑھائے گا تو میں ایسا نہ کروں گا)

يَدِي إِلَيْكَ لَا تَمْلِكْ - | کہ تجھے قتل کرنے کے لئے تیری طرف
دست درازی کروں (مؤلف)

وہ میری طرف سے کسی انتقام کا خطرہ دل میں نہ لائیں ہاں وَلَا تَحْسَبَنَّ
اللَّهُ غَافِلًا عَمَّا تَعْمَلُ الظَّالِمِينَ سے غافل نہ رہیں۔

راصدات اہتمام یا صدارت تدریس کا مسئلہ میں یہ تحریری دستاویز آپ کے
ہاتھ میں دیتا ہوں کہیں واللہ ان میں کسی چیز کا طالب نہیں! اور نہ دارالعلوم کے
ان مناصب جلیلہ کا اپنے کو اہل محققا ہوں بلکہ اس طرح کے تذکرے بھی تکلیف ہوتی ہے۔
جو لوگ اس میں کوشاں ہوں ان کو میری تحریر دیکھ کر منع کر دیجئے۔ ہاں دارالعلوم
بہر حال سب مسلمانوں کی متاع ہے جنہوں نے دو چار حرف و ہاں وہ کڑھے ہیں ان کا
عزیز ترین مرتبی ہے۔ اکابر رحمہم اللہ کی امانت ہے۔ ان بزرگوں کا لگایا ہوا ہوتا ہے جن
میں ایک نام میرے والد مرحوم کا تھا۔ اگر کسی وقت کوئی خیر خواہی ہو سکے گی۔ اور وہ
دہم سے امن حاصل ہو سکے گا تو انشاء اللہ تا بقدر دروغ نہ ہوگا۔ امید کرتا ہوں کہ
آپ ان کلمات کا اثر نہ لیں گے۔ آپ کے لکھنے پر یہ چند الفاظ لکھے گئے ورنہ اس
وقت اپنے عقیدہ میں دیوبند کی صدارت تدریس کے لئے آپ کو احق ترین سمجھتا ہوں۔
پھر آپ سے کینہ کپٹ کیسے دکھ سکتا ہوں۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

آئین ما است سینہ جو آئینہ داشتن

جو الفاظ آپ کی شان گرامی کے خلاف لکھے گئے ہوں ان سے کریمانہ مسامحت
فسرمائیں۔

مجتلاد میرے منہ سے بات اگر کوئی بری نکلی
یہ بیدردی ہے کہنا، آہ بسمل بے سری نکلی
و السلام

تجزیہ | ان ہر دو جلیل القدر شخصیتوں کے خطوط آپ کے سامنے ہیں۔ یہ خطوط تاریخی دستاویز اور مقدس ورثہ ہیں۔ ان کو یوں ہی غوثی کے گوشے میں ڈال دینا مناسب نہیں۔ یہ دونوں خطوط ہر دو حضرات کے لکھے ہوئے ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان میں سے ہیں یہ انمول جواہر ملتے ہیں۔ خطوط پر غور کرنے سے وہ تمام تاریخی پس منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے جس میں علامہ کے صدہم بنائے جانے کی تجویز پر رونما ہوا۔ دونوں حضرات کے مکتوبات کا تجزیہ یہ ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مدنی | حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب کو جب یہ علم ہو چکا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کو ہمارے ان خیالات کا علم ہو چکا ہے جو مجلس شوریٰ میں ان کی صدارت سے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نہایت صفائی سے وہ ان باتوں کو ان کے علم میں لے آئیں جو انہوں نے مجلس شوریٰ میں ان کے متعلق فرمائی ہیں تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

حضرت مولانا مدنی کے دل کی صفائی کا اندازہ کیجئے کہ انہوں نے مولانا عثمانی کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ ان کے خیال میں مولانا عثمانی صدارت اہتمام کے اہل نہیں ہیں کیونکہ ان میں استقلال نہیں اور وہ کانوں کے کچے ہیں۔ کسی بات کا صاف صاف بیان کر دینا صفائی دل کی نشانی ہے۔

حضرت مولانا مدنی علم و فضل میں مولانا عثمانی کو اپنے آپ سے زیادہ تصور فرماتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرس کے لئے ان کو نہایت موزوں خیال فرماتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک انکساری سے کام لے رہے ہیں کہ وہ ان کے شاگرد کے برابر بھی اپنے آپ کو خیال نہیں فرماتے۔ اللہ اکبر! بزرگانِ دین کی ایک خصوصی شان حضرت مولانا مدنی کی تحریر میں پائی جاتی ہے اور وہ انکساری ہے اور ہمارے اکابر تمام ہی دلی طور پر انکساری میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا مدنی کے تقویٰ کا اس امر سے اظہار ہوتا ہے کہ وہ مولانا عثمانی سے ایک ہی شیخ کے دو شاگرد ہونے کی حیثیت سے، قطعاً تعلقات خراب کرنا پسند نہیں کرتے، بلکہ فرماتے ہیں۔ ”ہمارا آپس کا جنگ و جدال اور تخالف وغیرہ بھی عداوت اور دشمنی پر محمول ہونا چاہئے۔ ایک وقت میں لڑیں گے اور دوسرے وقت میں ملیں گے۔ عداوت قائمہ اور عداوت قلیبیہ نہ ہوگی“ حضرت مدنی کی یہ عبارت ان کے تقویٰ کی بہترین ترجمان ہے۔ اور ان کی رواداری کی بہترین مثال ہے۔

علامہ عثمانیؒ حضرت مولانا مدنی کے خط کے جواب میں علامہ عثمانی جن امور کا اظہار فرما رہے ہیں ان میں پوری صفائی قلب، انکساری، تعلقات کے باقی رکھنے کا احساس ہے۔ مولانا عثمانی نے اپنے خط میں یہ فرمایا ہے کہ میں واقعی صدر مہتمم ہونے کے قابل نہیں اور نہ ہی صدر مدرس یا آپ کی جگہ شیخ الحدیث بننے کا اہل ہوں تاآنکہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ میرے تصور میں بھی یہ نہیں ہے کہ مجھے صدر مہتمم یا شیخ الحدیث بنایا جائے۔ اور نہ ہی میں ان عہدوں کا طالب ہوں۔ بلکہ میں ان حضرات سے منع کر چکا ہوں جو اس امر میں کوشاں ہیں بلکہ مکتوب کی شکل میں آپ کے ہاتھ میں یہ دستاویز دیتا ہوں کہ ان حضرات کو آپ اس کوشش سے منع فرمادیں۔

البتہ مولانا عثمانی کو حضرت مدنی سے یہ شکوکہ ہے کہ ایک شخص جو بالکل گوشہ نشین ہے اور دارالعلوم میں کسی عہدے کا متمنی نہیں اس کی ذات کو بھرے مجمع میں نشانہ ملامت بنانا مناسب نہ تھا۔ اور اگر کوئی بات تھی تو براہ راست مجھ سے اس کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر لی جاتیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ میرے اور آپ کے تعلقات ایسے نہ تھے کہ آپ مجھ سے براہ راست گفتگو نہ فرما سکتے پھر پہلے مجھ سے حقیقت حال کیوں نہ معلوم کر لی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کو یہ خیال ہوا کہ حضرت عثمانی اس معاملے میں خود کوشاں ہیں۔

علامہ عثمانی نے شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی کی یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ میں صدارت کا اہل نہیں لیکن ان دو باتوں یعنی کانوں کا کچا ہونا اور غیر مستقل مزاج ہونے کو رد کر دیا ہے اور تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

حضرت مولانا مدنی نے کانوں کے کچے ہونے کی دلیل میں فرمایا ہے کہ صدارت اہتمام کے عہدے پر سرفرازی کی حیثیت میں میری طرف سے سیاہ جھنڈیوں سے استقبال پر اعتماد کر لینا غلط فہمی ہے۔ مولانا عثمانی نے اس بات کے جواب میں فرمایا ہے :-

”آپ نے سیاہ جھنڈیوں کے جس قصبے کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ مجھ سے ایک ثقہ راوی نے جو آپ سے پوری عقیدت رکھتا ہے بیان کیا لیکن اس نے یہ نہیں کہا نہ میں نے سمجھا کہ یہ چیز آپ کے اشارے یا اطلاع سے ہوئی ہے نہ اس سیاق میں میں نے آپ کا نام لیا“

لہذا جس وجہ سے مولانا مدنی کو یہ خیال ہوا تھا اس کو مولانا عثمانی نے صاف کر دیا۔

رہا تیسرا اعتراض عدم استقلال کا اس کے جواب میں مولانا عثمانی تحریر فرماتے ہیں :-

”رہا میرا عدم استقلال اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک کام کو اچھا سمجھ کر اختیار کرنے کے بعد محض کم ہمتی اور کسل کی بنا پر چھوڑ دیا جائے تو میں متنبی ہوں کہ آپ اس کی چند نظائر پیش فرما کر میرے نفس امارہ کی اصلاح و تنبیہ کا اجر حاصل کریں اور اگر عدم استقلال سے یہ مراد نہیں تو کم از کم سید الطائفہ جنید بغدادی رحمہ اللہ کا یہ قول ضرور مستحضر رکھیں

الصادق یتقلب فی یوم واحد مائة مرة و
المرأی یشبت علی حالة واحدة سنة

دیکھئے برا نہ مائیے آپ خود سیاسیات کے کتنے تقلبات اور اطوار میں گزریے
ہیں۔ کیا اسے عدم استقلال کہیں گے..... میں تو بخیر آپ کو غیر مستقل
مزاج نہیں سمجھتا۔

بہر حال مولانا عثمانی آخر کے دنوں اعتراضات سے اپنی پوزیشن صاف کرتے
نظر آتے ہیں۔ اور آخر میں تعلقات اور صفائی قلب کے باعث فرماتے ہیں کہ
کفر است در طریقت ماکینہ داشتن ؛ آئین ما است سینہ چو آئینہ داشتن
اور پھر خط میں ہر قسم کی گستاخی سے معافی چاہتے ہیں کہ

بھلا دوسرے منہ سے بات اگر کوئی برکتی ؛ یہ سید روی ہے کہنا آہ بسمل بے مریگی
بہر حال ان دنوں حضرات کے خطوط میں وہ شان موجود ہے جو علمائے ربانی
میں ہونی چاہیے لیکن ان دنوں حضرات کے متبعین پر اگر نظر ڈالی جائے تو ان میں
سے بعض طلباء اور بعض مدرسین کی سرگرمیاں نامناسب رنگ اختیار کر رہی تھیں۔ بعض
چاہتے ہیں کہ مولانا عثمانی مدرسے میں نہ آئیں اور اگر آئیں گے تو ہم سیاہ جھنڈیوں سے
ان کا استقبال کریں گے۔ لیکن وہ مولانا عثمانی کے کیوں مخالف تھے وجہ اس کے سوال اور
کچھ نہ تھی کہ وہ حضرت مولانا مدنی کی موجودگی میں ان کے وجود کو دیکھنا پسند نہ کرتے
تھے۔ لیکن یہ وجہ کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

دارالعلوم
انیٹول کا نام نہیں

اگر غور سے دیکھا جائے تو مجلس شوریٰ کے بعض ارکان نیکیتی
سے صدارت پر ایسی قابل اور مسلمہ شخصیت کو لانا چاہتے
تھے جو اپنی قوت علمی سے اثر انداز ہو کر بعض کام جو رکھتے

سے نظر آجاتے ہیں ان کو چالو کر دے۔ دراصل کسی ادارے کی شہرت اور ناموری
انیٹول کی دیواروں پر نہیں ہے بلکہ ان قابل شخصیتوں کے باعث ہوتی ہے جو اس کو
چلاتے نظر آتے ہیں مجلس شوریٰ کے بعض ممبروں نے یہی سوچا تھا کہ دارالعلوم

میں علامہ شبیر احمد صاحب کی سی شخصیت کو ہونا چاہیے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی زبانی ہم آپ کے سامنے وہ نظریہ پیش کرتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک طویل مضمون میں الفرقان ماہ صفر ۱۳۵۸ھ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

” (مولانا محمد طیب) کو اہتمام کا صیغہ سپرد تو کر دیا گیا لیکن نوعمری کی وجہ سے عموماً اساتذہ و ملازمین اور طلبہ پر آپ کا اتنا اثر قائم نہ ہو سکا جتنا ایک عمر کن سال آدمی کا ہونا چاہیے اس لئے مجلس شوریٰ نے مختلف پیچیدگیوں کو دیکھ کر دو سال ہوئے کہ صدر مہتممی کا ایک نیا عہدہ بنا کر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صدر دارالعلوم ڈابھیل کا اعزازی طور پر تقرر کیا ہے۔“

(الفرقان سابق بریلی صفر ۱۳۵۸ھ)

یہ بات جو مولانا مناظر احسن گیلانی نے کھل کر لکھ دی میرے لئے لکھنی شایانِ شان نہ تھی لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد طیب کے زمانے میں دارالعلوم کو بے حد ترقی ہوئی۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

علامہ عثمانی جب آغاز ملازمت میں فتح پوری دہلی کے مدرسے میں صدر مدرس تھے تو ان کو وہاں سے بلایا گیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی ہتم مدرسہ کی وہ عبارت ملاحظہ فرمائیے جو ہم نے تجلیات عثمانی میں پیش کی ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے قابل اور لائق عالم کے متعلق اراکین دارالعلوم کا یہ تقاضا تھا کہ ایسے شخص کو دارالعلوم سے باہر نہ رہنے دیا جائے اس لئے ان کو فتح پوری دہلی سے بلا کر دارالعلوم میں مقرر کیا گیا۔ پس اگر ان کی موجودگی اس وقت دارالعلوم کے لئے باعثِ فخر تھی تو اب باعثِ صدِ افتخار کیوں نہ ہوگی اسی لئے بعض ممبروں کا یہ خیال مبارک تھا کہ ان کو دارالعلوم سے جدا نہ رہنے دیا جائے۔

ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب اور علامہ عثمانیؒ کے جہاں تک کردار کا تعلق ہے وہ بے داغ ہے۔ بات بگاڑنے والے اور ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر کر کے مزا لینے والے پارٹیوں کے افراد تھے۔ بہر حال اسی کشمکش میں حکمرانی کے مطابق علامہ عثمانی کا دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم ہونے کے متعلق مجلس شوریٰ نے فیصلہ کر دیا۔

علامہ عثمانی بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲ ذی القعدہ ۱۳۵۲ھ تا ۱۳۶۲ھ
۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۳ء

خواجہ فیروز الدین رکن مجلس شوریٰ کا بیان ہے کہ جب ہم نے اس تجویز کو مجلس شوریٰ میں پیش کیا تو حکیم مقصود علی صاحب اور دوسرے موافقین نے تائید کی۔ کہ مولانا شبیر احمد صاحب کو صدر مہتمم کے عہدے پر مقرر کیا گیا اور آپ صدر مہتمم بنادئے گئے۔ اگلے روز مولانا حبیب الرحمن شیروانی رکن مدرسہ عالیہ بھی دیوبند پہنچے اور انہوں نے صدارت اہتمام کے فیصلہ شدہ معاملے کو پھر اٹھایا لیکن خواجہ فیروز الدین کپور تھلوی نے کہا کہ جو معاملہ کثرت رائے سے کل طے ہو چکا ہے اصولاً پھر چھڑنا درست نہیں ہے لہذا یہ باتیں ختم ہو گئی۔ لیکن چونکہ حضرت عثمانی کا تعلق ڈابھیل سے بھی تھا اس لئے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ مردہست دونوں جگہ کے امور انجام دیتے رہیں چنانچہ آپ کا تعلق ڈابھیل سے بھی رہا اور امور مدرسہ دیوبند سے متعلق کاغذات وہاں جاتے اور آپ ان کا تصفیہ فرماتے اور رمضان کی تعطیل میں جب علامہ اپنے وطن دیوبند آتے تو دارالعلوم کا باقاعدہ کام انجام دیتے بلکہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب جب کہیں تشریف لے جاتے تو اہتمام کا کام بھی آپ انجام دیتے۔

لیکن یہاں آپ کے علم میں یہ بات بھی ہونی چاہئے کہ صدارت اہتمام کے زمانے میں علامہ عثمانی نے کوئی پیسہ دارالعلوم سے تنخواہ کا نہیں لیا۔ صرف فی سبیل اللہ خدمت انجام دیتے تھے اور اس سے پہلے بھی چند سال کے سوا بغیر تنخواہ دارالعلوم کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔

بہر حال ۱۹۳۷ء مطابق ۱۳۵۶ھ سے علامہ کو قدرت نے دارالعلوم حبیبی مایہ ناز مادر علمی کا صدر بنادیا۔ ۱۳۵۷ھ میں جب مولانا محمد طیب صاحب حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو آپ نے ان کی جگہ بحیثیت مہتمم بھی کام کیا۔ ۱۳۵۷ھ کی رپورٹ میں ہے۔ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم تحریر فرماتے ہیں :-

”احقر کی غیبت (عدم موجودگی) میں بحیثیت قائم مقام مہتمم حضرت مولانا

شیر احمد صاحب عثمانی کا تقرر کیا گیا تھا۔ مولانا ممدوح اس عرصے میں دارالعلوم

کی خدمات میں مشغول رہے اور بعد واپسی کے ڈابھیل تشریف لے گئے اور پھر

اجلاس شوریٰ منعقدہ ۱۳۵۳ھ میں مولانا ممدوح کا صدارت پر تقرر کیا گیا۔

مولانا ممدوح کا تعلق ملازمت مدرسہ ڈابھیل سے بھی بدستور باقی ہے اور

سال کا اکثر حصہ وہیں گزارتے ہیں۔ ماہ شعبان میں تعطیل کے زمانے میں دیوبند

تشریف لاتے ہیں۔ دوران غیبت میں بسلسلہ معاملات مدرسہ مراسلت ہوتی

رہتی ہے۔ درمیانی مدت میں شرکت جلسہ ہائے شوریٰ وغیرہ کے لئے دعوت و

طلب پر تشریف آوری ہوتی رہتی ہے۔ دوران قیام دیوبند میں دارالعلوم میں تشریف

لاتے ہیں اور معاملات کی انجام دہی میں حصہ لیتے ہیں۔ (رواد ۱۳۵۲ھ ص ۱۰۲)

مولانا محمد طیب صاحب کے اس نوٹ سے پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا

ہے۔ اس نوٹ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اثنائے سال میں مجلس شوریٰ کے جلسوں میں بھی

آپ دیوبند تشریف لاتے رہتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی

کا
اساتذہ، طلبہ اور ملازمین کی طرف سے
پُر تپاک اور پُر جوش خیر مقدم

صَدَارَتِ اِہْتِمَا ^{۱۳۵۳ھ} رزوالقعدہ
| علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے صدارتِ اِہْتِمَا پر
جس کو یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر کا عہدہ
کہا جاتا ہے فائز ہونے کے بعد کی کیفیت دارالعلوم دیوبند کے ماہوار رسالہ
القاسم میں ایڈیٹر صاحب نے ذوالحجہ ۱۳۵۲ھ کی اشاعت میں اس طرح درج
کی ہے جو حسب ذیل ہے :-

دارالعلوم دیوبند میں نزولِ رحمت و برکت

اسال دارالعلوم دیوبند میں چند قابلِ مسرت امور منصفہ شہود
پر آئے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ امور دارالعلوم کے لئے برکاتِ ظاہری و
باطنی کا موجب ہوں گے (۱) ممبران دارالعلوم کی تجویز کے مطابق
حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے
دارالعلوم کی سرپرستی حسبِ روایات قدیر قبول فرما کر سبھی خواہانِ دارالعلوم
پر احسانِ عظیم فرمایا۔

(۲) جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے

زمانہ حج بیت اللہ میں اراکین دارالعلوم کی تجویزاً اور حضرت حکیم الامتہ دام
 فضلم سرپرست دارالعلوم کے امر و ارشاد سے فخر المتکلمین علامۃ العصر
 حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ
 ڈابھیل نے تاقیام دیوبند باوجود اپنی چند در چند مشکلات کے عارضی
 اہتمام کو قبول فرما کر تمام ہی خواہاں دارالعلوم کو مسرور کر دیا۔ ۳ ذی
 القعدہ ۱۳۵۸ھ کو اپنے تقرر کی اطلاع کے جواب میں حضرت مولانا نے ایک تحریر
 دفتر اہتمام میں ارسال فرمائی تھی۔ جس میں مرقوم تھا کہ آج بعد نماز
 ظہر مدرسین و ملازمین دارالعلوم ایک جامع ہو جائیں اور جو کاغذات
 میرے متعلق ہوں ان کو تیار رکھا جائے۔ چنانچہ بعد ظہر تمام مدرسین
 و ملازمین دارالعلوم دارالمشورہ میں جمع ہو گئے۔ جب حضرت مولانا مدرسہ
 میں تشریف لائے تو جوش عقیدت میں سینکڑوں طلبہ آپ کے ہمراہ
 دارالمشورہ میں جمع ہو گئے۔ جن کو مصلحتاً دارالمشورہ سے منتشر کر دیا گیا
 حضرت مولانا نے تمام مدرسین کے ردبر و ایک مختصر پر مخرج جامع و مانع
 تقریر فرمائی۔ جس میں پہلے اپنی حیثیت کو واضح فرمایا۔ اور اس کے بعد
 اس پر خدا تعالیٰ کا شکر یہ ادا کیا کہ جماعت دارالعلوم کے اندر حسب سابق
 اتحاد و اتفاق کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اور توقع ظاہر فرمائی کہ سب
 ذمہ داران دارالعلوم مل کر اس امانت الہیہ کی حفاظت کریں گے مولانا
 شبیر احمد صاحب خدمت اہتمام کے باضابطہ قبول کرنے میں جب کچھ
 پس و پیش کا اظہار فرماتے تھے تو حضرت مولانا حسین احمد صاحب
 فرماتے تھے کہ نہیں آپ کو باضابطہ کام کرنا پڑے گا۔ بعد ختم تقریر کے
 حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی جانب سے اس تقریر کی خوشی

شیرینی تقسیم کرائی۔ ۴ رذی قعدہ ۵۳ھ کو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے بعد نماز جمعہ مدرسین و ملازمین کو دارالشورہ میں چار پرہیزگاروں پر اسی روز طلباء کی مختلف انجمنوں کی طرف سے بعد نماز عشاء دارالحدیث کے بڑے ہال میں خیر مقدم کا ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں طلباء کی طرف سے خیر مقدم کے پرچوش تصانید پڑھے گئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے ڈیڑھ گھنٹہ تک ایک بلیغ و جامع تقریر فرمائی جس میں اپنی حیثیت کو واضح فرماتے ہوئے دارالعلوم کی اساس اور اس کی گذشتہ تاریخ پر تبصرہ فرماتے ہوئے اس کے فیوض و برکات کا تذکرہ فرمایا۔ طلبہ کو اہل مقصد یعنی تعلیم کی طرف انہماک کا شوق دلایا۔ حضرت مولانا کی تقریر کو تمام مجمع نے نہایت امن و سکون کے ساتھ حرز جاں بنایا۔ تقریر کا خلاصہ انشائے اللہ آئندہ اشاعت میں ہدیہ ناظرین ہوگا۔ حضرت مولانا کی تشریف آوری سے دارالعلوم اور طلبہ کے اندر مسرت و ہیبت کے خاص آثار نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے قدوم میں منت لزوم کو دارالعلوم کے لئے ترقیات ظاہری و باطنی کا ذریعہ بنادے اور طلبہ دارالعلوم کو حضرت مولانا کے مستقل فیوض و برکات سے مستفید و متمتع ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

جذبات عاقل

بسمرت قدوم میں منت لزوم علامۃ العصر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی یونیورسٹی دہلی
(از جناب منشی محمد عاقل صاحب مدرس درجہ فارسی ریاضی دارالعلوم دیوبند)
میں شاعر نہیں، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے تعلق دارالعلوم

پر کچھ پر اگندہ خیالات موجزن ہوئے جن کو فوری طور پر رشتہ نظم میں
منسلک کر دیا گیا نظر ثانی کی بھی نوبت نہ آ سکی۔ (محمد عاقل غفرلہ)

مبارک ہو ترا آنا تجھے آنا مبارک ہو

تجھے یہ مدرسہ اور مدرسہ کو تو مبارک ہو

بہی خواہ جس قدر میں خوش رہیں یا رب!

حسین احمد ہوں طیب اور تو ہو اور مبارک ہو

الہی عارضیت اٹھ کے استقلال آجائے

الہی خرخشے مٹ جائیں اور اخلاص آجائے

تو آجا اور آکر مدرسہ کی آبیاری کر

مخالف بھی اگر ہوں ترے ان سے آپ باری کر

زمین قلب جو ہے خشک اس پر آب جاری کر

غرض شاداب کر اس بوستان کو آبیاری کر

حسینی اور شبیری فضا سے جان آجائے

علوم فیض کے دریا بہیں اور شان آجائے

کہیں فرزند کو کر کے جدا بھی جین ہوتا ہے

کہ قلب مادر و فرزند بس بچین ہوتا ہے

جو حالت مادر علم و عمل کی بن ترے گزری

بیاں اس کا نہیں اچھا کہ دل بچین ہوتا ہے

یہی جی چاہتا ہے لوٹ کر وہ آن آجائے

کہ پھر آغوش مادر میں سپردی شان آجائے

جیتی عہد کا اور احمدی کا دور آجائے

وہ محمودی سبق کا پھر جہاں میں شور ہو جائے
مسلم ہو چکا ہے جانشین گراک زمانہ میں
حقیقی جانشین یا رب اک ان کا اور ہو جائے

رشیدی قاسمی گلزار میں پھر جان آجائے
گلستان محمد میں الہی شان آجائے

رسالہ القاسم کی اس رپورٹ سے واضح ہو جاتا ہے کہ کیا طلبہ اور کیا اساتذہ
اور کیا ملازمین سب نے آپ کا پر جوش خیر مقدم اور پرتیاک استقبال کیا۔ منشی محمد عاقل
نے جو اشعار پڑھے اگرچہ شاعری کی حیثیت سے اس میں سقم ہے لیکن خلوص کا پورا
جوش ہے۔

حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا عثمانی
کے صدارت اہتمام کے عہدے پر فائز ہونے پر مسٹھا
اور شیرینی | تقسیم فرمائی جو حضرت والا کے اخلاقی کریمانہ کا خاص
پہلو ہے۔ خود مولانا عثمانی نے بھی اساتذہ اور ملازمین کے اعزاز میں چائے پر
مدعو کیا۔

طلبہ کی طرف سے استقبال | طلبہ نے جس احترام اور اعزاز سے مولانا کو خیر
مقدم کیا وہ دارالعلوم کی تاریخ میں سنہری حروف
سے لکھنے قابل ہے۔

طلبہ کے استقبالیہ میں علامہ عثمانی کی تقریر

علامہ عثمانی نے دارالحدیث کے ہال میں ایک زبردست ابتدائی تقریر کی جو آپ
کی خداداد خصوصیت اور لیاقت کی شان کو ظاہر کر رہی تھی اور یہ تقریر اسی قسم کی

ایک تقریر تھی جو قدرت ربانی خاص اوقات میں آپ کی زبان سحر انگیز سے کراتی رہی ہے۔ تقریر کیا تھی ایک بادل تھا جو گرج رہا تھا، فضاحت و بلاغت کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا، علم و فضل کا ایک دریائے بے کراں تھا جس میں تلاطم پیا تھا۔ حکمت و موعظت کی موجیں تھیں جو سرا سہارا سہارا کر دیکھ رہی تھیں یا کوثر و تسنیم کی ضیا میں چمکتی ہوئی لہریں تھیں جو رواں دواں تھیں یا شیرینی و لطافت کے چشے تھے جو فردوس سے اُبل اُبل کر دلوں کی خشک کھیتوں کو سرسبز و شاداب اور جنت نگاہ بنا رہے تھے۔

علامہ کی یہ تقریر چھپ کر دارالعلوم میں تقسیم ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ :-

”جس طرح سمندر سے بخارات اٹھ کر بادل کی صورت میں بہتے ہیں اور پھر سمندر میں جا ملتے ہیں۔ گویا یہ بخارات اپنے مرکز سے جدا ہوتے اور مرکز کی طرف واپس ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح اب سے کچھ سال پہلے مجھے اپنے مرکز علی کو چھوڑ کر جدا ہونا پڑا اور پھر آج وہ وقت آیا اس علم کے سمندر سے اٹھے ہوئے بخارات پھر اسی سمندر میں آکر مل گئے ہیں“

الفاظ، مضمون اور معانی اسی طرح کے تھے۔ غرض یہ ہے کہ آپ کی یہ تقریر ایک تاریخی تقریر تھی۔

جب آپ نے چارج لیا تو حضرت مولانا مدنی سے لیکر ادنیٰ مدرسین تک سب نے آپ کو خوش آمدید کہا اور اب تک کی جو کمزورت تھی وہ سب دھل گئی۔ تمام آکر ملے اور معاملات صاف ہو گئے

لیکن ارکان دیوبند کا یہ خیال تھا کہ آپ مستقل
 طور پر دیوبند تشریف لے آئیں چنانچہ ۱۳۶۱ھ
 میں سہ ماہی مستقل طور پر دارالعلوم دیوبند
 کے کام میں شہک ہو گئے۔

آپ کے عہد اہتمام میں وہ کام جن میں ایک قسم کی رکاوٹ سی ہو جاتی تھی چل
 پڑے اور اکابر میں ہونے کی وجہ سے سب اساتذہ آپ سے متاثر ہو کر مطیع ہو گئے۔
 مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں :-

”آپ (علامہ عثمانی) نے جب سے دیوبند کی صدارت اہتمام کی باگ
 اپنے ہاتھ میں لی ہے بہت سے مشکلات حاضرہ جن پر اراکین قابو نہیں پا رہے
 تھے بحمد اللہ حل ہو گئے“ (الفرقان صفر ۱۳۵۸ھ صفحہ ۲۵)

آپ کا تقریر و القہہ ۱۳۵۲ھ میں صدر مہتمم کی
 شعبہ تنظیم و ترقی ۱۳۵۵ھ
 اسی پر ہوا تو آپ نے صدارت کا چارج لیتے ہی
 دارالعلوم کو ترقی پر گامزن کرنے کے لئے پہلا قدم جو اٹھایا وہ شعبہ تنظیم و ترقی
 تھا۔ ۱۳۵۵ھ کی روئداد (رپورٹ) میں مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں :-

”حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند
 کی تجویز کے مطابق بعد منظور مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۹ جمادی الاولیٰ
 ۱۳۵۵ھ اس شعبہ کا اجراء عمل میں آیا۔“

اعلیٰ مقصد عامہ مسلمین کو حلقہ ہی خواہان دارالعلوم میں داخل
 کرنا شعبہ کے اعلیٰ مقاصد میں داخل ہے جس کے لئے اقرار نامے بنام
 ”قرطاس ہی خواہان دارالعلوم“ طبع کرائے گئے ہیں۔ ان میں کچھ شرائط
 ہیں جن پر سہی خواہ بننے والے کے دستخط لئے جاتے ہیں۔ ہر سہی خواہ کیلئے

وہ لازوال نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روئداد کی رپورٹ کے مطابق اس نتیجے نے بڑی ترقی کی جو علامہ کے حسن خیال اور حسن انتظام پر دال ہے۔

سٹیشن سے دارالعلوم
تک جدا گانہ سڑک

دارالعلوم کی روز افزوں وسعت اور ذاتی عظمت و امتیاز کے باعث یہ تجویز بھی پیش نظر دی ہے کہ دیوبند کے سٹیشن تک جدا گانہ سڑک بنوائی جائے۔

اس سلسلے میں علامہ کے عہد صدارت میں اس کوشش نے خصوصی عملی شکل اختیار کی، حافظ محمد ابراہیم گھنوی کو جو اس زمانے میں حکومت متحدہ آگرہ و اودھ کے وزیر اوقاف و انہار و رسل و رسائل تھے، دعوت دی گئی چنانچہ موصوف رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۵۷ھ میں ۲۱ مئی ۱۹۳۱ء کو ۸ بجے صبح دارالعلوم میں تشریف لائے۔ آپ کا نہایت گرمجوش سے استقبال کیا گیا۔ مولانا عثمانی نے استقبال کے انتظامات کئے۔ اپنی جیسے چائے کا انتظام کیا اور مدرسے کو اس خرچ سے محفوظ رکھا۔ چائے پر اراکین مجلس شوریٰ معززین شہر بھی مدعو کئے گئے تھے۔ دارالعلوم کے ہال میں دس بجے جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت کے لئے مفتی کفایت اللہ صاحب کو منتخب کیا گیا۔ طلبہ نے وزیر موصوف کی شان میں قصیدے پڑھے۔ ایک طالب علم نے جس کا نام عبدالرشید بریلوی تھا قصیدے میں حافظ صاحب کو ابراہیم ثانی کہہ دیا۔ قصائد کے بعد علامہ عثمانی نے مسطور تقریر فرمائی اور قصیدہ نگار کو ابراہیم ثانی پر فقہ کی روشنی میں تنبیہ کی جو نہایت ضروری اور بر محل تھی۔ آپ نے مختلف امور پر روشنی ڈالتے ہوئے سڑک کی تکمیل پر وزیر موصوف کی توجہ منقطع کرائی۔ سوا بارہ بجے یہ جلسہ ختم ہوا (روئداد رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۵۷ھ صفحہ ۵) بہر حال سڑک کے سلسلے میں علامہ کی سعی کو سبھی دخل نصیب ہوا۔

۱۳۵۸ھ
۱۹۳۸ء

علامہ ہی کے عہد صدارت میں آپ کی تنظیم ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند ۱۳۵۸ھ
۱۹۳۹ء تجویز پر بنائے قدیم دارالعلوم کا

تحریک کا آغاز ہوا۔ ۱۳۵۸ھ کی رپورٹ میں ”تنظیم ابنائے قدیم“ کے عنوان کے ماتحت حسب ذیل تاریخی نوٹ ملاحظہ کیجئے :-

”اس سلسلے میں محرم ۱۳۵۸ھ میں بمقام دہلی ابنائے قدیم کا ایک عظیم الشان جلسہ زیر صدارت حضرت مولانا شبیر صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم منعقد ہوا جس میں بیات کے فضلاء دارالعلوم اکٹھے ہوئے۔ (مجموعے مولانا خواجہ عبدالحی صاحب فاضل دیوبند سابق استاد جامعہ ملیہ دہلی و حال پروفیسر اسلامیہ کالج نے فرمایا کہ میں اس جلسے کی مجلس استقبالیہ کا صدر تھا۔ انوار) اس کے بعد دوسرا اجلاس بمقام درجہ گہ زیر صدارت مولانا منت اللہ صاحب مونگیری ایم۔ ایل۔ اے فاضل دیوبند منعقد ہوا جس میں موہ بہار کے تمام فضلاء جمع ہوئے۔ توسیع ہی خواہان دارالعلوم کی تحریک پر تقریریں ہوئیں اور یہ تحریک عام ہو گئی اور بھمد اللہ روز بڑھتی جاتی ہے۔ تنظیم کی بنیادی سکیم کے پایہ تکمیل کو پہنچ جانے پر قوی امید ہے کہ یہ سلسلہ قوی اور نتیجہ خیز ہو جائے گا۔ کام اپنا راستہ پیدا کر رہا ہے اور بتدریج نتیجہ خیز ثابت ہوتا جا رہا ہے“

ابنائے قدیم کی تنظیم (OLD BOYS ASSOCIATION) جو علامہ عثمانی کی تحریک کا نتیجہ تھا درحقیقت موصوف کی دور رس نگاہ کا ثمرہ تھا جس کی ہمیشہ ضرورت محسوس کی گئی ہے اور ہر دور میں اس کے متعلق غوام و خواص دارالعلوم کی زبان پر ذکر آتا رہا ہے مگر علامہ نے اس کو عملی طور پر منظم کیا۔ یاد ہے کہ بھنور میں بھی اس کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں راقم الحروف بھی شریک ہوا تھا۔

اردو زبان کی ترقی | ۱۳۵۶ھ کی مجلس شوریٰ میں جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں اردو زبان کی ترقی

سے متعلق ایک تحریک مولانا عثمانی نے پیش کی جو حسب ذیل ہے :-

”مولانا عثمانی کی اہم تجویز | تجویز ۳۳ - باجارت صدر مولانا شبیر احمد

صاحب عثمانی نے تحریک کی کہ جناب حاجی سید محی الدین صاحب نیرپل اورنگ آباد کالج کی زبردست خواہش کے موافق دارالعلوم میں فارسی کے ساتھ اردو کی تعلیم بھی جاری کی جائے اور اس کے لئے نصاب بنایا جائے۔ مجلس اے منظور کرتی ہے۔ مجلس علمی نصاب مرتب کرے اور آئندہ جلسے میں پیش کرے۔

(دارالعلوم رسالہ ۱۹ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ)

غور سے دیکھا جائے تو اردو کی ترویج اور ترقی کی تحریک مسلمانوں کے قومی وقار اور کلچر کا سوال ہے۔ دارالعلوم ہی میں نہیں بلکہ تمام ہندو پاک میں آج کے دور میں اس کی ترقی نہایت ہی اہم اور مسلمانوں کی زندگی اور موت کا سوال ربطے محی الدین صاحب کے ایماء پر ہی سہی لیکن علامہ کی تحریک پر مجلس شوریٰ نے مجلس علمی کو نصاب مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی۔ اس کا انجام کیا ہوا معلوم نہیں۔

دارالعلوم میں وفود | ایک طرف تو دارالعلوم کی انتظامی خدمات میں علامہ مصروف رہے اور دوسری طرف باہر سے جو وفود یا معزز شخصیں آتیں ان سے عہدہ برآئی یہ ساری ہی

مصروفیتیں دارالعلوم میں آپ کی زندگی کی جز بن گئی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی وفد مصرفتھا۔ ۱۳۵۵ھ کے واقعات میں رپورٹ بتلاتی ہے :-

وفد مصر | ۲ ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۹۳۷ء شام کے

چار بجے کی گاڑی سے وفد مصر دارالعلوم میں پہنچا۔ بعد مغرب ایک مجلس

خاص میں علمائے دارالعلوم سے علمی مباحث پر گفتگو ہوتی رہی۔ حضرت مولانا

شبیر احمد صاحب کے ایک پرمغز اور علمی مکالمے سے ارکان وفد بہت محظوظ ہوئے۔

(روبرود ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۷ء ص ۷-۳)

استاذ محترم حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے مجھ سے فرمایا کہ اسی وفد کی آمد پر علامہ عثمانی نے عربی میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ لکھا تھا جس کو اس وفد کی مجلس میں موضوعی نے پڑھ کر سنایا تھا جس میں دارالعلوم سے متعلق معلومات فراہم کی گئی تھیں۔

وفد مدراس | ماہنامہ دارالعلوم شوال ۱۳۶۰ھ میں وفد مدراس کی آمد اور حضرت عثمانی کی تقریر کا حال حسب ذیل عبارت میں اس طرح پیش کیا گیا ہے :-

” ۲۶ شوال کو وفد کے بے حد اصرار پر حضرت علامہ شبیر احمد صاحب صدر مہتمم دارالعلوم کی تقریر ہوئی۔ معزز مہانوں کے خیر مقدم کے لئے ۲۶ شوال کو دارالعلوم کے وسیع ہال میں جلسہ منعقد ہوا جس میں پہلے حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے سفر مدراس کے کوائف اور اہل مدراس کے اکرام و مہمان نوازی اور دارالعلوم کے ساتھ قلبی روالبط کا ذکر فرمایا ان کے بعد حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے اپنے مخصوص و دلنشین انداز میں ایک عالمانہ تقریر ارشاد فرمائی جس میں مختلف مواضع و پسند کے ساتھ ہی دارالعلوم کی عظمت و شان، اس کی خدمات اور ضرورت پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد دعا پر جلسہ ختم کیا گیا۔“

(کوائف دارالعلوم ماہنامہ شوال ۱۳۶۱ھ)

علامہ عثمانی کے عہدِ صدارت کے وقت دارالعلوم کی سیاسی فضا

حضرت عثمانی نے جب دارالعلوم دیوبند کا بحیثیت صدر مہتمم (Vice Chancellor) چارج لیا تو اس وقت دارالعلوم کی سیاسی فضا کیا تھی خود

مولانا عثمانی کی زبانی سنئے۔ اپنے بیان مؤرخہ ۹ رجب ۱۳۶۲ء میں لکھتے ہیں:-

میری صدارت اہتام سے تقریباً آٹھ نو سال پہلے جبکہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم کی جگہ پر کرنے کے لئے کسی مشہور شخصیت کی ضرورت تھی دارالعلوم کا اہتام امد شوریٰ مولانا مدنی کی شرائط قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مولانا محدود اس وقت دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس نووارد تھے۔ دوسری طرف ایسی مقتدر ہستیاں موجود تھیں جو ان کے سیاسی استثناء کے اثرات کو زیادہ پھیلنے سے بڑی حد تک روک سکتی تھیں۔ جب ان میں سے بعض اٹھ گئیں اور بعض کا تعلق بالکل مضمحل کر دیا گیا تو مولانا مدنی کا سیاسی استثناء اپنے قدرتی اثرات کے ساتھ بے روک ٹوک سامنے آنے لگا۔ مولانا کے حد سے زیادہ سیاسی انہماک و غلو کی موجودگی میں خود ان کی زبانی یا قلمی نہایت میں بھی ایسی قوت نہ تھی کہ آثار کو ان کے طبعی اسباب پر مرتب ہونے سے روک دیتی۔ جیسا کہ میں اپنے سابق بیان میں واضح کر چکا ہوں۔ آخر وہ اثرات ادارے کے ہر جز و کل میں اس حد تک سرایت کر گئے کہ اس کی اصل پالیسی کے چلانے میں دقتیں پیش آنے لگیں اور کارکنوں میں وحدت مذاق مفقود ہو گئی بہر حال مجھے اسی ماحول میں صدارت اہتام بدون میری ادنیٰ خواہش واستدعا کے تفویض کی گئی۔

لے حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں ملازمت کے وقت حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اور اراکین مدرسہ سے یہ شرط لگائی تھی کہ سیاسیات ملکی میں حصہ لینا اور دہرہ ماہ میں تین دن ایسے جلسوں میں شرکت کے لئے مجھے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کی ہر شرط مان لی گئی تھی یہی ان کا سیاسی استثناء تھا۔ معترف

جائزہ | اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا مدنی تحریک آزادی ہند کے پر جوش رہنما تھے اور وہ انگریز کا ہندوستان سے اقتدار ہٹانے میں پیش پیش تھے اس لئے اثنائے ملازمت میں تحریک آزادی کے لئے سیاسی اشتناے رکنا ان کے بس کی بات نہ تھی لہذا مولانا حبیب الرحمن صاحب اور اراکین مجلس شوریٰ نے ہنگامی حالات کے ماتحت حضرت مولانا مدنی کی شرائط کو منظور کر لیا۔ چنانچہ اسی اشتنا کے باعث مولانا مدنی پر سیاسیات ملکی میں حصہ لینے پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی۔ ادھر مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم اور اراکین دارالعلوم شاہ صاحب کی جگہ پر کرنے کے لئے حضرت مولانا مدنی جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو لینے پر مجبور تھے۔ اس لئے وہ بھی معذور تھے۔ ہاں افسوس یہ ہے کہ اس وقت کے اختلاف میں حضرت شاہ صاحب جیسی ہستی کو ہاتھ سے دے دینا دارالعلوم اور طلبہ کی بد قسمتی تھی۔ اگر شاہ صاحب دارالعلوم میں رہتے تو پھر صورت حالات کچھ اور ہوتی۔

علامہ عثمانی اپنی مذکورہ عبارت میں مولانا مدنی پر الزام نہیں لگاتے نظر آتے ہیں بلکہ وہ یہ فرمایا ہے ہیں کہ الناس علیٰ دین ملوکھم کے قاعدے کی بنا پر مولانا مدنی کے طلبہ اور ملازمین کو سیاسیات میں حصہ لینے سے منع کرنے اور روکنے کے باوجود ان کا اثر طلبہ اور مدرسین پر پڑا۔ چنانچہ آگے چل کر علامہ اپنے مذکورہ ۹ رجب کے اعلان میں مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم کے شرطوں کے مان لینے اور سیاسی اشتنا پر تنقید اُفراتے ہیں :-

”میں نے کسی وقت بھی دارالعلوم کے اصل مسلک و مقصد کے لحاظ سے اس عظیم التأثير اشتنا کو پسند نہیں کیا۔ نہ کبھی اس کو معقول

علامہ عثمانی کی پالیسی
دارالعلوم میں

کہا۔ لیکن نفس استثنائے خلاف اقدام کرنے میں قنہ عظیم تھا اور ماحول
ایسا پیدا ہو چکا تھا کہ کوئی آقا زاس سلسلے میں مؤثر نہ ہو سکتی تھی۔ تاہم قدرت
و مصلحت کے مطابق وقتاً فوقتاً معاملات کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش
کی گئی تاکہ دارالعلوم اپنے اصل موضوع سے قریب رہ سکے اور کسی ناقابل
تخلل مہلکہ میں نہ پھنس جائے۔ (بیان ۹ رجب ۱۳۶۲ھ)

مولانا عثمانی کی مذکورہ بالا عبارت اتنے اختصار کے باوجود اس قدر جامع
ہے کہ آپ کی صدارت استہامک کے زمانے کی پالیسی پر بہترین روشنی ڈال رہی ہے۔
پالیسی اور پولٹیکل سائنس کے ماہرین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جن حالات میں حضرت
عثمانی نے چارج لیا ان حالات میں اس سے بہتر اور پالیسی کیا ہو سکتی تھی؟
مولانا عثمانی کی مذکورہ عبارت اور مولانا مناظر احسن کی گذشتہ صفحات کی
عبارت کو ملانے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانی کی صدارت سے پہلے جو کام رک جاتے
تھے وہ رک تو نہ سکے البتہ پالیسی میں مصلحت کو پیش نظر رکھنا پڑا۔
حضرت عثمانی نے فرمایا ہے کہ قدرت و مصلحت کے مطابق وقتاً فوقتاً
معاملات کو اعتدال پر رکھنے کی انہوں نے کوشش کی ہے تاکہ دارالعلوم اپنے
اصل موضوع سے قریب رہ سکے اس کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں :-

”بہر حال میں نے دارالعلوم کی ہفت سالہ فضا میں برابر یہ سعی کی کہ ہم
دونوں (میں اور مولانا نادر) کو ایک دوسرے کا امکانی تعاون حاصل
رہے اور مولانا کے سیاسی استثنائے (جس کو میں دل سے ناپسند کرتا رہا
ہوں) مناسب حد تک غصہ بصر (نظر انداز) کیا جائے۔
..... ہاں بار بار ایسا وقت آیا ہے جبکہ سیاسی صورت حال پر خاموش
رہنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً دارالعلوم کے مکان پر جس میں حضرت مولانا نادر

کا قیام رہتا ہے کانگریسی جھنڈا نصب کیا گیا۔ یا ایک مرتبہ دارالعلوم کے بہت سے ملازم مقامی کانگریس کے باقاعدہ ممبر یا عہدہ دار بن گئے اس طرح کی چیزوں کی مناسب طریقے سے روک تھام کی گئی جن ملازمین نے دارالعلوم کے مسلک کے خلاف اپنے رویہ پر اصرار کیا (گودہ میرے ہی رکھے ہوئے تھے) ان کو معطل کیا گیا تاکہ انہوں نے باقاعدہ اس سے رجوع کر لیا۔ اس طرح کی متعدد مثالیں مسئلہ دارالعلوم میں موجود ہیں۔“

اسی بیان میں ایک اور جگہ حضرت عثمانی فرماتے ہیں :-
 ”میں بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ مولانا کے سیاسی استثنائ کو منظور کرتے وقت اس کے نتائج پر عمیق نظر نہیں ڈالی گئی۔ ایک طرف دارالعلوم کو سیاسی الجھنوں سے علیحدہ رکھنا اور دوسری جانب اس کے شیخ الحدیث کو اس سے مستثنیٰ کر دینا ممکن ہے ہنگامی طور پر محقول ہو لیکن دائمی طریقے سے اسے باقی رکھنے کے نتائج طویل تجربے کے بعد اب بالکل سانسے آچکے ہیں۔“

تبصرہ | حضرت عثمانی کی مذکورہ تحریروں پر تبصرہ کرنا سوانح نگاری حقیقت سے ہمارا فریضہ ہے اس لئے ہمارے خیال میں جو کچھ موصوف نے فرمایا ہے وہ کسی درجے تک درست ہے۔ لیکن دارالعلوم کے بزرگوں نے سیاست میں ہمیشہ حصہ لیا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے جو

لے ان ملازمین میں مولوی عبدالاحید صدیقی مرحوم ایڈیٹر نئی دنیا دہلی، مولوی محمد عثمان صاحب، مولوی سلطان الحق وغیرہ تھے۔ مصنف

خفیہ سکیم مرتب کی تھی وہ تو اپنی انتہا پر پہنچنے والی انقلابی صورت رکھتی تھی جس کے عوض انہیں مالٹا میں نظر بند رہنا پڑا۔ خلافت کے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی، مولانا سید مرتضیٰ احسن صاحب چاندپوری ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند اور خود مولانا عثمانی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ جمعیۃ العلما کی ورکنگ کمیٹی کے وہ ممتاز رکن رہے ہیں اور ان کی تقریروں سے سیاسی، ملی، مذہبی جلسہ گاہیں گونجتی رہی ہیں اس لئے اگر حضرت مولانا مدنی بھی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ لیکن مولانا عثمانی حضرت مدنی کا سیاسیات میں حصہ لینا دراصل ایک وہ دارالعلوم کے شیخ الحدیث ہوں مناسب نہیں سمجھتے۔ حضرت شیخ الہند کے معاملے میں بھی دائرۂ اہتمام و انتظام اسی اکھن میں تھا۔ دراصل کسی ادارے کی انتظامیہ کو ایسا سوچنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ملک اور قوم کے رہنما ملک اور قوم کی غلامی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اس لئے بہترین صورت یہی ہوتی ہے کہ اس قسم کے اداروں سے باہر رہ کر رہنمایاں ملت کے لئے آزادانہ سرگرمیوں کا موقع بہتر ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام اداروں کے منتظم لوگوں کا یہی طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے اداروں میں اس قسم کی سرگرمیوں کو جائز قرار نہیں دیا۔ مولانا عثمانی اپنے اسی بیان مورخہ ۹ رجب میں ان معاملات سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”بلاشبہ میں اب تک جمعیۃ العلما کی ورکنگ کمیٹی کا رکن ہوں اور اردو میری بار بار استدعا کے وکنیت سے مجھے علیحدہ نہیں کیا گیا۔ لیکن اس سیاق میں جو کچھ میری روش ہے سب جانتے ہیں۔ پھر علما کے لئے کوئی دوسرا پلیٹ فارم موجود نہیں۔ خالص مذہبی مسائل میں بھی بار بار علما کو اجتماعی آواز بلند کرنا پڑتی ہے۔ وہاں کے سیاسی مسائل میں اپنا نقطہ نظر اظہار واضح کر دیتا ہوں۔ نہ اس میں غلو ہے نہ انہماک۔ نہ میں دارالعلوم کے دینی

شیعہ سے کوئی تعلق رکھتا ہوں جو بلا ارادہ ہی طلبہ میرے تاثرات قبول کریں۔ چنانچہ اس چیز سے ہندوستان کا ہر باخبر انسان واقف ہے۔ میں نے تو یہاں تک کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ سیاست کوئی شجرہ ممنوعہ نہیں ہے جسے ہاتھ لگانا ہی ناجائز ہو بشرطیکہ اسلامیت کا رنگ غالب رہے اور ہم سرخنے کی بجائے غیروں کی دم نہ بن جائیں۔ اسی طرح کی سیاست میں ہمارے پیشروؤں نے مناسب حد تک حصہ لیا ہے مگر ساتھ ہی دارالعلوم کو سیاست عصرہ کی خطرناک کھنوں سے بچائے کی ہمیشہ کوشش کی ہے جس کی بدولت وہ بھی میری طرح مطعون نہ گئے۔“

ہمارے ذہن میں جو بعض اچھیں اکابر دیوبند اور خود حضرت عثمانی کے سیاسیات میں حصہ لینے سے متعلق تھیں وہ موصوف کی اس عبارت سے صاف ہو گئیں۔

دور خلافت اور دور کانگریس میں فرق

جس دور خلافت میں علمائے دیوبند نے حصہ لیا ہے اس میں تمام مسلمان تحریک خلافت میں متحد تھے اس لئے علمائے دیوبند کا اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینا قابل تحسین سمجھا گیا۔ لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش میں چونکہ مسلم لیگ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لئے کانگریس میں شریک علماء یا خصوصی نیشنلسٹ مسلمانوں کی شرکت مسلمانوں کی اکثریت کی نظروں میں کھٹکتی تھی اس لئے علماء دیوبند کا پہلی تحریک میں حصہ لینا قابل اعتراض نہ تھا البتہ کانگریس میں بعض حضرات کی شرکت کو گوارا نہیں رکھا گیا۔

حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا عثمانی کا تعاون

دارالعلوم کے عہد صدارت میں مولانا مدنی سے سیاسی اختلافات کے باوجود مولانا عثمانی نے ان کے ساتھ موافقت اور تعاون کی فضا کو

کبھی خراب نہیں ہونے دیا۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے وہ ارکان جو خود کانگریس کے مخالف تھے اور مولانا مدنی کی کانگریس میں شرکت کے مخالف تھے وہ کسی وقت بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جیسا کہ مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے اپنے ہفت سالہ صدارت کے دور میں یہ امکانی کوشش کی کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا امکانی تعاون حاصل رہے اور مولانا مدنی کے سیاسی استثناء سے جس کو میں دل سے ناپسند کرتا تھا مناسب حد تک چشم پوشی کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے چشم پوشی کی اور ان سے تعلقات کو دوسروں کی شر کے باوجود بگاڑنا ہرگز پسند نہیں فرمایا جو غایت درجے کی دوراندیشی تھی۔ اپنے ہر رجب کے بیان میں عثمانی لکھتے ہیں :-

”مولانا مدنی سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ ان کی عزت آبرو جماعت کی عزت و آبرو ہے۔ وہ تو مشہور ترین عالم ہیں کسی عالم کی توہین و تضحیک بھی ہمارے لئے تکلیف دہ ہے۔ گو نظریاتی اختلاف رائے ہو مگر طبقہ علماء کی عظمت و وقار پر کوئی رکبک حملہ ہونے کی صورت میں اپنی قدرت کے موافق کچھ نہ کچھ مداخلت کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔“

مثلاً ۱۳۵۳ھ میں حاجی داؤد ہاشم رنگونی نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی سرپرستی کی تائید کرتے ہوئے مولانا مدنی اور دوسرے کانگریسی خیال کے ممبروں کو گاندھی اور کانگریس کا متبع لکھا تھا جس کے جواب میں مولانا عثمانی نے اپنے مکتوب ۴/ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ میں لکھا تھا :-

”کسی بزرگ (حضرت تھانوی) کی عقیدت کے جوش میں اس طرح کا غلو ہرگز پسندیدہ نہیں کہ ان کے علاوہ اپنی ہی جماعت کی دوسری برگزیدہ سنیوں میں سے کسی پر اعتماد باقی نہ رہے۔ میں ازراہ اخوت اسلامی ضرور مشورہ

دوں گاکہ معاملات میں اس طرح کے غلو اور تعمق سے احتراز کرنا چاہئے۔

(ضمیمہ رسالہ ہنامہ دارالعلوم جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ ۱۳۲۸ھ ص ۱۷)

یہی وہ مدافعت ہے جو مولانا عثمانی نے مولانا مدنی کے لئے کی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ مولانا مدنی کی سیاسی پالیسی سے مجلس شوریٰ کے بعض ممبر سخت مخالف تھے۔

مولانا عثمانی کی دارالعلوم میں حکمت عملی کا اب تک خلاصہ یہ ہے :

۱۔ انہوں نے جب صدارت کا چارج لیا تو دارالعلوم میں غیر شعوری طور پر سیاست متحدہ کا اثر تھا۔

۲۔ انہوں نے حتی الامکان ہر کسی کو ایسے سیاسی غلو و انہماک سے روکا جو مدرسے کے لئے ہلاکت آفریں ہو۔

۳۔ وہ دل سے مولانا مدنی کی گانگریسی سیاسی سرگرمیوں کے مخالف تھے لیکن وہ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ باہمی آویزش اور کشمکش کا مظاہرہ کیا جائے۔ بلکہ حتی الامکان ان کی مناسب حد تک سیاسی سرگرمیوں سے چشم پوشی فرماتے رہے۔

راقم الحروف نے بحیثیت سوانح نگار مذکورہ بالا حوالوں سے جو کچھ پیش کیا ہے ان کے پیش نظر مولانا عثمانی کا رویہ بے داغ نظر آتا ہے۔ وہ

حضرت مولانا تھانویؒ کا سرپرستی دارالعلوم سے استعفاء

ظاہری طور پر مولانا مدنی سے بگاڑ نا بھی پسند نہیں فرماتے تھے اور کسی کے اکسانے پر بھی کان دھرنا پسند نہ کرتے تھے۔ وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی کے بھی مؤید تھے اور اکابر میں اتحاد کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ جب کانگریسی خیال ارکان نے ان کی سرپرستی کو چیلنج کیا تو مولانا تھانوی

نے استعفا دے دیا۔ واضح رہے کہ دارالعلوم دیوبند کے عالم وجود میں آنے کے بعد سے کوئی نہ کوئی بزرگ اس کا سرپرست رہا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب، حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب، رحمہم اللہ، کے بعد حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سرپرست تھے۔ سرپرست بعینہ وہی عہدہ ہے جو یونیورسٹیوں میں چانسلر کا عہدہ ہوتا ہے۔ ہاں تو مولانا عثمانی نے حضرت تھانوی کو جو خط ان کے استعفا کے بعد لکھا وہ حسب ذیل ہے:-

مکتوب عثمانی

بِسْمِ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

بخدمت سراپا برکت مخدوم و مطارع بندہ حضرت مولانا صاحب

دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون نیاز مشحون معروض آنکہ۔ حضرت والائے رخصت ہو کر آج

تک عریضہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی یہاں آگر کچھ بیمار رہا پھر مشاغل درس و

تالیف سے فرصت نہ ملی۔ امید ہے کہ حضرت کا مزاج بخیریت ہوگا۔

جو تجویز دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی کے متعلق حضرت کے سامنے قرار

پائی تھی اس پر دستخط ہونے میں خلاف توقع دیر ہو گئی۔ اب تقریباً آٹھ دس

روز ہوئے شیخ رشید احمد صاحب نے دستخط کر کے واپس فرمائی ہے۔ چونکہ اب

دونوں طرف سے دستخط ہو کر تحریر میرے پاس آگئی تھی میں نے اعلان اجماع

اطلاع کے طور پر فضا کو قدرے پرکھ کر بنانے کے لئے بعض اخبارات میں
 بھیج دیا جو غالباً عنقریب ملاحظہ سامی سے گزرے گا۔ لیکن کل غیر متوقع طور
 پر بعض خطوط سے حضرت والا کے استغنے کا حال معلوم ہوا جس سے تمام
 امیدوں کا خون ہو گیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت کی علحدگی خوشی
 سے برداشت کی جائے۔ میں فوراً حاضر ہو کر اپنے اور جماعت دیوبند کے
 جذبات زبانی عرض کرتا لیکن آج کل صبح بخاری کے درس سے بالکل فرصت
 نہیں۔ امتحان قریب ہے اور کتاب کا ختم کرنا امتحان سے قبل ضروری
 ہے۔ سر دست اپنے قدیم نیاز مندانہ اور عقیدہ مندانہ روابط کی بنا پر پوری
 قوت کے ساتھ استدعا ہے کہ حضرت استغنا کی اشاعت میں جلدی فرمائیں
 کم از کم مجلس شوریٰ کا انتظار فرمائیں۔ اور یہ خادم بھی ۱۲ شعبان تک
 انشاء اللہ دیوبند پہنچے گا۔ میری زبانی عرض معروض کے بعد جو رائے قائم
 فرماتیں حضرت بہر حال مختار ہیں۔ تجویز معبود کے بعد حضرت کی سرپرستی
 اور اس کی نوعیت کے متعلق کوئی اختلاف طرفین سے باقی نہیں ہے۔ والسلام
 از ڈاٹھیل ضلع سورت (گجرات)

۱۵ رجب ۱۳۵۲ھ

(مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء مہر لفاذ)

مکتوب حضرت حکیم الامتہ بجا اب علامہ عثمانی

از اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مشفق مکرمی دامت فیوضہم

یاد آوری سے ممنون و مسرور ہوا۔ میں تو قلب سے تعلق کو کافی سمجھتا

ہوں گو خط یا ملاقات میں ظاہری دیری ہو۔ آپ نے جو کچھ دارالعلوم کی مصلحت اور میری محبت سے تحریر فرمایا ہے سراسر صواب ہے۔ اس پر عمل عین نفع تھا لیکن میں اعذار قویہ سے معذور ہوں۔ ان سب کا حامل یہ ہے کہ اس صلح کے بعد جو واقعات جماعت مصلحین کی طرف سے پیش آئے اور آ رہے ہیں ان سے بدالالت غیر مشتبہ واضح ہوتا ہے کہ جو صلح مطلوب کی گئی ہے وہ محض لفظی صلح ہے۔ جیسے نزاع لفظی نزاع نہیں ہے اسی طرح صلح لفظی صلح نہیں۔ ان مصلحین کی نیت ہی اشتراک عمل نہیں ہے بلکہ محض اپنا انفراد استبداد (ہے)۔ پھر افراد کا بھی مضائقہ نہ تھا اگر بزرگوں کے مسلک پر کام ہوتا۔ میں تو علم الیقین نے بڑھ کر عین الیقین سے دیکھتا ہوں کہ کانگریسی مسلک کی روح مدر سے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ تو مصلحین کی حالت ہے۔ اب رہ گئی دوسری جماعت جس کا لقب مصلحین مناسب ہے ان کی یہ حالت ہے کہ وہ کچھ ضعف کے سبب اور کچھ حسن ظن کے سبب ان کے اتباع و موافقت ہی میں اپنی خیر سمجھتے ہیں۔ ضعف کی یہ حالت کہ جو تجویز مصالح دارالعلوم کے لئے ہوتی ہے اس پر عمل کریں نہ رائے بدلنے کی اطلاع کریں۔ ہر وقت مصلحین کی ارضاء کی فکر میں سرگرم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو دو چار مصلحین قوی الحزم ہیں ان کے ہاتھ میں کام ہی نہیں وہ بدردل ہوتے جاتے ہیں۔ جب موافقین کی یہ حالت اور محضین کی وہ حالت تو بے چارہ مسکین سرپرست بجز سلامت برکنا راست کے کیا تجویز کرے۔ جتنا آپ نے اپنی محبت سے اس علمدگی پر تاسف فرمایا دوسری جماعت نے تو اس سے عشر بھی نہ کچھ کیا۔ بلکہ واقعات سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کو اپنے لئے نعمت و غنیمت سمجھا۔ اور اگر اس وقت

اس سے کوئی امر مانع تھا تو جیسے آپ نے محبت سے لکھا ہے کہ تیری علیحدگی خوشی سے گوارا نہیں کی جاسکتی اسی جلسے میں معلوم ہو جائے گا کہ اس جماعت میں سے کون کون اس خیال کے ہیں اور مجھ سے کیا کہتے ہیں۔ یہ تو اب بھی ان کے اختیار میں ہے۔ میں نے حلف تو نہیں کیا۔ جیسے پہلے استعفا کو واپس لے لیا اب بھی ممکن ہے مگر میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ اور اگر الفاظ کا استعمال بھی کیا (تو) آپ ہی وجدان سے فیصلہ کر لیجئے گا کہ الفاظ محض ہیں یا معنی سے بھی قرین ہیں اور مجھ کو جلسے کا انتظار کرنا بظاہر مصلحت تھا مگر بعد تا مل اس انتظار میں اس مصلحت سے بڑھ کر ایک مفسدہ بھی تھا مجھ کو اسی کے مقتضا پر عمل کرنا راجح معلوم ہوا وہ یہ کہ اگر اس وقت کثرت رائے سے جیسا کہ مصلحین نے کثرت حاصل کر لی ہے میری علیحدگی (اور غلامی کی سرپرستی بھی علیحدگی ہی کے مراد ہے) طے ہو جاتی تو کیا ذلت نہ تھی اور بلا ضرورت میں اس ذلت کو کیوں گوارا کرتاؤں اگر فرضا آزادی ہی کی سرپرستی باوجود مخالفت مصلحین کے کسی طرح کرائی جاتی اور خدا نہ کرے دارالعلوم میں کسی اور درجہ سے آمدنی میں قلت ہوتی جیسا چند روز میں ہو رہا ہے تو یہ جماعت ابھی سے کہہ رہی ہے کہ ایسی آزاد سرپرستی پبلک کے خلاف ہے اور اس لئے مدرسہ میں چند کم ہوتا جاتا ہے تو اس وقت زیادہ کہتے تو ہیں اپنے سرپر بدنامی کیوں لوں۔ اب استعفا دے کر میں نے میدان خالی کر دیا ہے۔ اگر جلسے میں کوئی فیصلہ متفقہ ہو گیا اور میرے نزدیک بھی خلاف مصلحت نہ ہوا میں پھر خادموں اور اگر اختلاف رہا تو میں مسئلہ مختلف فیہا بنانا نہیں چاہتا۔ یا مختلف فیہ میں اجماعت نہ ہوا لیکن میرا اختلاف ہوا تب بھی وہی معذوری۔ تطویل کلام معاف کیجئے حبیب منیٰ طلب اپنا ہمدرد

ہوتا ہے تو فریاد طویل ہو جاتی ہے۔ اب تو یہی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مدد
کی خیر کرے جس میں ہو۔ میرے تعلق میں ہو یا علیحدگی میں والسلام۔

از تھانہ بھون ۱۷ رجب ۱۳۵۷ھ (مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

مذکورہ بالا مکتوب گرامی از حکیم الامت تھانوی بنام علامہ عثمانی

تبصرہ

۱۷ رجب کا ہے اور ڈاکخانے کی مہر کے مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء

کو روانہ ہو کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ڈاکبیل مولانا عثمانی کے پاس پہنچا ہے۔

حضرت حکیم الامت کا گرامی نامہ واضح کر رہا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس
شوریٰ کے کئے ایک ممبر حضرت تھانوی کی سرپرستی کو دارالعلوم سے ہٹانا منجملہ دیگر
اصلاحات کے ایک اصلاح کے ماتحت مناسب سمجھتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ
مجلس شوریٰ میں ایسے عناصر کا غلبہ ہے جو ملکی سیاسیات میں کانگریسی خیالات کے
ہیں۔ مولانا تھانوی کو یہ خطرہ درپیش تھا کہ وہ اس سے پہلے کہ مجھے سرپرستی سے عہدہ
کر دیں مناسب یہ ہے کہ میں ہی استعفا دے دوں۔ چنانچہ انہوں نے استعفا دیدیا
علامہ عثمانی ان کو سرپرستی پر فائز دیکھنے کے مقصد میں اور یہ چاہتے ہیں کہ مصلحین کے
ساتھ بات چیت کر کے پھر حضرت تھانوی سے کوئی مذاکرہ کریں اور اس سے پہلے موضوع
استعفا نہ دیں۔ حضرت تھانوی نے پہلے استعفا دینے کی مصلحتیں بیان فرمائی ہیں
اور یہ بھی فرمایا ہے کہ سرپرست میرا استعفا دینا ہی مناسب ہے لیکن اگر وہ جماعت
میری سرپرستی کی خواہشمند ہوگی تو مجھے استعفا والہیں لینے میں کوئی عہدہ نہیں۔

خواہ کچھ بھی ہو علامہ عثمانی اس خصوص میں دونوں کو ملا لٹا چاہتے ہیں یعنی مصلحین
اور سرپرست میں تعاون اور توافق کی راہ تلاش کرنے کی فکر میں ہیں اور ان کا یہ
رول ادا کرنا بہترین تدبیر پر دلالت کرتا ہے۔

ان خطوط سے آپ کو یقیناً شبہ ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم کی پالیسی میں کانگریس

کامیابی غفر کیا اس لئے غالب ہو چلا تھا کہ دارالعلوم کا سیاسی مسلک کانگریس سے متفق تھا اس سلسلے میں ہم مختصراً اس حقیقت سے نقاب اٹھانا چاہتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا کانگریس

کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے کانگریس کا بھرپور ساتھ دیا۔ لوگوں کے یہ ریا کس میرے دل کو کچھ کے لگاتے ہیں۔ اسلامیہ کالج لائپزور میں جہاں میں آج کل بحیثیت پروفیسر کام کر رہا ہوں، پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو پولیٹیکل سائنس کی سوسائٹی کی طرف سے دعوت دی گئی انہوں نے کالج میں نظریہ پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے برسرِ لب کہا :-

”حیرانی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث نے پاکستان کی مخالفت میں سرچوٹی کا زور لگا دیا جس کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی“

جب وہ تقریر کر چکے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے سیاسی افکار کو دارالعلوم دیوبند کی طرف جو نسبت دی ہے اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم پاکستان کے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا بھی ذکر ان الفاظ میں کر کے منصف شعاری کا ثبوت دینا تھا اور یوں کہنا تھا کہ :-

”حضرت مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

کے برعکس حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نظریہ پاکستان اور مسلم لیگ کو بھرپور حمایت کی کہ پاکستان کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور ان کی لیگ میں شرکت اور پاکستان کی حمایت

نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں مسلمانوں کے اندر جوش بھر دیا اور
 شرعی حیثیت سے خصوصاً اور سیاسی حیثیت سے عموماً قائد اعظم کی گاڑی
 جہاں رکتی نظر آتی تھی وہاں مولانا شبیر احمد صاحب نے اس کو آگے رلا
 دواں کیا۔

میری اس بواجبی تقریر سے پروفیسر صاحب مذکور پر خاصہ اثر پڑا اور انہوں
 نے میری بات کو تسلیم کر لیا۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ پاکستانی عوام و خواص میں
 یہ پروپیگنڈہ اثر کر چکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کانگریس کا ہمنوا اور مسلم لیگ کا
 مخالف تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا سیاسی مسلک

جیسا کہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے فرمایا اور آپ نے
 گذشتہ سطور میں پڑھا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں نے دارالعلوم دیوبند میں
 حتی الامکان کانگریس کے اثر کو روکنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش بھی کی ہے
 کہ دارالعلوم دیوبند اپنے مسلک سے ہٹنے نہ پائے اس سے واضح ہوتا ہے کہ
 دارالعلوم دیوبند کا سیاسی مسلک کانگریس کی تائید پر گزرتھا بلکہ یہ انفرادی
 رائے تھی جس کا اثر متاثرین میں نمودار ہوا۔

اس کے برعکس حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سرپرست
 دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید امجد حسین صاحب، حضرت مولانا رسول
 خان صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند،
 حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع
 صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدرس دارالعلوم

دیوبند، مولانا محمد طاہر صاحب برادر خور و مولانا محمد طیب صاحب وغیرہم اور کتنے ہی ارکان مجلس شوریٰ مسلم لیگی تھے۔ اور حضرت تھانوی اور حضرت عثمانی سے عقیدت رکھنے والے سب ہی مسلم لیگ کا دم بھرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب چونکہ مہتمم تھے اس لئے انہوں نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں اپنے سیاسی افکار کا قطعاً اظہار نہیں فرمایا لیکن وہ خلیفہ روحانی ہیں حضرت مولانا تھانوی کے اور مولانا تھانوی کا کوئی عقیدہ مند، مرید اور خلیفہ ہانگر کسی نہیں ہو سکتا۔ مولانا محمد طیب صاحب ایک بے ضرر، سادہ طبع اور مسلمانوں کے حد سے زیادہ ہمدرد انسان ہیں۔ دوسری طرف ان کے کسی اشارے میں بھارت بن رہتے ہوئے وہاں کی حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں نکلتی۔ نہایت اعتدال پسند، استقامت پذیر اور سلیم الطبع شخصیت کے مالک ہیں جن کی نظیر امت مسلمہ کے موجودہ دور میں بعض حضرات کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ملنی مشکل ہے۔ پاکستان میں جو حضرات علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اور حضرت تھانویؒ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کا مسلک آج بھی منظرِ پاکستان کی بنیاد ہے۔

میں اس کتاب کا مصنف نظریہ پاکستان کا زبردست حامی اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے جان نثار شاگردوں اور عقیدہ مندوں میں سے ہوتے ہوئے

حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا احترام

، بنجر حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حلیل القدر عالم اور ہم المرتبہ روحانی شخصیت خیال کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شان، گستاخی عاقبت کی خرابی کا موجب ہو سکتی ہے۔

مولانا مدنی رحمہ اللہ کا سیاسی تصور اور مسلم لیگ سے اختلاف

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کو لیگ سے اس لئے اختلاف تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ لیگ میں کتنے ہی ہنرمند وہ ہیں جو گورنمنٹ برطانیہ کے خطابات یافتہ ہیں اور ان سے ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد

کی توقع غلط ہے چنانچہ اپنے مکتوبات میں انہوں نے ان امور کی صراحت فرمائی ہے۔ لیکن مسلم لیگ اب وہ جماعت نہ تھی۔ اس کے امیر اب قائد اعظم تھے جو بے لوث آدمی تھے۔ بہر حال مولانا انہی تصورات کے ماتحت لیگ کے موافق نہ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے خلاف پروپیگنڈہ اور علامہ عثمانی کا دفاع

ہم وہاں سے چلے تھے جس میں ان حالات کی وضاحت کی جارہی تھی کہ جب علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے دارالعلوم دیوبند کے وائس چانسلر کی حیثیت

سے چارج لیا تو دارالعلوم کی فضا کیا تھی۔ مولانا مدنی کے متعلق اخبارات میں جو مخالفانہ مضامین نکلتے تھے جن سے دارالعلوم دیوبند مسموم ہو رہا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ کوئی عالم مسلم لیگ کے ساتھ نہیں ہے۔ اخبار ”عصر جدید“ کلکتہ کے ایڈیٹر نے مولانا عثمانی کے سیاسی افکار کے متعلق جب ایک خط کے ذریعہ معلومات چاہیں تو آپ نے اس کے ایڈیٹر کو حسب ذیل مکتوب لکھ کر روانہ کیا جو عصر جدید میں شائع ہوا اور عصر جدید سے ”طلوع اسلام“ نے اپنی شعبان ۱۳۵۸ھ مطابقت اکتوبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں ”عصر جدید“ سے نقل کیا ہے۔ ہم نے یہ مکتوب طلوع اسلام کے مذکورہ پرچے سے اس نوٹ سمیت نقل کیا ہے جو طلوع اسلام نے اول میں لکھا ہے۔

واضح رہے کہ طلوع اسلام اس زمانے میں دہلی سے نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر اس دور میں ظہیر الدین صاحب صدیقی تھے۔ مولانا عثمانی کا یہ خط ۲۳ رجب ۱۳۵۸ھ

کو لکھا ہوا ہے جبکہ آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔ مکتوب یہ ہے۔

حق و صداقت کی راہ

اخبارات میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ ناظم دارالعلوم دیوبند و صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت کا ایک مکتوب گرامی شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ موجودہ سیاسی کشمکش میں مسلمانوں کے لئے صحیح راہ عمل کونسی ہے۔ ہم اس مکتوب کو جریدہ عصر کے عصر جدید (کلکتہ) کے شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ وہ حضرات جو کہا کرتے ہیں کہ کوئی مقتدر عالم دین شرکتِ کانگریس کے مسلک کی مخالفت نہیں کرتا عوام کو دھوکے میں مبتلا نہ کر سکیں۔ (طلوع اسلام)

مولانا عثمانی صاحب کا مکتوب گرامی

سکرمی ایڈیٹر صاحب عصر جدید

بعد سلام مستون آنکہ آپ نے شرکت کانگریس کے متعلق میرے خیالات دریافت کئے ہیں اس مسئلے کے متعلق میں اپنے خیالات کا اعلان پہلے بھی کر چکا ہوں اب پھر لکھتا ہوں کہ میں نہ کبھی کانگریس میں شامل ہوا اور نہ اب شامل ہوں بلکہ اس شمول پر میں نے کانگریسی علماء سے کئی دن تک بہت شد و مد سے بحث کی جس کا تذکرہ اخبارات میں آچکا ہے۔ قومیت متحدہ کا نظریہ جو کانگریس کے دستور اساسی کا بنیادی پتھر ہے اس معنی میں جو

کانگریس کے ائمہ اس سے ارادہ کرتے ہیں میرے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے کبھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔

میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں نہ سیاسیات میں کوئی خاص اشتغال رکھتا ہوں تاہم اپنی قوم کے سود و بہبود کو سوچنا اس کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے میرے لئے بھی ناگزیر ہے۔ جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے لئے سب سے پہلے ایک اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے اس کے بدون کسی نام نہاد قومیت متحدہ کے تیز رو دھاک میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے کو ڈال دینا خود کشی کے مرادف ہے۔

مسلمان دوسری قوموں سے صلح کر سکتے ہیں عہد و بیان کر سکتے ہیں، بہت سے امور میں تعاون اور اشتراک عمل کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنی ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کر سکتے۔ میں اپنے لئے فرقہ پرست کا خطاب پسند کرتا ہوں مگر اپنی قوم کا غدار یا قوم فروش کہلانا کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ شاعر حکیم اکبر مرحوم (الہ آبادی) نے خوب کہا ہے۔

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی

لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو گناہی بھلی

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو

دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

پختہ ہو کر اپنی شاخ و بن سے ہوتا ہے جڑا

اے شہر چشم محبت میں تری خامی بھلی

اس کے ساتھ میرا عقیدہ ہے کہ ہماری ناکامی و نامرادی کا اصل

سبب شریعت کا ملہ محمدیہ کے اصول و احکام سے اعراض و انحراف ہے

اور اسی کے نتیجے میں اس تخریب و تفریق کا عذاب ہم پر مسلط ہے جس کی طرف

کہہ دیجئے کہ وہ اللہ اس بات پر قہر
دکھتا ہے کہ وہ تمہارے اوپر سے یا
تمہارے نیچے سے تم پر عذاب
بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کرے
اور بعض کو بعض سے تکلیف
پہنچائے ۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ اَنْ
يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ
قَبْلِكُمْ اَوْ مِّنْ تَحْتِ
اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبَسَكُمْ
سُيُوعًا وَيَذِيقُ بَاسَكُمْ
بِاْسٍ بَعْضٍ

میں ارشاد فرمایا گیا ہے ۔ اس لئے میرا سب سے بڑا مطلع نظریہ ہے
کہ جہاں تک استطاعت میں ہو مسلمانوں کو اتباع شریعت و تمسک اسوۃ
النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کیا جائے نیز ان کی پارٹی بندیوں
کو اگر بالکل ختم نہ کیا جاسکے تو ان کو کم کرنے اور ایک کو دوسرے کے
قرب لانے اور خلاف و شقاق کے مضار کو محدود کر دینے کی سعی جاری
رہے ۔ رہا دارالعلوم دیوبند کا معاملہ جیسا کہ پہلے بھی بار بار اعلان
کیا جا چکا ہے وہ مسلمانان ہند کی ایک محبوب اور مشترک متاع ہے
سیاسی پارٹی بندیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہی وہ مسلک ہے
جو میرے زمانے میں مجلس عاملہ دارالعلوم نے بالاتفاق طے کیا ہے
اور دارالعلوم کے تمام ملازمین و مدرسین کو سختی کے ساتھ اس کا پابند
کیا جو خبریں اس کے خلاف شائع کی جا رہی ہیں بعض بالکل بے اہل اور بعض سخت
مبالغہ آمیز ہیں ۔

راقم شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

اس مکتوب سے صاف واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے زمانے میں جبکہ وہ صدر مہتمم تھے اور یہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۳ء تک کا زمانہ ہے علامہ عثمانی نے کانگریسی پالیسی کو دارالعلوم سے قطعاً دور رکھا اور یہی سلک دارالعلوم کی مجلس عاملہ کا طے پایا۔ چنانچہ بقول مولانا عثمانی تمام ملازمین و مدرسین کو کانگریسی فضا سے دور رکھنے کی سختی سے کوشش کی گئی۔ علامہ عثمانی کے مذکورہ بالا مکتوب کو طلوع اسلام نے شائع کرنے کے بعد مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی کانگریس میں شرکت کے بارے میں درانحالیکہ وہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے دریافت کیا۔ اس سوال کے جواب میں علامہ عثمانی نے طلوع اسلام کے مدیر کو جو مکتوب ارسال فرمایا وہ آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ یہ مکتوب علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے ۱۰ اررمضان المبارک ۱۳۵۸ھ مطابق نومبر ۱۹۳۹ء کو دیوبند سے روانہ فرمایا جبکہ آپ ابھی جامعہ اسلامیہ ڈاکٹر اجمیل کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس اور دارالعلوم کے اعزازی صدر مہتمم تھے۔ ان دنوں علامہ رمضان المبارک کی تعطیل دیوبند میں گزار رہے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے انتظامات میں مصروف تھے۔ بحیثیت صدر مہتمم مولانا عثمانی نے اپنی اور دارالعلوم دیوبند کی پوزیشن واضح کرنے کے لئے یہ مکتوب "طلوع اسلام" کے ایڈیٹر کو لکھا جو انہوں نے طلوع اسلام میں اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق شعبان ۱۳۵۸ھ ۳۵ پر شائع کیا۔

دارالعلوم دیوبند مولانا حسین احمد صاحب

مکتوب علامہ عثمانی بنابر مدیر طلوع اسلام

جناب مکرم مدیر صاحب طلوع اسلام دامت مکارمہم

بعد سلام مسنون آنکہ شعبان المعظم (۱۳۵۸ ھ) کے طلوع اسلام میں میرا ایک مکتوب عصر جدید (کلکتہ) سے نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی شرکت کانگریس کی نسبت سوال کیا گیا ہے جو بالکل قدرتی طور پر کیا جانا چاہئے تھا لیکن پہلے اس کا اعلان یہاں سے متعدد بار کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا ممدوح کی ذات کی استثنا ان شروط کی بنا پر ہے جو اب سے تیرہ چودہ سال پہلے وہ اپنے تقرر کے وقت دارالعلوم کے ارباب اقتدار سے طے کر چکے تھے۔ وہ زمانہ جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمن صاحب کے اہتمام اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی کا تھا۔ پھر مہتممین مرحومین کی وفات کے بعد ان شروط کی تجدید مولانا محمد حبیب صاحب کے عہد اہتمام میں ہوئی۔

حضرت مولانا سید النور شاہ صاحب مرحوم کی صدارت تدریس سے علمی زندگی کے بعد غالباً دارالعلوم کے ارباب اہتمام کے نزدیک کوئی ہستی مولانا حسین احمد صاحب سے زیادہ اس عظیم الشان علمی مسند کو زینت دینے کے لئے موجود نہ تھی یا تاکہ نہ آسکتی تھی اس لئے انہوں نے مولانا ممدوح کی ممتاز و کارآمد شخصیت اور ان کے کمالات و محاسن

کے مقابلے میں دارالعلوم کے عام معمول اور مسئلہ پالیسی سے قدرے
اغماض برتنے کو جائز سمجھا۔ اور ایک کلی منفعت کی خاطر جزئی مفرت
کی پرواہ نہیں کی۔ اس نظریہ کے ماتحت آج ان کا یہ استثناء
قائم ہے۔

فی الحقیقت کسی خاص شخص کو خصوصی حالات کی بنا پر کس حد تک
عام قواعد و ضوابط سے مستثنیٰ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف مجلس
اعلیٰٰ تشویر اہیہ دارالعلوم کو حاصل ہے اور وہی اس سلسلے میں مخاطب
بن سکتی ہے۔ (طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۳۹ء شعبان ۱۳۵۸ھ ص ۳۸)

والسلام

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از دیوبند بہار پور

۱۰ شعبان ۱۳۵۸ھ (مطابق اکتوبر ۱۹۳۹ء)

علامہ کا یہ تاریخی مکتوب نہایت محتاط انداز میں لکھا ہوا ہے۔ علامہ کو بتانا
یہ مقصود ہے کہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں جب کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ
صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب، مفتی عزیز الرحمن صاحب اور دیگر اساتذہ
دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے تھے اور وہاں جامعہ اسلامیہ قائم کیا گیا تو مولانا
حبیب الرحمن صاحب عثمانی نے اپنی سیاسی مصلحت کی خاطر حضرت مولانا حسین احمد
صاحب مدنی کو دارالعلوم کی مسند درس حدیث پر بٹھا دیا تھا۔ اس وقت
مولانا مدنی نے یہ شرط لگائی تھی کہ میں اس شرط پر یہ تقریر قبول کرتا ہوں کہ مجھے
سیاسی امور میں مستثنیٰ رکھا جائے۔ چنانچہ اس وقت کی مجلس شورائی انٹس شرط کو

قبول کر لیا تھا۔ لہذا یہ استثنا اسی وقت سے چلا آ رہا ہے۔ جس کی ذمہ داری اس وقت کی انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے یا جو اب یہی موجودہ مجلس منتظمہ اور ارکان مدرسہ پر لازم آتی ہے۔

آپ کو واضح رہنا چاہئے کہ حضرت مولانا مدنیؒ ایک شیر اور اس کا ازالہ دارالعلوم کی طرف سے کانگریس کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے بلکہ جمعیتہ العلماء ہند دہلی کے صدر اور ممبر ہونے کی حیثیت سے کر رہے تھے۔



علامہ کا دیوبند میں مستقل قیام

خدا خیر کرے

ہم یہ مضمون لیکر چلے تھے کہ علامہ نے جب دارالعلوم دیوبند کی صدارت اہتمام کا چارج لیا تھا تو اس وقت فضا کیا تھی۔ تاہم وہ حکمت عملی سے کام کر رہے تھے علامہ ابھی تک دونوں جگہ کام کر رہے تھے۔ مگر آپ کا ڈابھیل میں قیام اور دارالعلوم کا دور بیٹھے انتظام دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے کئی ممبروں کی نظروں میں کھٹکتا رہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ موصوف ڈابھیل کو خیر باد اور خدا حافظ کہہ کر دیوبند میں مستقل قیام فرمائیں۔ چنانچہ مجلس شوریٰ کے رکن مولینا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:-

”افسوس ہے کہ ڈابھیل کی صدر مدرس کی وجہ سے دیوبند میں آپ کا بہت کم وقت گزرتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ کسی طرح ان کو دیوبند میں زیادہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔“ (الفرقان صفر ۱۳۵۸ھ ص ۳۵)

لیکن راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ وہ دور سے ہی دارالعلوم کی خدمت کرتے اور ڈابھیل کے تعلق کو نہ چھوڑتے تو بہتر تھا۔ لیکن نوشتہ تقدیر کے سامنے آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔ علامہ کو دارالعلوم کی صدارت سنبھالنے اب چھ سال ہو چکے تھے کہ ارباب حل و عقد کے اصرار پر ۱۳۶۱ھ میں آپ نے ڈابھیل سے رخصت سفر باندھا اور اپنے وطن دیوبند میں مستقل قیام کا خیمہ گاڑا۔ استاذ محترم مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے جو ڈابھیل کے مدرسین میں سے تھے اور دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل گئے تھے قیام پاکستان کے بعد اشرفیہ نیلا گنبد لاہور کے جلسے میں مجھے سے

فرمایا کہ ہم نے مولانا عثمانی کو دیوبند جانے سے منع کیا تھا لیکن حالات نے مجبور کر کے اسی طرح جس طرح حضرت امام حسین کو کر بلا لایا سچایا تھا انہیں دیوبند پہنچا دیا۔

انوار! بھلا حضرت عثمانی صرف مہتمم بن کر مہجائیں جبکہ ساری عمر محققوں کی طرح تقریروں اور تحقیقوں میں عمر گزارنے کے عادی ہوں، ناممکن سی بات تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کو شیخ التفسیر بھی بنادیا جاتا اور اس چشمہ فیض کا فیض طلبہ کو پہنچانے کے لئے درس تفسیر کی خدمت بھی ان کے سپرد کر دی جاتی تاکہ وہ بنجارات نکلتے رہتے جو علم و فضل کے ان کے دل و دماغ میں اٹھتے بہتے تھے۔ آپ ہی سوچئے کہ ایک ماہر ڈاکٹر کو اگر کسی دفتر کا انسپکٹر بنادیا جائے اور اس کی تمام طبی مہارتوں کو ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا جائے تو آخر وہ مہارتیں ڈبے ہی کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل پڑیں گی۔ اسی طرح حضرت علامہ عثمانی جیسے گویا اور مقرر و معلم کو صدر مہتمم بنا کر صرف یہ لکھنے کے لئے کہ فلاں لڑکے کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔ فلاں ملازم کو ترقی دیدی جائے، ابا نئے قدیم کی سوسائٹی قائم کر دی جائے غیر فطری چیز تھی۔ دارالعلوم میں رہتے ہوئے ایسے محقق کے چشمہ فیض سے فیضیاب نہونا طلبہ کی سب سے بڑی قسمتی تھی۔ چنانچہ پیاسوں کو پیاس بجھانے کے لئے چشمہ شیریں کے پاس جانا ہی پڑتا ہے بقول شیخ سعدیؒ

ہر کجا چشمہ بود شیریں بوی مرغ و مور گرد آئیند
کس نہ بیند کہ تشنگاں حجاز بلب آب شور گر آسیند

آخر عثمانی جیسے علامہ میں کوئی بات ہی تو تھی جن کے فیض سے ہر شخص کتاب کرنا چاہتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے مقوموں ”حاطہ دارالعلوم میں جیتے ہوئے دن“ میں لکھتے ہیں :-

” یوں استاذ ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم کے ان سلسلے اساتذہ کے ساتھ تلمذ کی نسبت اس فقیر کو حال ہے۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ حضرت کشمیری (مولانا محمد انور شاہ صاحب) مولانا (محمود صاحب) شیخ الہند اور مولانا شبیر احمد نور اللہ قبور ہم سے متمتع کے جو مواقع میسر آئے دوسرے اساتذہ کے متعلق دعویٰ نہیں کر سکتا؟ (رسالہ دارالعلوم دیوبند رمضان ۱۳۵۲ھ)

دارالعلوم میں درس قرآن | اسی لئے علم کے پیارے طلبہ صدارتِ اہتمام کے زمانے میں اس علم کے سمندر کے پاس پہنچے اور حضرت

عثمانی سے درس قرآن کے لئے اصرار ہی نہیں بے حد اصرار کیا۔ ان طلبہ میں مولوی فضل منان پشاور، مولوی ضیاء الحسن لدھیانوی وغیرہ پیش پیش تھے طلبہ کے بے حد اصرار پر علامہ نے اوپر کے دارالحدیث میں درس قرآن شروع فرمایا۔ یہ ۱۳۶۱ھ کی بات ہے۔ درس میں شریک ہونے والوں اور آنکھوں سے دیکھنے والوں میں سے دارالعلوم دیوبند کے ایک ثقہ راوی مولانا سید محبوب رضوی مصنف تاریخ دیوبند کا مجھ سے بیان ہے کہ:-

”درس کی اس قدر مقبولیت ہوئی کہ تمام دارالحدیث اور دارالافتاء کی گیلریاں کچی کچ بھر جاتی تھیں۔ نہ صرف تمام طلبہ بلکہ شہر کے آدمی بھی اس میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے“

علامہ عثمانی کے نام | درس کی مقبولیت کا یہ عالم دیکھ کر کسی شخص نے ایک گمنام چٹھی علامہ عثمانی کو لکھی کہ آپ نے قرآن کریم کا یہ درس کسی خاص مقصد کے لئے جاری کیا ہے بزرید و ضا

کے ساتھ بالفاظ دیگر اس طرح کہا جائے کہ آپ اپنا علمی رنگ چڑھانے کے لئے اور دوسروں کا رنگ پھیکا کرنے کے لئے یہ کچھ کر رہے ہیں۔ اور واضح الفاظ میں

خط کا مضمون یہ تھا کہ آپ مولانا مدنی کی قدر و منزلت گھٹانے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔

یہ گمنام خط کسی سطحی خیال اور معمولی ذہنیت کے انسان کا خط ہو سکتا ہے اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کسی بلند شخصیت کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا مگر کیا کہئے کہ غلط قسم کے لوگ اس قسم کا کردار پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ یہی صاحبان کبھی یوں بھی اڑا دیتے کہ مولانا مدنی پھر ہجرت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس پر لوگوں کے استفساری خطوط حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے پاس آتے۔

بہر حال حضرت عثمانی کا درس جاری کرنا ان کے لئے نظر بد کا سامان فراہم کرنے کا سبب بن گیا۔ اگلے درس میں علامہ نے اس گمنام خط کے مضمون کا راز شکر کائے درس پر فاش کر دیا۔ اس خط سے آپ کے دل پر چوٹ لگی۔ وجہ صاف تھی کہ سب جانتے ہیں کہ طلبہ کے اصرار پر آپ نے ایسا کیا تھا اور اصل حقیقت کے خلاف اب کہا یہ جارہا ہے کہ اپنا علمی رنگ دوسروں پر جانا مقصود ہے۔ یہ خط، لکھنے والے کی غیر معمولی تنگ نظری کا مرقع تھا حضرت عثمانی نے مجلس درس میں ذرا ٹیکھے انداز میں اس خط پر اظہار خیال فرمایا۔ بس یہیں سے معاملہ بڑھتا ہے اور اختلاف کی ہلکی سی بدلی فضا سے دارالعلوم پر مسئلہ لگتی ہے۔ اندر ہی اندر نیچے کے بعض لوگوں میں حضرت عثمانی کے خلاف، مخالفت کا دھواں سلگنا شروع ہوتا ہے اور طرح طرح کی چیمپیونیاں، سرگوشیاں اور الجھنیں اندر ہی اندر جنم لینا شروع کر دیتی ہیں۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے ہندوستان کی سیاسیات میں مانٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد خلافت، جمعیت العلماء اور کانگریس کے ذریعہ برابر حصہ لیا اور آپ مختلف اوقات میں سیاسی

حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی گرفتاری

۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۲ھ
۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء

سرگرمیوں کے باعث قید فرنگ میں بھی رہے جس میں آپ نے اپنے مجاہدانہ صبر اور استقلال سے مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کیا۔ ایسا ہی ایک وقت آپ پر آیا آیا جبکہ ۱۹۴۲ء میں اہل ہند کی سیاسی سرگرمیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ ستیہ گرو کا دور تھا اور لوگوں نے ریلوے لائنیں تک اکھاڑ ڈالی تھیں اور جویش آزادی شباب پر پہنچ رہا تھا گویا رسولِ نافرمانی کا سال تھا۔ آپ کو ۲۳ جون ۱۹۴۲ء کی شب جبکہ آپ پنجاب کی ایک اتحاد کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، سہارنپور اور دیوبند کے درمیان ٹری فلیج سہارنپور کے سٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کی وجہ علمائے حق کے مصنف مولانا محمد میاں صاحب لکھتے ہیں:

”جمعیۃ العلماء ضلع مراد آباد نے ۲۳/۲۴/۲۵/۱۹۴۲ء کو قصبہ بھیراؤں میں اپنی کانفرنس منعقد کی اور شیخ الاسلام مدظلہ العالی سے شرکت کانفرنس کی منظوری حاصل کر لی۔ حکومت نے اس موقع کو بہت غنیمت سمجھا اور حضرت موصوفی کی تقریر کے نوٹ حاصل کرنے کے لئے خاص انتظام کیا گیا۔ نوٹ حاصل کرنے کے بعد مقدمہ درج کیا گیا اور وارنٹ جاری کر دیا گیا۔ (علمائے حق جلد دوم صفحہ ۲۲۵)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا مدنیؒ کو آپ کی بھیراؤں والی تقریر پر گرفتار کیا گیا۔ ”کرپشن مشن“ نے حکومتِ برطانیہ کا جو منصوبہ آزادی اہل ہند کے سامنے پیش کیا تھا وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب حکومت یہ چاہتی تھی کہ آئندہ ستیہ گرو کی تحریک کو قوت سے دبا دیا جائے اور یہ کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ اس تحریک کو صرف ہندوؤں کی تحریک سمجھا جائے۔ مولانا محمد میاں صاحب لکھتے ہیں :-

”حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی کی گرفتاری کم از کم مسلم حلقے میں

تحریک کے دائرے کو وسیع کر دیتی اور حکومت کے ایسی پر زیادہ اثر انداز ہوتی کہ مسلمان تحریک سے علیحدہ رہیں تاکہ وہ کانگریس کی تحریک کو صرف ہندوؤں کی تحریک کہہ کر مقصد تحریک کو زیادہ سے زیادہ ناکام کر سکے۔

(علمائے حق جلد دوم صفحہ ۲۲۸)

مولانا محمد میاں صاحب کی مذکورہ اول الذکر اور آخر الذکر دونوں صفحے کی متصل عبارتیں بتاتی ہیں کہ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری خالص ملکی سیاست سے متعلق تھی اور بس۔ الحاصل جب مولانا مدنی گرفتار کر لئے گئے تو حضرت کے حلقہ تعلق اور بالخصوص دارالعلوم دیوبند میں خاص جوش پیدا ہو جانا معمولی بات تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

دارالعلوم میں گرفتاری کا رد عمل اور علامہ عثمانی کی تقریر

مولانا مدنیؒ کی گرفتاری پر کیا رد عمل ہوا اس کی وضاحت دیوبند کے رسالہ دارالعلوم ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ مطابق جون ۱۹۴۲ء میں مطالعہ کیجئے:

۱۰۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ (۲۴ جون ۱۹۴۲ء) مولانا مدنیؒ کی

گرفتاری بروز پچنبہ تقریباً آٹھ بجے صبح پیری کے سٹیشن پر ہوئی جس سے دارالعلوم میں ایک ہجبان برپا ہو گیا۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم نے دارالشوکر میں اساتذہ کو جمع فرما کر صورت حال کے متعلق مشورہ کیا۔ طے پایا کہ دہلی سے دارالعلوم کی مجلس اعلیٰ کے ارکان مفتی کفایت اللہ مولانا حافظ الرحمن اور شیخ رشید احمد کو بذریعہ برقیہ دیوبند پہنچنے کی دعوت دی جائے۔ اور سہارنپور سے حافظ محمد یوسف انصاری کو بلایا جائے۔ اور حضرت شیخ کی اسارت سے پیدا شدہ حالات کے فرووری پہلوؤں پر ان حضرات

کے مشورے کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جائے۔

دارالعلوم میں جلسہ بعد نماز ظہر اساتذہ، طلبہ اور کارکنان دارالعلوم علامہ عثمانی کی صدارت کا ایک مشترکہ جلسہ زیر صدارت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہ صدر دارالعلوم منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے جو اس وقت تشریف لائے تھے حضرت شیخ گرقاری پر اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں ایک پُر مغز تقریر فرمائی۔ اور حکومت کے اس اقدام کو غیر دانشمندانہ قرار دیا۔ اس کے بعد صدر جلسہ حضرت صدر مہتمم صاحب مدظلہ نے اپنی پر جوش تقریر میں فرمایا کہ اگر حکومت مولانا مدنی کو گرفتار کر کے دارالعلوم دیوبند و جماعت دیوبند کو جیلنگ کرنا چاہتی ہے تو میں پوری جماعت کی طرف سے اس جیلنگ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(رسالہ دارالعلوم رحمتیہ ۱۳۶۱ھ)

علامہ عثمانی کی مذکورہ بالا تقریر سے مولانا مدنی کے ساتھ ان کی ہمدردی اور تعلق کا صاف پتہ چلتا ہے۔ طلبہ دارالعلوم نے بھی مولانا کی قید پر منظر ہرے کئے مگر بے سود ثابت ہوئے۔ آپ پر مقدمہ چلا یا گیا جس کے فیصلے میں آپ کو اٹھارہ ماہ کی قید یا مشقت اور پانسو روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ سزاکے خلاف دفاع کمیٹی نے اپیل دائر کی۔ ۲۹ جولائی کو مسٹر آصف علی مراد آباد پہنچے اور چار گھنٹے مولانا مدنی کی وکالت میں بحث کی۔ جمعہ ۱۳ اگست فیصلے کی تاریخ مقرر کی مگر

سول نافرمانی اور طنز تک ۸ اگست کو عام تحریک شروع ہو گئی۔ حکومت نے دوسرے لیڈروں کو بھی قید کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں عام ہیجان پھیل گیا۔ بازار بند وغیرہ ۸ اگست ۱۹۴۲ء

ہوئے۔ ہڑتالیں ہوئیں، طلبہ نے کالجوں اور سکولوں میں اسٹرائک کر دی جلوس اور جلسے ملک میں گرجو شہی پھیلانے میں موثر ثابت ہوئے۔ پُل توڑے گئے، تار کاٹے گئے، ریلوے لائن کٹی جگہ سے اکھاڑ دی گئی۔ حکومت کی طرف سے فائرنگ ہوئی۔ ان حالات میں مولانا مدنی کو حکومت کیا چھوڑتی۔

حضرت مولانا مدنی کی گرفتاری پر طلبہ میں بھی ہیجان فطری بات تھی انہوں نے اس سلسلے میں مظاہرے کئے پھر ہندوستان کی عام فضا ۸ اگست ۱۹۴۲ء سے خراب ہو جانے کے باعث طلبہ دارالعلوم کو ہڑ سجانے کا اور بھی موقع مل گیا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی تحریک کا زمانہ تھا جس میں کیا کچھ نہوا۔ مولانا محمد میاں لکھتے ہیں ۱۔

”ریلوں کی پٹریاں اکھاڑ دی گئیں، تار کاٹ دئے گئے، سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچا یا گیا۔ جگہ جگہ نیچا ہمتی حکومتیں قائم کر لی گئیں اور گورنمنٹ کے ملازمین کو سبکدوش کر دیا گیا۔ بعض بعض موقعوں پر پولیس کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ ۱۱ اگست کو دہلی میں تار کاٹ دئے گئے۔ پیل کوٹھی جس میں ریلوے کا پمپاس سالہ ریکارڈ تھا جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ ٹاؤن ہال کو بھی آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔“

(علمائے حق جلد دوم صفحہ ۱۸۵)

حضرت مولانا مدنی کی گرفتاری کے بعد دارالعلوم دیوبند کے طلبہ مولانا سے مراد آباد جیل میں لے گئے۔ اور مولانا مدنی کو دیکھ کر رونے لگے۔ اس پر ناخوش ہو کر مولانا مدنی نے کچھ ایسے الفاظ فرمائے جس سے یہ طلبہ یہ سمجھ کہ حضرت کا منشا یہ ہے کہ طلبہ جیل جائیں۔ حالانکہ مولانا کا یہ منشا نہ تھا۔ بہر حال طلبہ نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ استاد محترم مولانا محمد طیب صاحب کے حسب ذیل مطبوعہ اعلان

سنگین ترورشیش ہے چل جانے کے خیال سے طلبہ باہر یاد یونہی
میں تقریریں کریں گے ، دارالعلوم میں گرفتاریاں ہوں گی اب آپ دیکھیں
اس سے کیا صورت پیدا ہو جائے گی ؟ (بیان علامہ عثمانی ۸ رجب ۱۳۶۲ھ)

طلبہ کا اخراج حضرت مولانا محمد طیب صاحب اور حضرت حافظ محمد یوسف صاحب کے بیانات سے واضح ہے کہ دارالعلوم کے طلبہ کس درجے تک تجاؤں کر چکے تھے ۔ ان حالات میں مولانا محمد طیب صاحب ہمتیہ غفلت ارمچانے والے طلبہ سے سخت برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات بھی تھی ۔ علامہ عثمانی بھی ان کے مؤید تھے ۔ بہر حال ان طلبہ کے اخراج کے سلسلے میں دونوں ہوا تھے ۔ علامہ عثمانی نے اپنے بیان مؤرخہ ۹ رجب ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی دو صفحوں کی تحریر کا طلبہ کے اخراج سے متعلق حوالہ دیا ہے ۔

بہر حال صدر ہمتیہ اور ہمتیہ دونوں طلبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں سے جن کا ذکر حافظ محمد یوسف صاحب رکن مجلس شوریٰ نے کیا ہے سخت برہم تھے اور انہی وجوہات کی بناء پر اس قسم کے ہنگامہ خیز انسٹھ (۵۹) طلبہ کو مدرسے سے خارج کر دیا گیا ۔ اس قدر نازک حالات کے باوجود مولانا نجم الدین اصلاحی مکتوبات شیخ الاسلام میں مکتوب نمبر ۲ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں :-

” ۱۹۴۲ء کے ہنگامے میں پولیس نے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم سے شکایت کی کہ کچھ طلبہ تحریک میں حصہ لے رہے ہیں اس کے نتیجے میں دارالعلوم کے لئے خطرات کا بھیا تک نقشہ پیش کر دیا ۔ مولانا مرحوم بھولے بھالے آدمی تھے اس سے متاثر ہو گئے اور طلبہ کی ایک محتذبہ تعداد کو خارج کر دیا ۔“

(مکتوبات جلد ۱ ص ۵۶)

مولانا اصلاحی نے علامہ عثمانی کو جس رنگ میں بھولا بھالا کہا ہے اس پر پیدل

نقد پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھئے حافظ محمد یوسف صاحب اور مولانا محمد طیب صاحب نے حالات کا کس قدر بھیا نک نقشہ پیش کیا ہے اور الزام علامہ عثمانی پر لگایا جا رہا ہے کہ پولیس کے سپکاء میں آگئے۔ اب سنئے حافظ محمد یوسف صاحب اپنے مذکورہ بالا خط بنام مولانا شبیر احمد عثمانی میں جو انہوں نے علامہ کو ۱۱ جولائی ۱۹۴۲ء کو سہارنپور سے لکھا ہے، لکھتے ہیں :-

”اللہ تعالیٰ نے یہاں کے کوتوال کے دل میں دارالعلوم کی محبت ڈالی

وہ بتائید بخاری صاحب (ڈپٹی کلکٹر) معاملات کو ٹال رہا ہے“

دیوان علامہ عثمانی ۹ رجب ۱۳۶۲ھ

مستقیم کا فیصلہ
اور رد عمل؛

اجاں تک طلبہ کے اخراج کا تعلق ہے ہمارے خیال میں مذکورہ بالا حالات میں صاحب صدر مستم نے انہیں طلبہ سے علیحدہ کر کے دارالعلوم کو نازک صورت حال سے

بچالیا۔ البتہ طلبہ کی طرف سے اخراج پر رد عمل منطقی اور نفسیاتی امر تھا۔ وہ طلبہ میں اپنے آپ کو واپس لانے میں تا بمقدور ایڑی اور چوٹی کا زور لگانے پر مجبور تھے اس سلسلے میں انہوں نے زمین و آسمان ایک کر ڈالے۔ مجلس شوریٰ کے ممبروں تک رسائی کی چنانچہ اس دور کی مجلس شوریٰ میں ان کے سیاسی موید کافی تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے بھی جیل سے سفارش کی کوشش فرمائی چنانچہ مولانا اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں :-

”مولانا شبیر احمد صاحب بھٹہ کو زوردار طریقے پر لکھتے کہ وہ دیوبند چلے

صدر صاحب (علامہ شبیر احمد عثمانی) کو اپنے سحر بھرے کلام سے موم بنائیں اور

آبادہ کریں کہ وہ تمام مخبرین طلبہ کو بلا استثناء داخل فرمائیں اور اپنے احکام

کو پولیس لے لیں کیونکہ انہوں نے حافظ محمد یوسف اور مولانا حفیظ الرحمن صاحب

سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا اور نہ خارج کروں گا۔
اور طلبہ ان دونوں حضرات کے حکم کے پابند ہو گئے تھے اور اس وعدے کو
ان دونوں حضرات نے مجمعِ علم میں بھی طلبہ کو سنایا تھا۔ بہر حال مولانا بشیر احمد
صاحب فوراً جائیں اور صدر صاحب کا غصہ ٹھنڈا کریں۔ اگر ایسا نہ کیا تو مولانا
بشیر احمد صاحب کے کمالات دو کوڑی کے رہ جائیں گے۔

(مکتوبات شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب جلد اول صفحہ ۵۶)

ظاہر ہے کہ مولانا بشیر احمد صاحب پر چاروں طرف سے زور پڑا اور اس سلسلے میں
خافظ محمد یوسف گنگوہی، جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے نواسے ہوتے ہیں اور
جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی تھے اور ان کے علاوہ حضرت مولانا مدنیؒ،
مولانا حفیظ الرحمن صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب سب ہی خواہاں تھے کہ طلبہ کو دوبارہ
داخل کر لیا جائے۔ چنانچہ علامہ عثمانی مجبور ہو گئے اور آپ نے ایک لڑکے کے سوا
تمام کو دوبارہ داخل کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔ اپنے ایک بیان میں علامہ
لکھتے ہیں :-

”میں نے صرف ایک طالب علم کو مستثنیٰ رکھ کر بقیہ سب کے داخلے کی

اجازت دی۔“ (بیان ۹ رجب ۱۳۶۲ھ ڈا جیل)

علامہ ان حالات میں گھر کر صدارت اہتمام سے
بدل سے ہو گئے اور اس پر طرہ یہ کہ آپ کے
اختیارات صدارت بھی محدود کر دیئے گئے۔ اس لئے
آپ نے خود بخود دارالعلوم میں آنا جانا بند کر دیا۔

علامہ عثمانی کا صدارت اہتمام
تے تنفرا اور دارالعلوم دیوبند
سے خود علیحدگی کے اسباب

اپنے ۹ رجب ۱۳۶۲ھ کے بیان میں فرماتے ہیں :-

”واقعہ یہ ہے کہ شوریٰ کے ریزولیشن میں اولاً تو صدر ہتم کے جملہ فرائض

اور اختیارات سلب کر لئے گئے، یہ تو تعطل ہوا۔ آخر میں یہ کھمدیا کہ جس وقت مہتمم صاحب موجود نہ ہوں اور کوئی فوری ضرورت تقرر و برخاستگی کی پیش آئے تو صدر مہتمم صاحب عمل میں لا کر جلسہ انتظامیہ میں پیش کر دیں۔ یہ ہے وہ اختیار جو صدر مہتمم کو دیا گیا۔ یعنی تعطل کے بعد اس کا تنزل اس طرح کیا گیا کہ اسے صدر مہتمم ہونے کے بجائے فوری معاملات میں نائب مہتمم بنا دیا گیا ہے۔

اختیارات کو محدود دئے جانے کے باعث آپ نے صدارت اہتمام پر رہنے کو اپنی غیور طبیعت کے خلاف سمجھا چنانچہ گھر بیٹھ رہے۔ اب جو دارالعلوم کی طرف سے کاغذات آپ کی طرف بھیجے گئے اور صدر مہتمم کے عہدے سے خطاب کر کے بھیجے گئے تو آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا جیسا کہ مجلس انتظامیہ دارالعلوم دیوبند منعقدہ ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۲ھ زیر صدارت حضرت الاستاذ مولانا اعجاز علی صاحب کی دفعہ نمبر ۴ سے واضح ہے :

۴۔ چونکہ حضرت مولانا شید احمد صاحب عثمانی کبریات و مرات اپنی مطبوعہ اور قلمی تحریروں میں اس کا اعلان فرما چکے ہیں کہ وہ دارالعلوم سے عملاً یکسو ہو چکے ہیں نیز اپنے والا نامہ بنام مہتمم صاحب دارالعلوم مورخہ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۲ھ میں ان کے ایک مکتوب کا جواب دیتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمادیا ہو کہ:

”اس خط میں اگر جبر مجھ کو خطاب بحیثیت صدارت اہتمام کیا گیا

ہے تو میں اس سے عملاً یکسو ہو چکا ہوں؟

جس سے مدوح کا منشا واضح ہے کہ آئندہ انہیں بسلسلہ معاہدات دارالعلوم بحیثیت صدارت اہتمام خطاب بھی نہ کیا جائے۔ اس لئے مجلس نے اتفاق رائے فیصلہ کیا کہ آئندہ کاغذات دارالعلوم اور مراسلات وغیرہ ان کی خدمت

میں نہ سمجھے جائیں تاکہ ان کے لئے مزید اکراہ کا باعث نہ ہو۔

(رسالہ دارالعلوم رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ ص ۱)

اس تحریر سے واضح ہے کہ تجدید اختیارات کے بعد مدرسہ کے امور میں دخل دینا وہ اپنی بے عزتی سمجھتے تھے اور اس لئے وہ اپنے گھر بیٹھ رہے۔ ۷ رجب ۱۳۶۲ھ کی مجلس شوریٰ بروز سہ شنبہ کی نشست زیر صدارت حکیم مولانا محمد اسماعیل صاحب جاری ہوئی جس میں حسب ذیل اراکین مجلس شوریٰ نے شرکت کی اس سے بھی مولانا عثمانی کی خود علیحدگی پر روشنی پڑتی ہے۔

<p>ارکان مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند</p>	<p>(۱) حکیم مولانا محمد اسماعیل صاحب (۲) مولانا حکیم محمد حسین صاحب (۳) مولانا مشیت اللہ صاحب (۴) بجنوری (۵) مولانا محمد اشفاق صاحب رائے پوری</p>
----------------------------------------------	---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------

(۵) مولانا محمد ابراہیم صاحب رائے پوری (۶) مولانا محمد اعجاز علی صاحب (۷) مولانا مناظر احسن گیلانی (۸) نواب عبدالباسط خاں صاحب حیدر آباد دکن (۹) خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب (۱۰) مولانا حافظ محمد یوسف صاحب (۱۱) مولانا محمد طیب صاحب ہتم (۱۲) خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحب مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب ان دنوں جیل میں تھے اور ان کی جگہ مولانا اعجاز علی صاحب تھے۔

رسالہ دارالعلوم دیوبند ماہ رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ میں کارروائی اس

طرح درج ہے :

” ۷ رجب کو صبح سے دوسری نشست شروع ہوئی۔ حضرت مولانا

مناظر احسن صاحب نے اعتراض فرمایا کہ چونکہ اس جلسے کا دعوت نامہ مولانا

شبیر احمد صاحب عثمانی کو باوجود رکن مجلس ہونے کے نہیں بھیجا گیا اس لئے

یہ جلسہ غیر آئینی ہے اور اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ ان کو اب دعوت نامہ بھیج دیا جائے۔ اس اعتراض کے جواب میں مجلس انتظامیہ منعقدہ ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۲ھ کی تجویز پیش کی گئی کہ چونکہ حضرت مولانا عثمانی کے ایک والا نامہ منسلک سے واضح ہے کہ بحیثیت صدر ان سے خطاب نہ کیا جائے (اور ان کی رکینت شوریٰ بحیثیت صدر مہتمم ہی ہے) اس لئے انہیں دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا۔ (رسالہ دارالعلوم رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ ص ۳)

علامہ عثمانی کی اس جوابی تحریر سے کہ بحیثیت صدر مہتمم ان سے خطاب نہ کیا جائے اس امر کی غمازی ہوتی ہے کہ وہ صدارت سے خود کیسے ہو کر دارالعلوم سے منکشف ہو گئے اور آپ کی وجہ سے نواب عبدالباسط خان صاحب حیدر آباد دکن ممبر مجلس شوریٰ دیوبند اور حکیم مقصود علی خاں صاحب حیدر آباد دونوں نے استعفا دیدیا تھا لیکن مجلس شوریٰ نے منظور نہیں کیا تھا اس لئے اصرار کے بعد نواب صاحب نے اپنا استعفا واپس لے لیا۔

اسی مجلس شوریٰ میں خان بہادر حاجی رشید احمد صاحب کی تجویز اور خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب کی ترمیم حسب ذیل پیش ہوئی :-

”شخصیت اور مصلحت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ مولانا شبیر احمد صاحب کا تعلق دارالعلوم سے کسی مناسب طریقے پر باقی رکھا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ رکینت مجلس شوریٰ کی (حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک روز پہلے انتقال پر ملال کے باعث) خالی شدہ اسامی پر بحیثیت رکن مجلس شوریٰ کے لئے جائیں۔“ (دارالعلوم رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ ص ۴)

لیکن اس تجویز کی حافظ محمد یوسف صاحب نے سخت مخالفت کی اور فرمایا :-

”مولانا عثمانی نے دارالعلوم اور مجلس شوریٰ کے خلاف اخبارات میں

لے یہاں سے کتب کی تالیف کا کام عرصے تک چھوڑنے لکھنے کے بعد ۱۲ نومبر ۱۹۶۲ء سے پھر شروع کیا گیا ہے۔ مولف

جویانات دے ہیں وہ میران شوری کے لئے باعث توہین اور دارالعلوم کے لئے موجب نقصان ہیں تا وقتیکہ مولانا مدوح ان کی تلافی نہ فرمائیں اس رکینت کی تجویز کا نفاذ نہ ہوگا۔ (رسالہ مذکور ص ۷)

درحقیقت جب مولانا عثمانی نے مدرسے کی صدارت کو خیر باد کہہ دیا وہاں آغا جانان ترک کر دیا۔ ان کی عدم موجودگی میں مولانا مناظر احسن گیلانی، نواب عبداللطیف خاں صاحب، خان بہادر رشید احمد صاحب، خان بہادر ضیاء الحق صاحب اور حکیم مقصود علی خاں صاحب یہ سب حضرات علامہ عثمانی سے دارالعلوم کے تعلق کو باقی رکھنے کے خواہاں تھے اس لئے حافظ محمد یوسف صاحب کی مخالفت مولانا عثمانی کی مخالفت نہ تھی بلکہ مجلس شوری کے ممبروں کی مخالفت تھی۔

علامہ کی عالی ظرفی | اسی مجلس شوری کے جلسے میں گڑ بڑ پیدا کرنے کے لئے بعض معتد حضرات نے مولانا عثمانی کو کہا کہ فلاں صاحب کے

ذریعہ اس مجلس میں رخصت اندازی کی جاسکتی ہے لیکن علامہ عثمانی نے نہایت تلخ لہجے میں اس خیال کو مذموم قرار دیا۔ البتہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے بعض اجلاس میں مولانا کے بیانات ضرور شائع ہوئے۔ اور بعض ذمہ داران دارالعلوم کی طرف

سے بھی ان مضامین اور بیانات کے جوابات شائع ہوئے۔

کانگریس مولانا عثمانی کی | ہماری گذشتہ تمام عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ دارالعلوم کا مسلک کانگریسی نہ تھا لیکن ۱۹۳۷ء کی طلبہ دارالعلوم کی ہنگامہ آرائی جس کا باعث مولانا مدنی کی گرفتاری اور اس وقت کی سیاسی فضا میں **نہایت دارالعلوم سے** **جدائی کا باعث بنی**

ان کا انہماک اور مولانا عثمانی کا طلبہ کے اس غلو سے سیزار رہنا اور بعض کا مدرسے سے خارج کرنا یہ وہ امور ہیں جو حضرت عثمانی کے دارالعلوم کی صدارت سے دستکش ہونے کا باعث بنے۔

اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے |
 شعبان ۱۳۶۲ء میں دارالعلوم مجددی
 یہ ہے علامہ عثمانی صدارت اہتمام دیوبند سے
 متعلق تاریخی خاکہ جس میں قدرت نے علامہ
 کو دارالعلوم کے لئے آخری سات سال خدمت
 کے لئے منتخب کیا تھا جس میں ان کو مجبور کر کے لایا گیا تھا اور پھر آخر حافظ
 محمد یوسف صاحب کی مخالفانہ سرگرمیوں سے آپ نے اپنی خوشی سے دارالعلوم کو
 چھوڑ دیا۔ عذر اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ اور اگر ان کے لئے
 ماحول خوشگوار قائم رہنے دیا جاتا تو وہ دارالعلوم کی خدمت سے منہ نہ موڑتے۔
 بہر حال شعبان ۱۳۶۲ء کے بعد دارالعلوم دیوبند کی صدارت اہتمام
 سے یکسو ہو گئے۔

علامہ عثمانی کا انتظامی کردار

آخِر میں علامہ موصوف کے حسن انتظام کے متعلق ہم آپ کو ایک بار پھر
 یہ بتادیں کہ علامہ نے اپنے عہد صدارت میں جہاں اپنا قديم دارالعلوم دیوبند
 کی تنظیم، مالی استحکام، تعلیمی اصلاحات، مدرسے میں سیاسی صورت حال کو
 برنگ اعتدال لانے کی کوششیں کیں وہاں دفتری کام کے جائزہ لینے اور طرازیں
 میں کام اور یومیہ کارگزاری سے اطلاعات حاصل کرنے کے سامان بھی پیرائے
 اور دارالعلوم دیوبند کا انتظام خوب چلایا۔ وھذا من فضل اللہ۔

پھر جامعہ ڈابھیل کی صدارت

ربیع الاول ۱۳۶۲ھ بمطابق ۱۹۴۴ء

جیسا کہ مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں واضح کیا گیا کہ علامہ موصوف نے دارالعلوم کی صدارت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور آپ ۱۳۶۱ھ کے سیشن کے بعد مدرسے میں تشریف نہیں لے گئے۔ سالنامہ رسالہ دارالعلوم ۱۳۶۱ھ دیوبند کے صفحہ (۳۱) پر حسب ذیل نوٹ ہماری نظر سے گذرا جو ہمارے لئے تحقیقی دستاویز ہے کہ مولانا عثمانی دارالعلوم سے دست کش ہو کر پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) کی صدارت تدریس پر تشریف لے گئے۔ یہ نوٹ جناب مستم مولانا محمد طیب صاحب کی طرف سے ہے۔ لکھتے ہیں :-

حضرت مولانا شیر احمد صاحب عثمانی مظلہ ڈابھیل سے تعلق قطع

فرما کر دیوبند بسلسلہ صدارت انتہام مستقلاً مقیم ہو گئے تھے معلوم ہوا ہے

کہ اب مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل سے حضرت ممدوح کا تعلق ملازمت پھر قائم ہو گیا

ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف ۲۲ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ کو ڈابھیل روانہ

ہو گئے ہیں۔

آپ وہاں بخاری شریف کی جو صدر مدرس کے

فے سے ہوتی ہے تعلیم دیتے تھے۔ حضرت سید

محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات

۱۳۵۹ھ کے بعد آپ ہی وہاں کے شیخ الحدیث

ربیع الاول ۱۳۶۲ھ جنوری ۱۹۴۴ء

شعبان ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء

ڈابھیل میں؛

تھے۔ الغرض ۲۴ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق جنوری ۱۹۴۴ء سے آپ کا سلسلہ تدریس پھر ڈابھیل میں شروع ہوا اور پھر آپ شعبان ۱۳۶۲ھ کے سالانہ امتحان کے بعد ڈابھیل سے دیوبند تشریف لائے اور پھر شوال ۱۳۶۳ھ میں جامعہ کھلنے کے بعد تشریف لے گئے اور ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء کے پورے تعلیمی سال میں شوال سے شعبان ۱۳۶۳ھ تک پڑھاتے رہے۔ چنانچہ ۶ رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۸ جون ۱۹۴۴ء کو مولانا عثمانی نے ایک مکتوب مولانا امیر شاہ ابن استاد الشیخ المحدث مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھا ہے اور اس پر مذکورہ بالا تاریخ ثبت ہے۔

علامہ کو وجہ مفصل کا مرض | عربی مدارس میں سال شوال سے شروع ہوتا ہے مگر ۴ رذی الحجہ ۱۳۶۳ھ کو علامہ دیوبند میں نظر آتے ہیں کہ آپ نے اس تاریخ کو ۱۹۴۴ء میں ایک خط دیوبند سے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کو جو آپ کے شاگرد رشید و فاضل ہیں ڈابھیل تحریر فرمایا ہے۔ جس سے آپ کا دیوبند میں قیام اور وہ بھی ذی الحجہ میں معلوم ہوتا ہے۔ اس خط میں علامہ لکھتے ہیں :-

”آپ کا مفصل خط پہنچا جس سے تمام حالات معلوم ہوئے۔ میرے گھٹنوں میں اب درد اور دم تو نہیں مگر چلنے پھرنے کی معذوری بدستور ہے اب اطبانے سہیل کی تجویز کی ہے اور اس کے لئے منفعی پل رہا ہوں۔“

معلوم ہوتا ہے کہ ڈابھیل سے شعبان ۱۳۶۳ھ میں واپس آکر یہ مرض لاحق ہوا اور آپ اس لئے واپس تشریف نہ لے جاسکے۔ یہ مرض آپ کے لئے ڈابھیل جانے سے روکے رہا۔ تا آنکہ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۹۴۵ء کو آپ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کو ان کے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :-

”چند روز سے کچھ خطوط خود لکھنے لگا ہوں۔ آپ کا محبت نامہ آیا تھا جواب میں تاخیر ہوئی مسامحت فرمائیں۔ الحمد للہ مجھے نسبتاً افاقہ ہے۔ مگر میں کچھ عمل پیر سکتا ہوں مگر قصائے حاجت وغیرہ احوال میں معذوری باقی ہے۔ نماز بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ وضو بھی خود کرنا مشکل ہے۔ بہر حال بالکل شفایابی نہیں ہوئی۔“

اس مکتوب گرامی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۵ء ۱۳۶۳ھ میں شروع سال سے ہی مولانا کو گھٹیا کے درد نے بہت ہی پریشان کر دیا تھا اور اب تک ایک سال کے عرصے میں یہ بیماری آپ کو لاحق رہی۔ پھر ۲۱ مئی ۱۹۴۵ء مطابق ۱۷ جمادی الآخر ۱۳۶۳ھ کے ایک خط میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کو تحریر فرماتے ہیں:-

”علالت کی وجہ سے سب کام معطل ہیں اور ہمت لکھنے پڑھنے کی نہیں ہوتی۔ اس ایک ماہ میں تین مرتبہ انگوٹھے کے درد اور درم کا دورہ ہوا۔ ہنوز قدرے درم اور دکھن پاؤں میں باقی ہے۔ آٹھ ماہ سے علالت کا سلسلہ قائم ہے افاقہ ضرور ہو جاتا ہے مگر استیصال مرض نہیں ہوتا اور معذوری ایک نوع کی باقی ہے۔“

اس خط سے جو مئی ۱۹۴۵ء میں لکھا ہوا ہے بیماری کی طوالت کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ آٹھ ماہ سے مسلسل بیماری چلی جا رہی ہے جس کی ابتدا آٹھ ماہ پہلے وسط اکتوبر ۱۹۴۴ء مطابق تالیقعدہ ۱۳۶۳ھ سے ہوئی ہے۔

۶ رذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق نومبر ۱۹۴۵ء کو آپ نے اپنے شاگرد مولانا عبداللہ صاحب مرحوم فاضل دیوبند خلیفہ مجاز مولانا ابوسعید صاحب خانقاہ مزاحیرہ کنڈیا ضلع میانوالی کو مولوی عبدالخالق صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کو بیعت کرنے کی جو سفارشی خطی دیوبند سے تحریر فرمائی ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں:-

”الحمد للہ مجھے اب بہت کچھ صحت ہے۔ کچھ خفیف ساقیہ مرض ہے۔

انشاء اللہ وہ بھی زائل ہو جائے گا۔

اس خط سے اسی آٹھ ماہ کے مسلسل مرض سے افاتے کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ

مرض میں ذرا خفت باقی ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ سارا سال آپ کا دیوبند میں صاحب فراش رہ کر گزرا۔

میر عثمان علی خان نظام حیدر آباد دکن کی مولانا عثمانی کو

ملازمت پر لینے کی خواہش

علامہ عثمانی کا یہ سال یعنی ۱۹۴۵ء تقریباً سارا ہی گٹھیا کی تکلیف میں گزرا لیکن اکتوبر نومبر میں تقریباً آرام ہو گیا۔ مگر آپ کا قیام دیوبند ہی میں رہا۔ دوران مرض میں حضور نظام میر عثمانی علی خان نے آپ کو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے شعبہ اسلامیات کی صدارت کے لئے دعوت نامہ بھیجا۔ عرض کر چکا ہوں کہ نظام حیدر آباد علامہ شبیر احمد عثمانی کے علم و فضل، تقریر و خطابت سے بہت متاثر تھے اور ۱۹۴۲ء کے آخر یا ۱۹۴۳ء کے آغاز سے علامہ عثمانی کی حیدر آباد دکن میں آمد و رفت تھی۔ نظام صاحب نے اسی زمانے سے آپ کی تقریریں سن کر عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت بھی ۱۹۴۳ء میں آپ کو شعبہ اسلامیات کی صدارت پر لینا چاہتے تھے مگر آپ نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد تعلقے کا آپ نے ارادہ کر لیا تھا۔ مکالمۃ الصدرین میں حضرات علیائے جمعیۃ العلما سے ہندوہلی سے علامہ کی سیاسی گفتگو کے دوران حیدر آباد کے تعلق کے متعلق صورت حال یہ ہے۔ مرتب مکالمۃ الصدرین مولانا محمد طاہر مرحوم لکھتے ہیں:

” جب یہ حضرات (مولانا حسین احمد صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہما) علامہ عثمانی سے رخصت ہونے لگے تو مولانا احمد سعید صاحب (نظم جمعیتہ العالمائے ہند دہلی) نے دریافت فرمایا کہ حضور نظام نے حیدر آباد بھی بلا لیا تھا۔ آپ حیدر آباد کب تشریف لے جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ ابھی دو تین ماہ تک مجھے یہاں بغرض علاج قیام کرنا ہے۔ سردی کم ہونے پر اگر اجازت ہو تو حیدر آباد آؤں۔ اب حضور نظام پر موقوف ہے کہ اگر اس کے باوجود انہوں نے مجھے طلب فرمایا تو مجھ کو ہر حال جانا پڑے گا اور اگر اجازت دے دی تو ٹھہر جاؤں گا۔“
(مکالمۃ الصدرین ص ۴)

اس گفتگو کے بعد مرتب مکالمۃ الصدرین قوسین میں لکھتے ہیں :-
(۳) الحمد للہ اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چیف سیکریٹری کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچ گیا کہ آپ کو فروری تک قیام کی اجازت ہے۔ (مرتب) (۴) مکالمۃ الصدرین

یہ عبارتیں واضح کرتی ہیں کہ نظام حیدر آباد دکن کے یہاں آپ کا تقرر ہو چکا تھا۔ لیکن کیا آپ فروری کے بعد حیدر آباد تشریف لے گئے یا نہیں کسی تحریری بیان سے آپ کا حیدر آباد جانا ثابت نہیں ہوتا بلکہ آپ کو ملکی سیاسیات اور مسلم لیگ میں شرکت کے باعث مصروفیات نے کسی بھی کام کرنے کا دم نہ لینے دیا۔

اوپر کی سطروں میں واضح کیا گیا ہے کہ علامہ ۱۹۴۵ء کے پورے سال یعنی ۱۳۶۳ھ کے پورے سیشن (تعلیمی سال از شوال تا شعبان) دیوبند قیام پذیر رہے اور علاج میں مشغول رہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے بعد

راقم الحروف کا دیوبند میں
ورود اور علامہ شبیر احمد
عثمانی سے ملاقات

نومبر ۱۹۲۵ء تک بالکل صحتیاب ہو گئے تھے چنانچہ بندہ اس وقت کپور تھلے کے کالج میں بحیثیت پروفیسر مقیم تھا اور دسمبر ۱۹۲۵ء کی ۲۲ تاریخ کو کرسمس کی تعطیل میں شیرکوٹ ضلع بجنور اپنے وطن جاتے ہوئے دیوبند پہنچا۔ ۲۴ دسمبر کو صبح کے ۹ بجے علامہ عثمانی سے ملا۔ آپ اُس وقت اپنے نئے مکان میں تشریف فرما تھے اور بالاخانہ پر اپنے کتب خانے میں بیٹھے تھے۔ بڑے تپاک سے مجھے خوش آمدید کہا۔ مزاج پُرسی کے بعد کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور بعد ازاں ڈاک آگئی۔ بہت سے خطوط تھے بعض خطوط کے مضامین پڑھ کر بھی سنائے۔ ایک خط مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے طلبہ کا بھی تھا جس میں تحریر تھا کہ اگر مسلم لیگ میں آپ کی شرکت کے باعث مخالفین سے آپ کو خطرہ ہو تو ہم آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو کر آپ کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہیں۔ علامہ مرحوم خطوط کے مضامین پڑھ کر سناتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ مولانا محمد طاہر صاحب کا مرتب کردہ ”مکالمۃ الصمدین“ کا مضمون آپ نے ملاحظہ فرمایا اور جہاں کہیں ترمیم کی ضرورت پڑی اس میں آپ نے میرے سامنے ترمیم فرمائی۔

* اس کی حقیقت جاننے کیلئے حضرت مولانا رحمہ اللہ کا مرتب کردہ کتابچہ ”کشف حقیقت“ ضرور مطالعہ کیا جائے۔



مُسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کا حامی

تعمیر پاکستان کا معمار ثانی

شیخ الاسلام

علامہ شبیر احمد عثمانی سابق صدر مشہور شیخ التفسیر والحدیث

دارالعلوم دیوبند

مسلم لیگ میں شرکت

سیاسات عثمانی کا چوتھا دور

ہم علامہ کی زندگی کے واقعات کو ترتیب وار بیان کر رہے ہیں۔ ہم ان کی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے لیکن اب علامہ موصوف اکتوبر اور نومبر ۱۹۳۵ء تک محتویات ہو چکے ہیں۔ باہر آنے جانے سے سر دست احتیاط فرماتے ہیں۔ لیکن یہ دور کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش کا وہ سخت دور ہے جس میں ان دونوں سیاسی جماعتوں کا اختلاف نقطہ خروج پر پہنچا ہوا ہے۔ مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس میں کوئی ہندو یا سکھ نام کو بھی شامل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جماعت صرف مسلمانوں کے حقوق کی نگرانی ہے اور پاکستان ان کا مطالبہ ہے۔

اس کے برعکس کانگریس میں ہندو اور سکھ تمام کے تمام اور کہتے ہی مسلمانوں کے لیڈر اور کچھ عوام بھی شامل ہیں۔ احرار، خاکسار، اسلامی جماعت جس کے لیڈر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہیں، صوبہ سرحد کے سرخپوش جن کی قیادت خان عبدالغفار سرحدی گاندھی کے ہاتھ میں ہے اور مجتہد العلماء ہندو اور ان کے متبعین، نظریہ پاکستان کے مخالف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صرف کانگریس میں شرکت تھے بلکہ کانگریس کے صدر بھی تھے اور ان ہی حضرات کے معتقد مسلمان کانگریس میں شامل تھے۔ مسلم لیگ جس کے قائد اعظم محمد علی جناح ہیں جو مسلمانوں کی پچانوے فیصدی اکثریت کے لیڈر ہیں اور ہندوؤں اور ان کے لیڈروں

مسلم لیگ

کی ہندو پرست ذہنیت کا خوب اندازہ لگا چکے ہیں اور ایک عرصے تک کانگریس میں
سفرِ صلح رہ کر ان کو خوب آزمایا چکے ہیں وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی دسیسہ کاریوں سے
چھٹکارا دلانے کے لئے اپنی قوم کو بیدار کر رہے ہیں اور بیدار کر چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ
اگر مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کو ہندوؤں کی اکثریت سے نہ نکالا گیا تو مسلمان ہمیشہ
کے لئے ہندوؤں کی غلامی سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کی
نکبت اور بد بختی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔

بات بھی حقیقت میں بھی تھی کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے پاکستان کے مطالبہ
کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ مسلمان ہر حیثیت سے ہندوؤں سے ایک جدا گانہ قوم ہے۔
چونکہ مسلمانوں کا مذہب، ان کی تہذیب اور ان کی ثقافت جدا ہے لہذا مسلمانوں
کے لئے علیحدہ ملک کی طلب اور ضرورت ہے۔ جس میں وہ اپنے مذہب اور تہذیب
کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت
ہے ان کو ملا کر پاکستان بنا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے سالانہ آل انڈیا مسلم لیگ
کے جلسے میں جولاہور میں منعقد ہوا یہ ریزولوشن پاس ہوا۔ اور اس ریزولوشن کی
یاد میں مینارۃ پاکستان اقبال پارک لاہور میں شاہی مسجد کے بائیں جانب میدان
میں بنایا گیا۔

کانگریس اپنے آپ کو تمام ہندوستان کے لوگوں کی نمائندہ جماعت سمجھتی تھی۔
لیکن قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ مسلمانوں کی نمائندہ
جماعت کانگریس نہیں بلکہ مسلم لیگ اور اس کے قائد محمد علی جناح ہیں جس کا فیصلہ شملہ
کانفرنس اور ہندوستان کے انتخابات نے کر دیا۔

علامہ عثمانی اس پُر آشوب دور میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ وہ محتایاب ہو کر
میدان میں نکلے اور انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان فرمایا۔ اگرچہ گزشتہ

گزشتہ خطوط میں وہ تجویز پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کی طرف مائل تھے۔
 یوں تو علامہ کی سیاسی زندگی کا یہ جو تھا دور تھا۔ اس سے پہلے وہ مسلمانوں کی جنگ
 بلقان میں حصہ لیتے رہے۔ بعد ازاں دور خلافت میں جنگ عظیم کے بعد انہوں نے خاصہ
 حصہ لیا۔ جمعیتہ العلماء ہندوئی کے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک ممبر اور مجلس عاملہ اور
 مجلس خصوصی کے رکن رہے۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں جمعیتہ العلماء ہندوئی کے مقابلے میں
 مسلم لیگ کے نظریہ پاکستان کی حمایت اور تائید میں "جمعیتہ العلماء اسلام" کے
 نام سے کلکتہ میں مذہبی اور سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی گئی۔

جمعیتہ العلماء اسلام کلکتہ | جمعیتہ العلماء اسلام کلکتہ کا سب سے پہلا جلسہ کلکتہ میں ۲۲
 کا شاندار اجلاس ڈ | ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو چار روز تک ہونا طے پایا اس جلسے
 علامہ عثمانی کا بیغ نام | خصوصیت سے علامہ شبیر احمد عثمانی کو دعوت دی گئی۔ آپ
 اکتوبر ۱۹۲۵ء | میں بھی اتنا طویل سفر کرنے کی طاقت نہ تھی البتہ
 موصوف نے ایک بیان جلسے میں پڑھے جانے کے لئے تحریر فرمایا۔ اپنے ایک خط میں
 ناظم جمعیتہ العلماء اسلام کلکتہ کو تحریر فرماتے ہیں :-

"میں بوجہ معذوری خود حاضر نہ ہو سکا۔ ایک مختصر پیغام بھیجے گا خیال ہوا

مگر لکھنے بیٹھا تو بلا ارادہ طویل ہو گیا۔ صاف کرانے میں دیر لگی ڈاک سے روانہ

نہ ہو سکتا تھا اس لئے مجبور ہو کر سہرست مولانا فلور احمد صاحب مرسل ہے۔"

(۲۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء ۱۸ ذیقعد ۱۳۴۴ھ) بیغ اکملہ عثمانی

اس پیغام کا جو تحریری شکل میں آتھیں صفحات پر مشتمل ہے شرکائے جلسہ پر پہلے سے

اثر ہوا۔ مولانا سید محمد قریش (شمسی) ناظم کل ہند جمعیتہ العلماء اسلام کلکتہ

لکھتے ہیں :-

"پیغام نے ایک عالم بے خودی پیدا کر دیا۔ عجیب محویت و کیفیت سبوں

پر طاری ہو گئی۔ بار بار نعرہ مارتے تکبیر و علامہ شبیر احمد عثمانی زندہ باد بلند ہوتے رہے۔“ (پیش لفظ پیغام کلکتہ ص ۵)

غرض کہ اس پیغام نے ہندوستان کے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک غلغلہ برپا کر دیا اور مسلم لیگ کو شریعت اور سیاست کی روشنی میں آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ بے شمار مسلمان جو لیگ میں شریک ہونے سے ہچکچاتے تھے اور جمعیتہ العلماء ہند اور حضرت مولانا ابوالکلام مرحوم کی شخصیت سے متاثر تھے وہ جوق در جوق لیگ میں شامل ہونے شروع ہو گئے۔ اس پیغام کو تمام لیگی اخباروں نے اچھا لاد اور خاص طور پر ”عصر جدید“ کلکتہ نے اس پیغام کو علی طور پر شائع کیا۔ علامہ نے اپنے پیغام میں دو قومی نظریے پر سخت زور دیا،

دو قومی نظریہ | اور سرمایا۔

”اسلامی نقطہ نظر سے گویا روئے زمین پر دو ہی قومیں آباد ہیں۔ ایک وہ قوم جس نے فاطمہ ہستی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مکمل اور آخری تقاضوں کو اس کی زمین پر رائج کرنے کا التزام کر لیا ہے وہ مسلم یا مومن کہلاتی ہے۔ دوسری جس نے اپنے اوپر ایسا التزام نہیں کیا اس کا شرعی نام کافر منسرد ہوا۔

فَیْمَنْکُمْ کَافِرٌ وَ مَیْمَنْکُمْ مُؤْمِنٌ

اس اساسی نقطہ نظر سے لامحالہ کل غیر مسلم قومیں دوسری قوم بھی جائیں گی اور اب اس چیز کا کوئی اسکان ہی باقی نہیں رہتا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے امتزاج سے کوئی قومیت متحدہ صحیح معنی میں بن سکتی ہے۔“ (پیغام کلکتہ)

موصوف نے شریعت اور سیاست کے اعتبار سے مسلم لیگ میں شریعت اور سیاست کی رُو سے شرکت کی تائید دیا۔ چنانچہ پیغام میں تحریر فرماتے ہیں:-

مسلم لیگ میں شریعت اور سیاست کی رُو سے شرکت کی تائید

” اس وقت مسلمانوں کو حصول پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید و حمایت میں حدود شرعیہ کی رعایت کے ساتھ حصہ لینا چاہئے۔ میں یہ گمان کرتا ہوں کہ اگر اس وقت مسلم لیگ ناکام ہوگئی تو پھر شاید مدت دراز تک مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے کا موقع نہ ملے گا۔ اس لئے وقت کی ضرورت ہے کہ مسلمان مسلم لیگ کے بازو مضبوط کریں اور ساتھ ہی عوام مسلمین ہر قدم پر مختلف عنوانوں سے یہ ظاہر کرتے رہیں کہ ہم نے زعمائے لیگ کا ساتھ اپنے دین اور اپنی اصلی قومیت کی حفاظت کے لئے دیا ہے۔ اور تمام دینی معاملات میں ہم حاملین دین اور علمائے ربانیتین کی آواز کو سب آوازوں پر مقدم دیکھنا چاہتے ہیں اگر خدا نکرہ ایسا نہ ہوا تو ہم انشاء اللہ ایسے فاسد عناصر سے لیگ کو صاف کر کے دم لیں گے۔“

پاکستان کے حصول کی ضرورت

بلوچستان، پنجاب، سرحد، بنگال اور سندھ کے صوبوں کا پاکستان بنا کر جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اسلامی مرکز قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے علامہ نے پیغام کلکتہ میں تحریر فرمایا :-

” ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔ اس قوم کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لئے ضرورت ہے کہ اس کا کوئی مستقل مرکز ہو جہاں سے اس کے قومی محرکات اور عزائم فروغ پائیں اور جہاں سے وہ مکمل آزادی اور مادی اقتدار کے ساتھ اپنے خدائی قانون کو بے روک ٹوک نافذ کر سکیں؟

(پیغام ص ۱۸)

آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں :-

” بہر حال اس (مرکز) کا نام پاکستان رکھو یا حکومت الہیہ یا اور کوئی۔“

اتنی بات ضرور ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور ان کے لئے ایک مستقل مرکز کی ضرورت ہے جو اکثریت و اقلیت کی مخلوط حکومت میں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔ (پیغام ص ۱۹)

یہ چند عبارتیں ہم نے علامہ کے پیغام سے قارئین کے لئے نوٹ کر دی ہیں تاکہ ان کو پیغام کلکتہ اور علامہ کے سیاسی نظریات، نیز لیگ اور پاکستان کی حمایت و تائید کا اندازہ ہو سکے۔

سندوستان کے طول و عرض میں پیغام کا اثر

اس سیاسی اور شرعی پیغام کا اثر اس قدر ہوا کہ تمام سندوستان میں اس کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ اور اس پیغام کو چھپوانے اور بحیثیت شائع کرنے کے لئے لوگ بے تاب ہو گئے۔ ناظم کل جمعیت علمائے اسلام لکھتے ہیں :-

”اس پیغام کے اکثر جملوں کو سکرر پڑھنے کی درخواست (جلسے میں) ہوتی رہی اور تقریباً پون گھنٹے تک اجلاس کی کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔ پٹنل کے ہر گوشے سے لوگ اس کے خیر مقدم کے لئے دفور جوش سے ابلتے رہے اور اس کے شائع کرنے کے لئے چندہ پیش کرنے لگے۔ ایک صاحب نے مجھے ترجمہ و اشاعت کا ذمہ لیا اور دوسرے بزرگ نے گجراتی میں“ (پیغام ص ۶)

اخبار عصر جدید کلکتہ نے اس پیغام کو اپنے اخبار مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں لفظ بلفظ شائع کیا اور اس کے اول میں اپنا ایک نوٹ لکھا جس کے چند جملے یہ ہیں :-

”ذیل میں ہم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی متع اللہ المسلمین بطول بقائے

روح پرور پیغام درج کرتے ہیں جو کل ہند جمعیت علمائے اسلام کے اجلاس کلکتہ میں پڑھ کر سنایا گیا اور جس کی خالص اسلامی روح اور دل نشیں نکات، زبردست دلائل اور سچے مسلم دل سے نکلی ہوئی اپیل، ہزاروں ہزار (لاکھوں) شرکائے

اجلاس کے دل و دماغ پر چھا گئی ہم اس پیغام کو درج کرتے ہوئے مسلمانان ہند سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس کو بار بار پڑھیں و سنتوں کو سنائیں اور اس پمفلٹ کو اس ذیلی براعظم کے طول و عرض اور شمال و جنوب کے گوشے گوشے میں ہر مسلم گھر میں پہنچا کر دم لیں۔
(عصر جدید کلکتہ مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اسی پیغام کلکتہ سے جمعیتہ علمائے ہند بھی چونک اٹھی۔ چنانچہ ایک ملاقات میں جو علامہ عثمانی اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب و مولانا حفیظ الرحمن صاحب وغیرہم کی ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو آپ کے مکان پر دیوبند میں ہوئی ان ہی حضرات میں سے ایک نے فرمایا:-

”آپ کے اعلانات نے ملک میں ہل چل ڈال دی ہے۔“ (مکالمہ ص ۳۷)
غرض آپ کے صرف اسی ایک ہی پیغام نے وہ کام کیا جو دوسرے لیڈروں کی برسوں کی تقریریں اور کوششیں نہ کر سکیں۔
علامہ عثمانیؒ کو جمعیتہ علمائے اسلام کلکتہ نے اسی اجلاس میں شرکت کے لئے جب خط لکھا تو آپ نے طویل بیماری سے کمزوری کے باعث معذرت لکھے ہوئے اثنا خط میں تحریر فرمایا:-

”ہماری تیرہ سو تکتی دیکھئے کہ آج ہم کو ہندوستان میں یہ دن دیکھنا پڑا ہے ہے جبکہ مسلمانوں کا قومی اور سیاسی استقلال ثابت کرنے کے لئے بھی دلائل کی ضرورت ہے اور اس استقلال کی مخالفت میں خود قوم کے بعض اعضاء سینہ سپر ہو رہے ہیں۔ گویا ان کو اس کا احساس ہی نہیں کہ یہ کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی

لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو گناہی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حسرم اس سے بچو
دیروالے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

(اخبار عصر جدید کلکتہ)

علامہ کو اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کانگریس
میں شریک ہو کر ہندوؤں کے ساتھ ہے اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کامیابی
کی تلاش میں ہے۔ علامہ لکھتے ہیں :-

”ہمارے فقہائے حقیر نے امام محمد اور امام طحاوی رحمہما اللہ سے لیکر
علامہ ابن عابدین تک کسی نے اس مسئلے سے انکار نہیں کیا کہ ایک قوم کے
مقابلے پر دوسرے کفار کو مدد دینا یا ان سے مدد لینا اسی وقت جائز ہے
جیکر حکم اسلام غالب ہو“ (پیغام ۲۵)

آپ نے اس وقت کانگریس کے مسلمانوں کے مقابلے
میں مسلم لیگ کے افسر اد کو ووٹ دینا ضروری قرار
دیا اور فرمایا :-

مسلم لیگ کو
ووٹ دینا چاہئے

”میرے نزدیک مسلم لیگ کی جانب کو ترجیح ہے لہذا شخصیات سے بے پروا
ہو کر اس کے نامزد کردہ امیدوار کو ووٹ دینا چاہئے“ (بیان الیکشن)
”کیا کانگریس کے دائرہ میں جہاں ہندو عناصر کے کھلے غلبے سے کوئی انکار
نہیں کر سکتا مٹھی بھر مسلمان داخل ہو کر تو یہ امید کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے
معاملات میں ان سب کو راہِ راست پر لے آئیں گے لیکن مسلم لیگ کے متعلق
جو خالص مسلمانوں کی جماعت ہے ایسی امید کے سبب دروازے بند ہو
چکے ہیں۔ یہ چیز کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے“ (منشور دہلی ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء)

اسی بیان میں جو مسلم لیگ کو ووٹ دینے کے سلسلے میں علامہ نے دیا، تحریر فرمایا:-
 ”اس وقت (مسلم لیگ) جس اصول پر الیکشن لڑ رہی ہے وہ عقلی اور شرعی حیثیت سے مرجع اور بے غبار ہے۔ اگر مسلم لیگ موجودہ الیکشن میں ناکامیاب ہوگئی تو قومی اندیشہ ہے کہ ایک سچا اصول ہی شاید ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتے اور مسلمانوں کے قومی اور سیاسی استقلال کی آواز فضا کے ہندوستان میں پھر کبھی نہ سنائی دے۔

پاکستان ایک اصطلاحی نام ہے یہ نام جس کس شخص کو بھی یہ غلط فہمی یا خوش فہمی پیدا نہیں ہوتی چاہئے کہ اس خط میں فوراً بلا تاخیر خلافت راشدہ یا خالص قرآنی اور اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ ضرورت سے زیادہ امیدیں دلانا یا توقعات باندھنا کسی عاقبت اندیش حیثیت پسند کے لئے زیبا نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان ایسا ابتدائی قدم ہے جو انجام کار قرآنی اصول کے مطابق احکام الحاکمین کی حکومت عادلہ قائم ہونے پر کسی وقت منتهی ہو سکتا ہے جس کے قیام کا نام نہاد قومیت متحدہ کی حکومت کے ذریعہ بظاہر کوئی امکان نہیں ہے (منشور دہلی ۱۲ نومبر ۱۹۴۵ء)

ان بیانات اور پیغامات کا ملک میں جو اثر ہوا اس کے متعلق پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں علامہ عثمانی کا ملک میں اثر

جمیۃ العلماء ہند بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء عظیم الشان یکم محرم ۱۳۶۵ھ بروز جمعہ صبح کے وقت علامہ عثمانی کے دولت خانے پر دلا بند میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا عبدالمحکم صاحب

صدیقی، مولانا عبدالحنان صاحب، مولامفتی عتیق الرحمن صاحب رحمہم اللہ تشریف لائے۔ مقصد نیک تھا اور یہ سب حضرات یہ چاہتے تھے کہ علمائے دیوبند کے سیاسی خیالات میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ان حضرات کا مولانا عثمانی سے سو اتین گھنٹے تک سلسلہ کلام جاری رہا۔ گفتگو کا نقطہ خیال یہ رہا کہ آیا مسلمان ہند کے لئے مسلم لیگ میں شرکت کرنا اور پاکستان کا مطالبہ کرنا درست ہے یا کانگریس میں شریک رہ کر متحدہ ہندوستان میں ہندو مسلم دونوں کی متحدہ حکومت قائم کرنا۔ علامہ عثمانی لیگ کے علمبردار اور یقیہ حضرات کانگریس کے طرفدار تھے۔

یہ مکالمہ جو مکالمۃ الصدرین کے نام سے چھپا اور مولانا محمد طاہر صاحب نے مرتب کیا اہل بصیرت کے لئے سیاسیات ملکی کا بہترین ذخیرہ ہے اور اس میں اس دور کی سیاست کی روح موجود ہے۔ ہم نے علامہ کے تمام خطبے، بیانات وغیرہ خطبات عثمانی کے نام سے مرتب کر کے چھاپ دئے ان میں یہ سب امور درج ہیں۔

لیگی اور کانگریسی
مسلمانوں کا فارمولہ

مکالمۃ الصدرین میں علامہ نے لیگی فارمولے اور کانگریسی مسلمانوں کے فارمولے پر جو کلام فرمایا وہ حسب ذیل ہے جس سے پاکستان کی صحیح پوزیشن

کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے فرماتے ہیں :-

”اس وقت ہم کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلم اور غیر مسلم آبادی میں کیا تناسب ہے۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب کی طرف سے کہا گیا کہ پاکستان میں مجموعی تعداد مسلمانوں کی چھ کروڑ ہوگی اور غیر مسلم تین کروڑ ہوں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تعداد غلط ہے۔ مجموعے میں مسلمان تقریباً سو اسی کروڑ ہیں لیکن ہم سات کروڑ تسلیم کئے لیتے ہیں، اور غیر مسلم جو تین کروڑ سے کم ہیں ان کو پورے تین کروڑ فرض کر لیا جائے اس

تعداد سے سات اور تین کی نسبت مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ہوگی۔ اور مجموعہ آبادی میں آپ کے فرمانے کے مطابق ساٹھ اور چالیس کی نسبت ہوگی یعنی مسلمان ساٹھ فیصدی اور غیر مسلم چالیس فیصدی ہوں گے (حالانکہ اس صورت میں مجموعہ میں مسلمان واقعہً ستر فیصدی اور غیر مسلم تیس فیصدی ہوتے ہیں)..... اب آپ اپنے فارمولے پر نظر ڈالئے کہ اس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مرکزی حکومت میں کیا تناسب ہوتا ہے تو آپ کے فارمولا کی رو سے مرکز میں چالیس مسلمان ہوں گے اور چالیس ہندو اور تیس فیصدی میں دیگر اقلیتیں ہوں گی اس طرح آپ کے فارمولا کے لحاظ سے غیر مسلموں کی تعداد ساٹھ فیصدی اور مسلمانوں کی تعداد چالیس فیصدی ہوتی اور مسلم لیگ کے پاکستانی فارمولا میں (بقول آپ کے یہ نسبت علی العکس رہے گی، یعنی) ساٹھ فیصدی مسلمان اور چالیس فیصدی غیر مسلم ہوں گے۔ (حالانکہ حقیقی تناسب پاکستانی فارمولا میں ستر فیصدی اور تیس فیصدی کا ہوتا ہے) اب آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ آپ کے اس فارمولا سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچا (ہم اگر ساٹھ فیصدی رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تو چالیس فیصدی میں کیا کر سکیں گے)..... اس موقع پر کہا گیا کہ عیسائی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب پاکستان سامنے آتا ہے تو عیسائی مسلمانوں سے علیحدہ غیر مسلم بلاک میں شمار کئے جاتے ہیں اور جب جمعیتہ العلماء ہند کا مقصد فارمولا پیش کیا جاتا ہے تو وہی عیسائی (گویا مکمل پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور) مسلمانوں کے سایہ میں شمار کئے جانے لگتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ غیر مسلم سب کے سب ہر صورت ایک ہی شمار ہوں گے (الکفر ملۃ واحد)

اور خالص مسلمانوں کو ان سب کے مقابل کھڑے مسئلہ پر غور کرنا چاہیے۔

وفدِ جمعیتہ العلماء نے آخر کار اس کو تسلیم کر لیا۔

(پھر علامہ عثمانی نے پوچھا) کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ ہندو پاکستان سے ہیر کیوں اس درجہ مضطرب و خائف اور اس کی انتہائی مخالفت پر تڑپا ہوا ہے۔

اس کے جواب میں مولانا حفص الرحمن صاحب نے فرمایا کہ ان کی کوئی مصلحت ہوگی۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس کی جو کچھ بھی مصلحت ہو آخر

آپ حضرات نے بھی کچھ غور کیا کہ وہ مصلحت کیا ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک تو اس کی مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت مردست

اد پر قائم ہے جسے آپ خود شروع میں تسلیم کر چکے ہیں۔ ہندو یہ چاہتا ہے کہ انگریزی حکومت کے زیر سایہ دس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک شخص

کی گردن پر سے بھی ہندو اکثریت کا جوا کبھی ادا نہیں کرنے نہ پائے اور اس طرح مسلمان ہمیشہ انگریز اور ہندو کی ڈبل غلامی میں باختیار خود پستے

رہیں۔ (مکالمہ ص ۱۳ تا ص ۱۴)

علامہ عثمانی کے اس مکالمے سے پاکستان کے مطالبے کی صحیح صورت حال اور

انگریزوں کے فارمولے کی جو حقیقت معلوم ہوئی وہ اس قدر روشن ہے کہ اس سے

پاکستان کا صحیح نظریہ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ نیز اس مکالمے سے علامہ کی بے پناہ

سیاسی فہم و فراست کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب کلکتے میں کل جمعیتہ العلماء اسلام آباد کی

بنیاد پڑی اسی وقت سے ان کی نظر انتخاب

صدار کا سہرا علامہ عثمانی کے سر

صدارت کے لئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی پر

پڑ رہی تھی۔ اسی لئے انہوں نے کلکتہ کی ”کل موثر علمائے اسلام ہند“ کے لئے علامہؒ کو دعوت دی تھی لیکن آپ بیماری کے بعد کے اثرات سے معذور تھے۔ ورنہ اس اجلاس کے موقع پر ہی آپ کو صدارت کی پیش کش کی جاتی تاہم جمعیتہ العلمائے ہند دہلی اور دیگر علمائے ہند نے تاثر ہے تھے کہ ”جمعیتہ العلمائے ہند دہلی“ کے علی الرغم ”کل جمعیتہ العلمائے اسلام ہند“ کی صدارت کا تاج اگر کسی سر پر رکھا جاسکتا ہے تو وہ صرف مولانا عثمانی ہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر ہندوپاک کے تمام علماء بھی مسلم لیگ کی طرف دست تعاون بڑھاتے تو وہ زور پیدا نہ کر سکتے تھے جو علامہ عثمانی نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے ان کو نظریہ پاکستان کی حمایت میں تحریک کو آسمان پر پہنچانے کے لئے صحت بخشی تھی۔ چنانچہ اسی مکالمہ الصدرین سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے عرض کیا کہ:-

”جمعیتہ العلمائے اسلام ہند“ محض ہماری جمعیت کے مقابلے میں اس کو قوت دینے کے لئے قائم کی گئی ہے مناسب ہو گا کہ آپ کم از کم اس کی صدارت قبول فرمائیں علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے ابھی صدارت کے قبول و عدم قبول کی نسبت کوئی باضابطہ فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن کل کے لئے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں گا“

(مکالمہ ص ۲۹ و ۳۰)

جمعیتہ العلمائے ہند دہلی کے حضرات یہ گوارا نہیں فرماتے تھے کہ علامہ عثمانی دوسری جمعیتہ کی صدارت قبول فرمائیں۔ وہ تو مولانا عثمانی کے اتنے ہی عمل اور لیگ کی حمایت و تائید کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ مگر علامہؒ نے، رجب کے اس مکالمے اور گفتگو کے بعد جمعیتہ العلمائے اسلام کی صدارت کو قبول فرمایا اور آپ صدر منتخب ہو گئے۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اپنی سوانح عمری انوار النظر
 میں جمعیتہ العلماء اسلام کی تحریک اور بنیاد اور اس
 کے پس منظر کے متعلق لکھتے ہیں :-

جمعیتہ العلماء اسلام
 کی تحریک !

” یہ جولائی ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے اس وقت مسلم لیگ مطالبہ پاکستان پرچی
 ہوئی تھی اور حکیم الامت (حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) کی جماعت اس
 (نظریہ پاکستان) کی حمایت کر رہی تھی۔ پھر یہ رائے ہوئی کہ مطالبہ پاکستان کے
 لئے علماء کو اپنا مستقل مرکز قائم کرنا چاہئے۔ کیونکہ جمعیتہ العلماء ہند (دہلی) انگریزوں
 کے ساتھ تھی۔ ہم نے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جمعیتہ العلماء اسلام کی بنیاد کلکتہ میں ڈلی
 چار دن تک اس کے اجلاس ہوتے رہے لوگوں کا بیان تھا کہ خلافت کا نفرین
 (کلکتہ) کے بعد ایسا اجلاس کلکتہ میں کبھی نہیں ہوا۔

اس اجلاس میں حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی (رحمۃ اللہ علیہ) کو صدر
 مرکزی منتخب کیا گیا۔ حضرت مولانا اس وقت علیل تھے۔ اس لئے کلکتہ شریف
 نہ لاسکے مگر اپنا ایک پیام مولانا ظہور احمد دیوبندی کے ہاتھ اجلاس میں پڑھنے
 کے لئے بھیج دیا تھا۔ اسی پیام کو سننے کے بعد میں نے تحریک کی کہ مولانا
 شبیر احمد صاحب عثمانی کو صدر جمعیتہ علماء اسلام منتخب کیا جائے۔ سب نے بالاتفاق
 اس کی تائید کی۔ اس قرارداد کو سیکرٹری دیوبند حاضر ہوا تو آبدیدہ ہو کر
 فرمایا کہ :

” بھائی میں تو سولہ مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ مجھ میں سفر
 کی ہمت کہاں ؟ اور اس کے لئے صدر کو جا بجا جیلے کرنا اور
 تقریر کرنا ہوگی۔ جیسا کہ مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیتہ علماء ہند
 جا بجا جیلے کرتے اور مطالبہ پاکستان کے خلاف تقریر کرتے ہیں۔“

میں نے عرض کیا آپ صدارت قبول فرمائیں کام کی ذمہ داری میں اپنے سر لیتا ہوں
مولانا عثمانی، خوش ہوئے اور صدارت قبول فرما کر جمعیتہ العلماء اسلام کی
بنیاد مضبوط کر دی ۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر
جمعیتہ علماء اسلام بننے کے بعد رو بہ صحت ہو گئے کہ اب انہوں نے دیوبند،
میرٹھ، دہلی وغیرہ میں پاکستان محال کرنے کے لئے مسلمانوں کو جو خبیثے انداز
میں تیار کیا۔

موبائی الیکشن کی جدوجہد میں آپ نے منجی، لاہور اور پشاور تک متعدد
جلسوں میں صدارت کی اور اپنی تقریروں سے مسلمانوں کو پاکستان کے لئے
دوش دینے پر آمادہ کیا؟ (انوار النظر ص ۵۹، ۶۲)

یہ تصاویر میں منظر جو علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے صدر جمعیتہ العلماء اسلام بنائے
جانے سے متعلق مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے تحریر فرمایا۔

یہ تاریخی مضمون تو علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی صدارت سے متعلق درمیان
میں آگیا۔ سلسلہ کلام تو جمعیتہ العلماء ہند دہلی کے وفد کا تھا کہ انہوں نے کہا تھا
کہ آپ اس جمعیت کی صدارت سے یکسو رہیں کہ یہ دہلی جمعیتہ العلماء کو توڑنے کے لئے بنائی
گئی ہے۔ مکالمہ الصدرین کے مرتب لکھتے ہیں :-

” لیکن اس (گفتگو) کے بعد علامہ عثمانی نے کل ہند جمعیتہ العلماء اسلام
کے ناظم کے تار کے جواب میں باضابطہ صدارت کی منظوری کا تار روانہ فرمایا
ہے۔“ (مکالمہ الصدرین ص ۶)

مکالمہ الصدرین کے مرتب لکھتے ہیں :-

” چلتے چلتے وفد کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو تحریرات آپ کی شائع ہو چکی

ہیں وہ بیان مسئلہ کے لئے کافی ہیں۔ اب اگر کھوئی اختیار کر لی جائے تو کیا بہتر ہوگا۔ لیکن علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لئے سکوت کیسے مناسب ہے؟ (مکالمہ ص ۳)
اس صورت حال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ عثمانی کے ان چند بیانات سے ہندوستان میں لیگ کو زبردست تقویت پہنچی اور کانگریس کے محل میں رخنہ اور شکاف پیدا ہو گئے۔

<p>حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریک خلافت کے زمانے سے ہی ہندوؤں کے ساتھ ملکر تحریک چلانے یا آزادی حاصل کرنے کے سخت خلاف تھے اور ان کی رائے صحیح تھی۔</p>	<p>حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کو مبارکباد</p>
-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------	------------------------------------------------------------------------------------

جب مسلم لیگ میدان عمل میں نکلی تو آپ نے قائد اعظم کو تبلیغ کے لئے رکھی وفد بھیجے اور سب سے پہلے وفد کا امیر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب کیا۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی وفد بھیجے جن کے ذریعہ قائد اعظم کو اسلامی احکام پر چلنے کی دعوت دی گئی تھی۔ الغرض جب مسلم لیگ میں علامہ کی سرگرمیاں کا حال حضرت تھانوی کو معلوم ہوا تو انہوں نے علامہ عثمانی کو ایک خط لکھا جس میں مبارکباد کا بیجا تھا۔

مسلم لیگ کے میدان میں عمل

مزید پیش قدمیاں

اس مختصر عرصے میں علامہ کا سیاسیات ملکی میں اتنا بلند مقام ہو گیا کہ گورنر آپ کے چرچے ہونے لگے اور قائد اعظم محمد علی جناح کے بعد جس شخص نے مسلم لیگ کو چار

چار چاند لگا دے وہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے بلکہ اگر مولانا لیگ کو مذہبی تقدس نہ جانتے تو صحیحۃ العلماء ہند دہلی کے مقابلے میں لیگ کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب علامہ لیگ کو لیکر آگے بڑھتے ہیں اور بیانات اور اعلانات کی دنیا سے نکل کر تقریروں اور جلسوں میں شرکت کے میدان میں قدم رکھتے ہیں کہ اب آپ کی صحبت نے آپ کو باہر نکلنے کی اجازت بھی دے دی ہے یا قدرت کا ملہ نے لیگ کو مذہبی حیثیت سے آگے بڑھانے کے لئے جس شخص کو چن لیا تھا اس نے ان کو صحت اور قوت بخش دی ہے۔

مرکزی اور وبائی اسمبلیا | حضرت عثمانی نے جب مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کیا تو آئندہ مرکزی اسمبلی کے انتخاب ہونے والے تھے۔

ان کے اعلانات اور لیگ میں شرکت اور مسلم لیگ کے ممبروں کو ووٹ دینے کی تحریک کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ بالخصوص مرکز میں مسلم لیگ کو بہت کامیابی ہوئی۔ بہت بڑا مقابلہ لیاقت علی خاں مرحوم اور کانگریسی امیدوار محمد احمد کاظمی کا تھا چنانچہ لیاقت علی کامیاب ہوئے گویا ان کی کامیابی مسلم لیگ کی کامیابی تھی اور اس میں مولانا کی کوششوں کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ ہم ذیل میں سید یعقوب حسن صاحب کا تاریخی بیان جو علامہ عثمانیؒ کے برادر زادہ مولانا زبیر افضل عثمانی سے انہوں نے روایت کیا ہے پیش کرتے ہیں جس میں حضرت عثمانیؒ اور مولانا مدنیؒ کے ووٹ ڈالنے سے تاریخی خاکہ پیش کیا ہے۔ یعقوب حسن صاحب کا یہ بیان زبیر صاحب سے مروی اخبار نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۴ء بروز جمعرات کی اشاعت میں ہوا ہے:-

(بیان کا متن آئندہ صفحہ سے شروع ہے)

لیاقت علیخاں کا ایک عظیم انتخابی معرکہ

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے دو

مولانا زبیر افضل عثمانی راوی ہیں کہ قائد ملت لیاقت علی خاں کی یاد آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسی کہ ان کے انتخاب کے وقت تھی۔ خوش قسمتی سمجھے یا بد قسمتی کہ ان کا حلقہ انتخاب ہمارا ہی ضلع بہار پور تھا۔ خوش قسمتی اس لئے کہ انتہائی مایوس کن اور نامساعد حالات میں کل ہند مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کو کامیابی سے ہکٹا کر کیا اور بد قسمتی یہ تھی کہ قریباً پورا ضلع مسلم اکثریت کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی دیوبندی کے ارادتمندوں کا مخصوص علاقہ تھا۔ دوسری طرف مقابلہ بھی بہت ہی قدیم اور مقبول لیڈر محمد احمد کاظمی سے تھا جن کی کانگریس سے وفاداریاں کانگریسی حلقوں میں ضرب المثل تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ نہرو سے لیکر ٹیل و پنٹھ تک سیم وزر کی تھیلیاں نیچا دو کرتے وقت شب و روز حلقہ انتخاب کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ ٹانا اور پرلا کی تمام دولت روپلی چاندی بن کر صرف ایک نشست کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ کانگریس نہیں چاہتی تھی کہ نوابزادہ اس حلقہ سے کامیاب ہوں۔

انتخاب کا وقت جتنا قریب آتا جا رہا تھا قائد ملت کی

گھبراہٹ میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ایک دن و مجسمہ حزن و طال بنے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوئے اس وقت علامہ شبیر احمد عثمانی نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا :-

”نوابزادہ صاحب ہم نے وحدانیت اور رسالت کا علم بلند کیا ہے

اور اگر خدا نخواستہ ہمیں ناکامی ہوئی تو ہم یہ سمجھ لیں گے کہ ہماری ہی کسی غامی کی وجہ سے تمام تر سعی و ہمت ہمارے ہاتھوں میں ناکام ہو گئی۔ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے تائیدِ غیبی کا انتظار کیجئے۔“

اس کے بعد قائدِ ملت نے علامہ عثمانی کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت کا انگریزوں و دوٹوں کی خریداری پر بے دریغ روپیہ خرچ کر رہی اور لوگوں میں تقسیم کر رہی ہے۔ میں نے بھی جب قائدِ اعظم سے دوٹوں کی خریداری کے لئے اجازت طلب کی تو قائدِ اعظم نے فرمایا:-

”اس کا تو بھول کر بھی تصور نہ کرنا کیونکہ جو لوگ آج اپنا دوٹ فروخت کر سکتے ہیں وہ کل پاکستان کو بھی بیچ ڈالیں گے۔ اور ہمیں ایسے کرائے کے ٹوٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں سوچتا رہا کہ قائدِ اعظم کا یہ قول کتنا زبردست طمانچہ ہے اس قوم کے منہ پر جو چند کھوٹے ٹکڑوں کے عوض اپنا ضمیر اور ایمان جیسی نامول شے کو بھی فروخت کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ قائدِ ملت کے رخصت ہو جانے کے بعد علامہ عثمانی نے ہمیں اور ہمارے چھوٹے بھائی عارف عثمانی ایڈیٹر ”تجلی“ کو بلوا کر فرمایا کہ ”مرض اور ضعف کی وجہ سے میری جو حالت ہے وہ تم دونوں کے سامنے ہے لیکن میرا تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنا ہر لمحہ نوازا دہ کے انتخاب کی کامیابی کے لئے وقف کر دو۔“

چنانچہ ہمارا انتخابی ہیڈ کوارٹر رڈ کی میں قائم کیا گیا تاکہ سہانپور سے دہرہ بونہ تک کام کرنے کا موقع مل سکے لیکن ہمارے پاس نہ تو چپ تھی، نہ کار۔ صرف بیل گاڑیوں پر قریہ قریہ مسلم لیگ کا پیغام پہنچانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے، جس کے نتیجے میں ہمارا کہیں تو دشنام طرازیوں سے استقبال کیا گیا اور کہیں پر سودا

کو سنگ و خشت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ خیر یہ حادثات تو ہمارے لئے قطعاً متوقع تھے مگر ایک غیر متوقع حادثہ پیش آیا کہ ہماری بیل گاڑی نشیب و فراز سے بے نیاز ایک گہرے گڑھے میں جا گری جس کی وجہ سے ہماری ایک ٹانگ قوت رقتار سے محروم ہی ہو کر رہ گئی لیکن ہماری نگاہوں میں پاکستان کا نقشہ تھا۔ مسلم لیگ کا سبز پلائی پرچم ہماری نگاہوں میں فردوس بریں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چاند تارا افراز عرش سے قلبِ مؤمن پر ضیا پاشیاں کر رہا ہے حسن و صداقت کا یہ ہلال پرچم سینہ طاغوت میں اس طرح گر کر گر گیا تھا کہ جس کی اذیت سے اسلام دشمن طاقتیں درد سے کراہ اٹھی تھیں۔ اس پرچم کی سربلندی کے لئے مسلمان نوجوان جان کی بازی لگاتے ہوئے بیاں لگ دہل کہتے پھرتے تھے:

”سینے پہ گولی کھائیں گے اور پاکستان بنائیں گے“

یہی وہ جذبہ قومی تھا جسے دیکھ کر قائد اعظم نے گاندھی سے فرمایا تھا:

”گاندھی جی میری نگاہیں پاکستان کے سنہرے کلس دیکھ رہی ہیں“

اللہ اکبر کیا جذبہ تھا کہ حصولِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کے عزمِ آہنی نے مشرکین و نصاریٰ کے فولادی بیجوں کو مردہ کر رکھ دیا تھا۔ تمام شیطانی منصوبے ناکام ہو کر رہ گئے تھے ادھر انتخابی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوتی جا رہی تھیں اور ہمیں ہر کام پر دشمنانِ مسلم لیگ مسلمانوں سے واسطہ پڑ رہا تھا لیکن دار و درن کے شہیدانِ یقین محکم کی بیڑیاں پہنے قید و بند اور شکوک و شبہات سے بے نیاز، رہم منزل سے نا آشنا محض اپنے مولیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی میں ایک نادیدہ منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ انجام کی بے خبری نے آغاز کو اور بھی تابناک بنا دیا تھا۔ بس ایک ہی دھن تھی اور ایک ہی لگن تھی جس نے مسلمانوں کو کفن و دفن کے شہادت کی مقدس راہیں دکھا رہی تھیں اور ہم بھی طاؤس و

رُباب کو خیر باد کہہ کر تیغ و سناں کے زمرے میں شامل ہو چکے تھے اور وہ یوم
حصانِ قریب آتا جا رہا تھا جس دن اعمالِ شکاری کے بجلے رستے شکاری کے
ذریعہ تقدیرِ مسلم کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ پاکستان وجود میں آتا یا نہ آتا ہمیں تو بس
یہ یاد امن گیر تھی کہ ہمیں اسلام کی ہر ملندی کفر کی برتری سے مجروح اور بتِ نیکون
پرست گروں کا غلبہ نہ حاصل ہو جائے۔

اسی انتخابی مہم کے سلسلے میں سردار عبدالرب نشتر مرحوم بھی دیوبند پہنچ گئے
ان کا قیام علامہ شبیر احمد عثمانی کے یہاں ہوا اور مہمانِ نوازی اور میزبانی کے فرائض
ہم جیسے ناشناس آداب کے سپرد کر دیئے گئے لیکن مہینوں کی تکمان و شب
بیداری کے بعد گرم کھانے اور نرم بستر نے ہمارے اندر شاعری کے ذوق کو جنم
دینا شروع کر دیا اور ہم نے بھی یہ سوچ کر اُسے پروان چڑھانے کا موقع دیدیا کہ
معزز مہمانِ نشتر کی میزبانی کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت ممکن نہیں کہ ہم بزبانِ
شاعری ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کریں۔ شب میں جب علامہ
عثمانی کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا تو سب سے پہلے قرعۂ فال اسی دیوانے کے نام
نکلا۔ اس سپاسنامہ کے آخری تین بند ہیں آج تک یاد ہیں جو سماعت کے لئے ہدیہ
قارئین ہیں۔

رُگِ باطل کو دید و جا کے خیر ؛ حق کے سانچے میں ڈھل گیا ہے نشتر
کیسی تیزی سے کیا روانی ہے ؛ دشمنِ قوم دیکھ لیں اگر
حق کے نشتر کی دھارا بھی دیکھیں ؛ شیرِ سرحد کا بیار بھی دیکھیں
اس منظوم سپاسنامے کے خاتمے پر علامہ عثمانی اور نشتر مرحوم نے مسکراتے ہوئے ہاری
میزبانی پر ہر تصدیق ثبت کر دی۔ سہارنپور کے ایک منچلے رئیس نے اپنی کارہاں
لئے وقف کر دی تاکہ ہم تمام انتخابی حلقوں کا بجملت مکنہ جائزہ لیتے رہیں جس کے
بعد سیل گاڑیوں سے نجات مل گئی اور ہم خورد و نوش سے بے نیاز مکمل جوشِ عمل

کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور اگر کعبہ اہلسک
ناکامی کا وسوسہ پیدا بھی ہوا تو ہمارے عزم و عمل میں اور بھی تیزی و تندہی آتی
چلی گئی۔ اسی دوران گاہے گاہے قائد ملت لیاقت علی خاں سے بھی ملاقات
ہو جاتی اور ان کا بھولا بھالا بھاری بھر کم مسکراتا چہرہ ہماری سعی بیہم پر مسکرائیں
بکھیر دیتا آخر کار وہ یوم حساب آہی گیا جس کے لئے یہ تنگ و دو جہاں تھی۔ اس
دن ہماری ڈیوٹی اپنے ہی وطن دیوبند میں لگا دی گئی اور ہم نے اذانِ سحر کے
بعد ہی ایک تانگہ میں مائیکروفون فٹ کر کے کوچہ گردیان شروع کر دیں اور
ہر ہر بام و در کو مسلم لیگ کا پیغام سناتے چلے گئے۔

اس جوش و خروش نے لوگوں میں حرارت ایمانی کو اس درجہ فروزاں
کر دیا کہ کانگریسی مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کے متعلق نظر ثانی کی
ضرورت محسوس ہونے لگی۔۔۔۔۔ کانگریسی حلقہ اپنی یقینی کامیابی کے دُرم
میں بینڈ باجے سے لیس نتیجے کے انتظار میں کھڑا تھا لیکن مشیت کا مقابلہ کون
کر سکتا ہے یکایک مائیکروفون پر غیر سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ کانگریس کے مقابلے
میں مسلم لیگ کو ۲۲۱ ووٹ زیادہ ملے ہیں۔ اس خبر سے کانگریسی حلقوں پر کیا
گذری اس کا علم تو خدا ہی کو ہے لیکن ہمیں اپنی سماعت پر قطعاً یقین نہیں آ
رہا تھا اور جب مسلم لیگ کے کارکنوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کی اس
وقت یقین ہو گیا کہ سعی انسانی کے مقابلے میں خدا کی طاقت بہت ہی بلند و بالا ہے۔
دیوبند مسلم لیگ کی کامیابی مسلم لیگ کے تمام حلقوں کی کامیابی کی ضمانت تھی چنانچہ
یہی ہوا کہ ہر ہر حلقے سے قائد ملت اور مسلم لیگ کی کامیابی کی اطلاعات پہنچتی شروع
ہو گئیں اور اس کامیابی پر علامہ عثمانی کا مسجد شکر تصدیق بن کر قیامت
تک کے لئے ثبت ہو کر رہ گیا ۛ

مسلم لیگ کانفرنس
میرٹھ کی صدارت

یہ کانفرنس جو صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں لیگ کے نمائندوں کو ووٹ دینے کے سلسلے میں کی گئی میٹھڑ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا عثمانی کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔

ہوئی علامہ اس میں خود شریک ہوئے۔ اپنے خطبہ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں :-

”میری ان چند منظور کو جو بہت عجلت میں اختتام کے ساتھ لکھی گئی ہیں

اگر آپ نے توجہ سے سنا اور میں کسی فیصلے پر پہنچ گئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت

بیکار نہیں گئی اور علالت و مجبوری کے باوجود جو سفر میں بادل ناخواستہ

اختیار کیا اس کا پھل مجھے مل گیا۔“ (خطبہ صدارت میرٹھ ص ۴۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ موصوف اب باہر نکلنے کے قابل ہو چکے تھے۔ خود

فرمایا کہ علالت کے باوجود بادل ناخواستہ جیلے میں شرکت کی اور خطبہ صدارت بھی اسی

حالت میں لکھ ڈالا۔ آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں لیگ کی موافقت کا مشورہ دیا

اور فرمایا کہ جو کانگریسی مسلمان کانگریس میں کام کر رہے وہ دراصل ہندوؤں کے

ساتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا :-

”مسلم لیگ قدرتی طور پر کانگریس کے ساتھ اس کی امدادی یا معاون

جماعتوں اور اشخاص کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ کیونکہ یہ جماعتیں اس وقت

جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ فی الحقیقت ہندو اکثریت کے مطلب کی باتیں ہیں جو ان

کی زبانوں سے ادا ہوتی ہیں۔ جدوجہد، محنت و مشقت اور دھڑ دھوپ

ان کی ہے اور اس کا میٹھا پھل آخر کار اسی ہندو قوم کو ملنے والا ہے۔ گویا

بقول اکبر مرحوم ان کی زبان حال اس طرح گویا ہے :-

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی

انہی کی محفل سنوارتا ہوں چسپراغ مسیرا ہے رات ان کی

میں نے جو اس کو اسے تردید جو اس کو دیکھے اسے تحسیر

ہماری نیکی اور ان کی برکت عمل ہمارا نجات ان کی

اکبر الہ آبادی کے اشعار پر علامہ سر دھنتے تھے اور اپنے مطلب کے اشعار اس خوبصورتی سے فٹ کرتے تھے کہ زبان چٹخارے لینے لگتی تھی۔ علامہ نے فرمایا کہ جو مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر کوشش کر رہے اس کا فائدہ ہندوؤں کو نیچے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو لیگ میں شامل ہو کر اپنے علیحدہ حقوق منوانے چاہئیں چنانچہ آگے چل کر اسی خطبہ میرٹھ میں علامہ لکھتے ہیں :-

”مسلم لیگ کا کہنا یہ ہے کہ جب دو قومیں جدا جدا ہیں تو آزادی ان میں

سے ہر ایک کا حق ہے ان میں سے ایک ہمیشہ دوسرے کے رحم و کرم پر کیوں

ہے۔۔۔۔۔ اس لئے ہم کم از کم یہ جانتے ہیں کہ آج کل

کے اصول کے مطابق تہی صوبوں میں جس قوم کی اکثریت ہو وہاں اس کی آزاد

حکومت ہو (خطبہ میرٹھ ص ۱)

اس کا نفس کا مقصد و مہم ٹھہرے منہ عقیدہ ہوئی

اور جس کی صدارت علامہ نے کی، خود علامہ کی زمانی

منجھنے۔ اپنے اسی خطبہ صدارت میں لکھتے ہیں :-

میرٹھ کی مسلم لیگ
کا نفرس کا مقصد

”مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں حق سبحانہ تعالیٰ نے مسلم لیگ کو جویشمال

کامیابی عطا فرمائی سب سے پہلے بارگاہ رب العزت میں اس پر شکر ادا کرنے اور

اس کی تسبیح و تحمید اور استغفار غرضی مشغول رہنے کی ضرورت ہے۔ خداوند قدوس

کی نصرت و اعانت سے اس عظیم النظیر کامیابی نے مخالفوں کے حوصلے پست

کر دے اور لیگ کے حامیوں کی ہمتیں بڑھادیں۔ مگر صوبائی الیکشن ابھی باقی

ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ طویل و غریب اور سخت جدوجہد و جانفشانی اور

تندہی کا محتاج ہے۔ مبادا کامیابی اور حوری رہ جائے اس لئے میں چند الفاظ صوبائی الیکشن کے دڑوں کی خدمت میں بطور مشورہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

موجودہ الیکشن میں جو نمائندے کسی قوم کی طرف سے جائیں گے ملک ہند کا آئندہ مستقل دستور بنانے میں انہی کا دخل ہوگا اس لئے ووٹ دینے والوں کو قربت، پارٹی، لالچ، دوستی، تلمذ (شاگردی) پیری مریدی اور عقیدت وغیرہ کے تمام تعلقات سے قطع نظر کر کے اپنی غلط ذمہ داری کو اچھی طرح محسوس کر لینا چاہئے۔ (خطبہ صدارت ۱۹۵۷ء)

تلقین پابندی احکام اسلام | اعلام نے اپنے خطبوں میں نہ صرف سیاسیات کی گتھیاں سلجھائیں بلکہ ہر خطبے میں مسلم لیگ کے کارکنوں اور عوام کو احکام اسلام کی پابندی کرنے کی تلقین فرمائی چنانچہ میرٹھ کے خطبے میں بھی فرماتے ہیں :-

”قرآن کریم کی ہدایت و احکام پر عمل کرنے کے لئے کچھ قیام پاکستان ہی کی ضرورت نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو پاکستان کا ملنا احکام شرعیہ اور تعلیمات قرآنیہ پر استقامت کے ہمارے عمل درآمد رکھنے کا ثمرہ ہوگا۔“

فرض کیجئے کہ پاکستان بلے نہ ملے۔ جلد ملے یا دیر سے ملے قرآنی احکام، تو کسی وقت بھی معطل نہیں ہو سکتے۔ تاہم استطاعت ہم کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہمہ وقت احکام اسلام کی پابندی ضروری ہے۔ (خطبہ میرٹھ) آگے چل کر علامہ تحریر فرماتے ہیں :-

”خدا کی قسم اگر ہماری قوم کے بڑے آدمیوں نے عملاً قرآنی احکام کی پابندی بلا تاخیر اور بلا کسی ہچکچاہٹ کے شروع کر دی تو موجودہ تحریک میں بے حدود

صحاب زور پیدا ہو جائے گا یہ (خطبہ میرٹھ ص ۲۴۵)
ایک اور جگہ اسی خطبے میں لکھتے ہیں :-

”میں تمام ذمہ دار قائدین کو ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے نہایت پروردگار
طریق پر دعوت دیتا ہوں کہ خود اپنے اعلان کردہ الفاظ کے مطابق قرآنی احکام کی
بسترا و علانیۃ پابندی فرمائیں۔ اور مسلمانوں کو برابر یہ اطمینان دلاتے رہیں کہ
انکیشن میں کامیابی کے بعد دستور سازی کے وقت ہم اپنی امکانی حد تک کوئی ایسا
قانون بنائے جانے کی اجازت نہ دیں گے جو ہمارے پرسنل لا اور شرعی معاملہ
کے بارے میں علمائے اسلام کے طے کردہ فیصلے کے خلاف ہو۔“
خطبے کے آخر میں حضرت عثمانی فرماتے ہیں :-

”خاتمہ کلام پر ایک اور ضروری چیز پر تنبیہ کرنا ہے وہ یہ کہ آپ اپنے
جوش، ولولہ، عزم اور استقلال کے ساتھ مسلم لیگ کو آگے بڑھانے، اچانک
سنوارنے اور نکھارنے میں سرگرم رہتے اور ساتھ ہی اس کے نام کی لاج لکھتے
دیکھتے یہ مسلم لیگ ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے اَلْمُسْلِمُونَ مِنْ اَسْلَمُوا
اَلْمُسْلِمُونَ مِنْ اَسْلَمُوا (مسلمان وہ ہے کہ اس کے ساتھ اور
زبان سے مسلمان محفوظ رہیں) جو لوگ آپ کے سیاسی افکار کے مخالف ہیں
ان سے بھی آپ کا معاملہ شرافت، صبر و تحمل اور حسن اخلاق کے ساتھ ہونا چاہیے
گو دوسری طرف سے کچھ زیادتی اور اشتعال انگیزی بھی کی جائے بعض مقامات
پر جو ناشائستہ برتاؤ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ کیا گیا ہے اگر
اس کے متعلق اخبارات کی روایات صحیح ہیں تو میں اس پر اظہارِ بیزاری کئے بغیر
نہیں رہ سکتا۔ مولانا کی سیاسی رائے خواہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو ان کا علم و فضل
بہر حال مسلم ہے۔“ (خطبہ میرٹھ ص ۲۴۶)

علامہ میدانِ عمل میں | تحریروں اور پیاموں کی دنیا سے نکل کر میرٹھ کی مسلم لیگ میں شرکت کرنے کا یہ پہلا قدم تھا جو علامہ نے اٹھایا

اور بعد ازاں ملک میں مسلم لیگ اور پاکستانی کی خاطر دورے کئے۔ ان تمام سرگرمیوں کو ہم تفصیل کے ساتھ ”تجلیات عثمانی“ کے ”سیاسیات“ کے حصے میں تحریر کر چکے ہیں۔ البتہ یہاں بھی بعض خطبوں اور کانفرنسوں کی اجمالی کارروائی پیش کرتے ہیں۔

میرٹھ کانفرنس کا اثر | مولانا محمد متین ظلیب صاحب جو پاکستان کے عالم وجود میں آنے سے پہلے جمعیتہ العلماء صوبہ پنجاب کے صدر بھی رہے ہیں

اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :-

”میرٹھ میں ایک عظیم الشان کانفرنس ہوئی جس میں نواب محمد اسماعیل خان

صاحب، چودھری خلیق الزمان اور دیگر علماء اور زعماء بکثرت شامل ہوئے۔

شیخ الاسلام (علامہ عثمانی) نے صدارت کی..... میرٹھ کنفرنسی کے حالات

ایک دم میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے حق میں بدل گئے۔“

(انقلاب کراچی ۲۴ مارچ ۱۹۵۶ء، کالم ۲)

۲۵-۲۶-۲۷ خبوری ۱۹۴۶ء مطابق ۲۰-۳۱

۲۲ صفر ۱۳۶۵ھ کو اسلام آباد کالج لاہور کے گراؤنڈ

میں صوبہ پنجاب کی جمعیتہ العلماء کی زیر دست

صوبہ پنجاب جمعیتہ علماء اسلام
کانفرنس لاہور کی صدارت

کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی اس

کانفرنس کا خطبہ صدارت سیاست ملکی اور بننے والے پاکستان نیز مسلم لیگ کے جسم

میں تانہ رُوح پھونکنے والا صورت تھا جس نے سیاست کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ یہ خطبہ

علامہ کا زیر دست سیاسی، مذہبی، اقتصادی شاہکار ہے جو ۲۰-۳۰-۳۱ (سائز) کے اشی

صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس خطبہ میں علامہؒ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بچی اور بی

مسلمان ہی رام راج کی تیاری کرنے والے ہندوؤں کی گرفت سے آزاد اور

محفوظ ہو جائیں تو کیا یہ کوئی فائدہ کی چیز نہیں؟ خطبہ لاہور ص ۴۵-۴۶

تجربہ علامہ کا بیان مسلمان اقلیت کے ہندوستان میں تحفظ سے متعلق دو حصوں پر مبنی ہے۔ اول یہ کہ چونکہ ہندو اقلیت پاکستان میں ہوں گی اس

لئے ہندوستان کا مسلمان محفوظ رہ سکے گا اور دوم یہ کہ سات کروڑ مسلمان اگر پاکستان کے باعث رام راج کے بچے سے نکل جائیں تو پاکستان بننے سے پھر بھی فائدہ ہے۔ علامہ کی دونوں باتیں درست ہیں۔ چنانچہ لیاقت نہرو پکیٹ اقلیت کی حفاظت کے متعلق

ہوتا ہے اس کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں پر اب تک ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ حملے کئے گئے ہیں۔ ان کے گھروں کو جلا یا گیا ہے۔ ان کے سامانوں کو لوٹا گیا ہے۔ ان کے

خون سے بار بار ہولی کھیلی گئی ہے۔ ۲۰ اور سب سے بڑا المیہ کلکتہ میں ہوا کہ وسیع پیمانے پر سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ گھروں سے نکالا گیا۔ مسلمان

عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں ایک آدھ دفعہ ہندوؤں پر بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے کشمیر سے موئے مقدس کی چوری کے سلسلے میں

گھسٹنا میں دست درازی کی جو حکومت پاکستان نے روک دی۔ حتیٰ کہ اب ہندو جنہوں نے مشرقی پاکستان چھوڑ دیا تھا واپس آ رہے ہیں۔

ہندوستان کی حکومت کوئی درحقیقت دنیا میں یوں تو ہزاروں سلطنتیں ہیں لیکن ہندو ذہنیت اور ہندو راج سے بدتر

بھلائی کی توقع بے سود ہے اور بے رحم حکومت شاید ہی کوئی ہو۔ جن کا نظریہ مسلمانوں کے متعلق یہ ہو کہ یا ان کو قتل کر دو یا ہندوستان سے نکال دو یا ان کو ہندو

بنالو۔ اس لئے علامہ عثمانی کا خطبے میں یہ نظریہ کہ ”اگر دس کروڑ میں سے سات کروڑ مسلمان ہی رام راج کے بچے سے نکل جائیں تو کیا یہ کم فائدہ ہے؟ بالکل درست ہے۔

آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں سے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں :-

پاکستان پر ہندوستانی
مسلمانوں کا حق

” ہم پاکستان کا تحفظ اس لئے کر رہے ہیں کہ ملت اسلامیہ کا سہیت مجموعی اس میں فائدہ ہے ۔
پاکستان پر ہندوستانی مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے

جتنا ہمارا ہے ۔ کیونکہ وہ ہماری ملی جائے پناہ اور ان کا اخلاقی سہارا ہوگا ۔ ہمارا ہندوستان سے کٹ جانا ہندی مسلمانوں سے کٹ جانے کے مرادف نہیں سمجھنا چاہئے ۔ مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے راستے میں جغرافیائی حدود ہندی کوئی شے نہیں ؟ (خطبہ لاہور ص ۳۲ و ۳۵)

مولانا ابوالکلام آزاد
کا بیان !

جب پاکستان بن چکا تھا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی ۔ دہلی میں بھی مسلمانوں کا خون بہا یا جا رہا تھا اور ان کو نکالا جا رہا تھا تو اس زمانے میں مولانا ابوالکلام نے دہلی کی جامع مسجد میں حجہ کی نماز کے بعد انہی ایک پُر زور تقریریں کیا تھا کہ مسلمانوں ! تم نے ہماری بات نہ مانی ۔ لیگ کے ذمہ دار تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ۔ اس بات کا جواب علامہ شبیر احمد سے سنئے :

علامہ عثمانی کا جواب

* آپ کو معلوم ہو گا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے جب مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ

کی طرف ہجرت کی تو مکہ معظمہ کے معابد (عبادت گاہیں) اپنے ساتھ اٹھا کر نہیں لے گئے اور بے کس و بے بس متضعین (کمزوروں) کو دین چھوڑنا پڑا جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے :-

وَالْمُسْتَضْعِفِينَ مِنَ النَّجَالِ | ” اور ان کے واسطے جو مغلوب

وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ
الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا
أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ
الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ
لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَ
اجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ
نَصِيرًا ۝

ہیں مرد اور عورتیں اور بچے جو کہتے
ہیں اے رب ہمارے نکال ہم کو
اس بستی سے کہ ظالم ہیں یہاں کے
لوگ اور کر دے ہمارے واسطے
اپنے پاس سے کوئی حمایتی اور کرنے
ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی
مددگار ۝

کفار مکہ ان ہی بعض مستضعفین کو ہجیر و اکراہ میدان بدر میں مسلمانوں
کے مقابلے پر بھی کھینچ لائے تھے تو کیا ان تصورات و امکانات کی موجودگی میں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کو پاکستان بنانے کا خیال ترک کر دیا تھا
یاں ہوا تو یہ ہوا کہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے تمام غیر مہاجر مسلمانوں کے متعلق
صاف اعلان کر دیا

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ
يُحَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ
شَيْءٍ
حَتَّى يُحَاجِرُوا وَإِنْ
اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ
فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ إِلَّا عَلَى
قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِلَّةٌ ۝

”اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں
چھوڑا۔ تم کو ان کی رفاقت سے
کچھ کام نہیں جب تک کہ گھر چھوڑ
آئیں۔ اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں
دین میں تو تم کو لازم ہے مدد کرنی۔
مگر مقابلے میں ان کو لوگوں کے کہ ان
میں اور تم میں عہد ہو“

تجزیہ | علامہ شبیر احمد عثمانی کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت

مسلمان اقلیت کو احکام اسلام ادا کرنے سے روکے تو پھر ان پر ہجرت کرنی ضروری ہو جائے گی۔ البتہ ہجرت کی شرطیں جو فقہ کی کتابوں میں درج ہیں ان پر عملدرآمد کرنا ہوگا۔

لیکن موجودہ دور ۱۹۶۴ء میں اور اس سے پہلے سالوں سے ہندوستان کی حکومت کا رویہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو خود زبردستی ہندوستان سے نکال رہی ہے۔ چنانچہ مغربی بنگال اور آسام سے اب تک کئی لاکھ مسلمانوں کو نکالا جا چکا ہے۔ اور راجستان سے بھی مسلمانوں کو نکالا گیا ہے۔ بلکہ لاہور اور امرتسر کی سرحد کے راستے سے بھی مسلمانوں کا اخراج ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کی حکومت وہاں کے چھ کروڑ مسلمانوں کو نکال سکے۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے حکومت ہندوستان سے بار بار اپیل کی لیکن اس کا تاہنوز کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ البتہ پاکستان سے گئے ہوئے ہندوؤں کو حکومت پاکستان بڑی فراخ دلی سے واپس لے رہی ہے اور ان کے مویشی، غلے، مکان اور سامان ان کو واپس دے جا رہے ہیں۔ یہ رواداری محض اس لئے ہے کہ ہندوستان کی حکومت بھی نکالے ہوئے مسلمانوں کو بلا کر دوبارہ لے لے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ حکومت ہندوستان کے مسلمانوں کے اخراج کا معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کریں گے۔ آج مورخہ ۹ جولائی ۱۹۶۴ء کے کوہستان اخبار لاہور نے ملک امیر محمد گورنر مغربی پاکستان کا یہ اعلان بھی شائع کیا ہے کہ حکومت پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ملک میں نہیں آنے دے گی۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے ان کا اخراج بند ہو جائے۔ یہی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ علامہ عثمانی لاہور کے اسی خطبے میں لکھتے ہیں:-

ہوگا جو اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو سکتا ہے اور اس کی زندگی ہندوستان پر موقوف نہ ہوگی چنانچہ علامہ ماہرین اقتصادیات کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

”اطلاعات سے پایا جاتا ہے کہ سندھ اور بلوچستان کے صوبجات میں مٹی کے تیل کے چھنے برآمد ہوئے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں سے اتنا تیل دستیاب ہو سکے گا جو کل ہندوستان اور پاکستان کے لئے کفایت کرے گا۔ علاوہ ازیں پاکستان کی زمین ہندوستان کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے اور اس میں ہر قسم کی پیداوار ہو سکتی ہے۔

فوجی طاقت | آبادی کے لحاظ سے پاکستان ایک بہت بڑا طاقتور ملک ہوگا اور اس کے باشندے نہایت خوبصورت، لالچے، مضبوط اور سڑوں جسم کے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ فوج میں ساٹھ فیصدی بھرتی اسی خطہ پاکستان سے لی جاتی ہے۔ اس کی آبادی قدرتی طور پر سپاہی ہے معدنیات کے لحاظ سے (خطہ پاکستان) معدنیات سے بھرپور ہے۔ نمک (کھیوڑہ) اور مٹی کا تیل (رائل) پنجاب میں کافی مقدار میں موجود ہے اور سینٹ کے لئے بھی یہاں بہت بڑا وسیع میدان موجود ہے“ (۵۷)

صنعت و تجارت کے متعلق علامہ عثمانی اپنے خطبے میں ماہرین کے خیالات کے

مطابق لکھتے ہیں :-

صنعت و تجارت | کشمیر اور بلوچستان کے خشک اور ترمیدہ جات پاکستان کی آبادی کی صحت اور خوشحالی میں بہت معاون ہو سکتے ہیں..... دودھ لگھی اور مکھن کے لئے مویشی انسانی زندگی کی جان ہیں اور یہ بات ہر شخص پر عیاں ہے کہ پنجاب کے پاکستانی علاقے میں بہترین مویشی پالے جاتے ہیں۔ بنگال

اپنی ضروریات سے کہیں زیادہ چاول اور پیٹن پیدا کرتا ہے۔ اس کی تجارت بہت کامیاب ہو سکتی ہے۔ (صفحہ ۶۱-۶۲)

آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں :-

”اچھا ان سب باتوں کو رہتے دیکھئے پھر کیا قوم اپنے موجودہ اقتصاد وسائل کی قلت پر نظر کر کے غلامی کی ذلت کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دے گی۔ آپ سرحدی آزاد قبائل کا حال نہیں دیکھتے کہ وہ اتنی بڑی طاہر سلطنت کے مقابلے میں باوجود انتہائی بے سروسامانی کے کب سے اپنی آزادی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ (صفحہ ۶۳-۶۴)

جمعیتہ العلماء ہند سے

جمعیتہ العلماء ہند اپنا فادولا کانگریس وغیرہ سے تسلیم کرانے تب دوسری مسلم جماعتوں سے دریافت کرے کہ تم اسے تسلیم کرتے ہو یا نہیں۔ عجیب بات ہے کہ کانگریس میں دوسری اقوام غالبہ کی شرکت کے لئے قوم کو معاہدے کی ضرورت نہیں مگر مسلم لیگ میں شریک ہونے یا اس کی تائید کرنے کے لئے جس کا دروازہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہے پہلے معاہدے کی ضرورت ہے۔ گویا مشرکین کی بات پر تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ کسی درجے میں بھی حسن ظن باقی نہیں رکھ سکتے۔“ (خطبہ لاہور ص ۶۷)

”مسلم لیگ میں جمہور اہل اسلام کی طاقت کو ساتھ لیکر وعدے دنا کرانے کا ہر وقت موقع ہے مگر کانگریس میں کبھی یہ اسکان ہی نہیں۔ سب سے اس کے کہ اکثریت اپنے لطف و کرم سے ہم کو بھی زندہ رہنے کا حق عطا فرمائے۔“ (صفحہ ۶۸)

جمعیتہ احرار سے

ہمارے احرار بھائی پہلے مسلم لیگ کے ساتھ ہو کر ہندوستان میں کوئی مناسب زمین حاصل کر لیتے پھر وہاں

حکومت الہیہ کی مضبوط عمارت بنوانے کی خدمت پوری قوت کے ساتھ

انجام دیتے۔“

اور کیا غضب کا ادبی ٹکڑا ہے یہ اور کتنی خوبصورت ہے یہ عبارت اور عقیدت جو علامہ نے لاہور کے خطبے میں تحریر فرمائی اور جس میں پاکستان کی پیشین گوئی کی گئی ہے:

”ہمارا عقیدہ ہے کہ تقدیر نے ہمیں پاکستان کے تحفظ کے لئے انتخاب

کیا ہے اور یہ چیز آئندہ نسلوں کو ورثہ میں ملے گی۔ امر وراثت ہمارا مذاق اڑائے

لیکن ہماری آنکھیں صبح فردا کے اس دلفریب خندہ کا نظارہ کر رہی ہیں،

جس کے پردے سے ہماری کامرانیوں کا مہر منیر طلوع ہوگا۔ اس صبح اسید

کی نمود تک ہم نامیدیوں کی شب تار کو انپی قربانیوں کے نور سے روشن

رکھیں گے اور اسلام کے سچے فرزندوں کی طرح ہر مصیبت کو خندہ پیشانی

سے برداشت کریں گے۔“ (ص ۶)

آگے چل کر پھر علامہؒ لکھتے ہیں :-

” فی الحال تو ہماری تمام تر مساعی اس نقطے پر مرکوز ہونی چاہئے کہ

ایک طرف حکومت اور دوسری جانب ہندوستان میں بننے والی قوموں

پر یہ ثابت کر دیں کہ یہاں کے جمہور مسلمانوں نے آخری طور پر فیصلہ کر لیا ہے

کہ ہم پاکستان لے کر رہیں گے۔۔۔۔۔۔ ضرورت ہے کہ اس ایک

دو ماہ میں (جو صوبائی الیکشن کا دور ہے) مسلمان چین سے تہ تیغیں اور ہر

فرد مسلم اپنی اپنی جگہ مطالبہ پاکستان کو حق بجانب ظاہر کرنے کے لئے ہر

امکانی کوشش عمل میں لائے۔ کاش جو مسلمان اس مطالبے سے علیحدہ ہیں

وہ بھی اس وقت متفق ہوتے یا کم از کم برسرِ پیکار ہوتے۔“ (ص ۷)

ایک جگہ علامہؒ اسی خطبہ میں لکھتے ہیں :-

” حالات کا آخری نتیجہ کچھ بھی ہو اور اس منزل کے قطع کرنے میں کچھ بھی مصائب کسی طرف سے پیش آئیں مگر ہندی مسلمان اب جاگنے کے بعد چکر ہونے کا اور اٹھنے کے بعد بیٹھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

سینے میں دل آگاہ جو ہو کچھ غم تو نہ کر ناشاد سہی
مشغول تو ہے بیدار تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی
ہر چند بگولا مضطر ہے اس جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بے جین سہی برباد سہی
وہ خوش کہ کروں گا قتل اسے یا قید قفس میں رکھوں گا
میں خوش کہ وہ طالب تو ہے مرا، ستیاد سہی جلا سہی

(خطبہ ۴۵-۴۶)

یونیسٹ پارٹی سابق صوبہ پنجاب میں برسرِ اقتدار تھی۔ یہ ہندو مسلمان اور سکھوں کی متحدہ پارٹی تھی جو حکومت کے بھی خواہوں کی جماعت تھی۔ اس زمانے میں گیلنسی حکومت برطانیہ کی طرف سے پنجاب کا گورنر تھا اور خضر حیات وزیر اعظم۔ خضر حیات نے قائد اعظم اور مسلم لیگ سے بے وفائی اور غداری کی۔ یہاں تک کہ خضر حیات نے ایک حکم جاری کیا کہ مذہب اور خدا کا نام لیکر کوئی شخص الیکشن کے میدان میں نہ آئے۔ قانونی طور پر مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے علماء اور لیڈر جو مذہب کے نام پر پاکستان کا نعرہ بلند کر رہے ہیں ان کو ایسا کہنے سے روک دیا جائے۔ علامہ شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ مسلمان یونیسٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے فہمائش کرتے ہیں، اور اللہ اور دین اسلام کے نام پر ہی ان کو للکار کر ان کے قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے خطبے میں فرماتے ہیں :-

” اب رخصت ہونے سے پہلے مجھے دو لفظ ادا کہتے دیجیے جو یہاں کی

برسر حکومت پارٹی سے متعلق ہیں۔ میں ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان باوجود پاکستان کے حامی ہونے کے کس نوعیت کا اختلاف مسلم لیگ سے رکھتے ہیں۔ میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں۔ ایسے دقیق سیاسی اختلافات کا سمجھنا شاید میری دسترس سے باہر ہے۔ اخبارات و جرائد سے جو کچھ مجھے اندازہ ہوا وہ یہ ہے کہ اصولاً اختلاف زیادہ شدید قسم کا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس نے عملاً ایک سخت نوعیت اختیار کر لی ہے۔ کیا پنجاب میں کوئی سمجھدار اور بااثر ایسا نہیں جو اختلاف کی اس گتھی کو سلجھا سکے۔ اوس و خزون کی ایک سو بیس سالہ جنگ کے اثرات کو اسلام کی ربانی تاثیر نے ایک آن میں ختم کر دیا تھا کیا آج ہمارا مشترک جذبہ اسلامیت اور اعلیٰ قومی مفاد کا تصور ایسے حقیر نزاعات کو ایسے نازک موقع پر ختم نہیں کر سکتا۔ ضرور کر سکتا ہے۔ مگر وہ ختم کرنا اسی خداوند قدوس کے نام پر ہوگا جس کا واسطہ دینا الیکشن کے زمانے میں جرم قرار دے دیا گیا۔ اکبر مرحوم نے شاید اسی دن کے لئے کہا تھا۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اک زمانے میں

اب فرمائیے کہ اگر گلینسی ہمارا خضر بن جائے اور خضر راہ ہی راستے سے ہٹلے لگے تو صحیح رہنمائی کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے؟

(خطبہ لاہور ص ۷۶-۷۷)

یہ ہیں وہ اقتباسات اور خیالات جو علامہ عثمانیؒ کے خطبات سے جبتہ جبتہ ہم نے قارئین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کر دئے ہیں۔ ان عبارتوں میں علامہ مرحوم کے تمام سیاسی خیالات اور جذبات، مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت، مطالبہ پاکستان

ایکشن میں لیگ کو کامیاب بنانے کی اپیل، اقلیت کی حفاظت پاکستان بننے کے فوائد، کانگریس میں شرکت کے نقصانات غرضکہ کوئی پہلو ایسا نہیں رہا ہے جو علامہؒ کے مذکورہ بالا پیغام، مکالمہ، خطبہ یا نئے صدارت میں نہ آگیا ہو لہذا مزید خیالات کو پیش کرنے کی چند ضرورت نہیں ہے۔

ہاں یہ کہنا پڑے گا کہ علامہ عثمانیؒ کے خطبوں کا ملک کے طول و عرض میں بڑا اثر ہوا۔ ہم ان خطبات اور سیاسی خطوط کو علیحدہ کتاب کی شکل میں انشاء اللہ تعالیٰ طبع کر کر شائع کریں گے۔ اگرچہ ہم نے ”انوار عثمانی“ مکتوبات عثمانی میں ان سیاسی خطوط کو شائع کر دیا ہے۔ یہ دو سطر ہی ہم آج جولائی ۱۹۶۹ء میں نظر ثانی کرتے ہوئے بڑھا رہے ہیں حالانکہ ہم نے اس کتاب کا اکثر حصہ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں لکھ لیا تھا۔ اور آخری کچھ اوراق اب ۱۹۶۹ء میں لکھ رہے ہیں۔ اور اب جولائی دسمبر ۱۹۶۲ء میں یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ علامہ کے یہ تمام خطبات، بیانات، پیغامات، فتوے اور تقریر چھپ چکی ہیں۔ صرف خطبات کی جلد بندی باقی ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اکتوبر یا نومبر ۱۹۶۲ء میں قارئین کے سامنے آجائیں گے۔ اب ہم ۱۹۶۲ء میں کتاب پر نظر ثالث ڈال رہے ہیں جبکہ اب اس کی کتابت ہو رہی ہے۔

جب علامہ عثمانیؒ مسلم لیگ کی حمایت اور پاکستان کے لئے
مجددی تلوار | سر دھڑکی بازی لگا رہے تھے تو آپ کے ایک دوست نے

آپ کو لکھا :-

”میں نے خواب میں حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کو دیکھا جو مجھے ایک

۱۔ ۱۹۶۲ء میں نذر سنٹر لاہور نے اس کتاب کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر بوجہ انشاء نیوکی مصنف کی ولایت کے بعد مکتبہ دارالعلوم نے اس کی اشاعت کا ارادہ کیا ہے۔ آج، ۱۹۸۱ء کو کتابت یہاں تک پہنچی ہے۔ حسین احمد نجیب سابق رفیق دارالتقنیف دارالعلوم کراچی ۱۵۔

چمکدار تلوار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرما رہے ہیں کہ عزیزم تم دیوبند جا رہے ہو
میں تمہیں یہ تلوار دیتا ہوں وہاں پہنچ کر میرا یہ تحفہ بعد سلام مسنون خیر عثمانی
کو دے دینا اس کے بعد اس کا کھل گئی۔

یہ سن کر علامہ عثمانیؒ نے فرمایا تھا کہ بھائی مسلم لیگ کی فتح یقینی ہے۔ یہی
وہ مجددی تلوار ہے جس سے اکبر کی قومیت متحدہ اور دین الہی کو فنا کے گھاٹ
اتارا گیا تھا۔ اب انشاء اللہ العزیز ہم اس مجددی حربہ سے کانگریس کی قومیت
متحدہ اور گاندھی ازم کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند ملا دیں گے۔

(حیاتِ شیخ الاسلام ص ۴۳)

ان کانفرنسوں کے علاوہ علامہ عثمانی نے ہندوستان
کے طول و عرض میں تعمیر و تاسیس پاکستان اور مسلم
لیگ کی خاطر دورے کئے۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں
میں تقریریں کیں۔ جلسوں میں شرکت کی۔ بجنور،

متر، ہندوستان میں؛
مسلم لیگ اور تعمیر پاکستان
کھیلے علامہ کی دیگر خوشیں

سہارنپور، مظفر نگر، کھنؤ، بمبئی، کانپور، دہلی وغیرہ کے دورے اور ہر جگہ تقریریں
فرمائیں۔

۱۸ مئی ۱۹۴۶ء کو ضلع اعظم گڑھ میں جمعیت
العلماء اسلام کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان
جلسہ منعقد ہوا آپ نے اس میں ایک نبردست
غلغلہ انداز تقریر فرمائی۔ آپ
نے فرمایا :-

پاکستان کے معرض وجود میں
آنے کے متعلق ضلع اعظم گڑھ میں
علامہ کی غلغلہ انگیز تقریر اور
پیشینگوئی ۱۸ مئی ۱۹۴۶ء

”پاکستان مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے کہ اس وقت انگریز اور ہندو
دونوں پاکستان کو نہیں مانتے۔ لیکن ایسا وقت آئے گا جب یہ دونوں

قومیں ان خود پاکستان دے دیں گی۔ لیکن اس کے لئے ہم کو اپنے بھولے ہوتے
فریضے اسلامی جہاد کو پھر سے یاد کر کے عمل کرنا ہو گا۔

(عصر جدید کلکتہ یکم جون ۱۹۴۶ء)

حضرت علامہ عثمانی کی تقریر کو بغور ملاحظہ فرمائیے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ
پاکستان کی پیشین گوئی فرما رہے ہیں جو پوری ہو کر رہی اور انگریز اور ہندوؤں نے
پاکستان کو تسلیم کر لیا۔

عصر جدید کلکتہ مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء کی اشاعت
علامہ کی صدارتی تقریر | میں علامہ کی ممبئی جمعیتہ العلماء اسلام کی سٹی کانفرنس
ممبئی میں مارچ ۱۹۴۶ء کی تقریر کے ایک جز کا حوالہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

علامہ نے ممبئی کانفرنس کی صدارت فرمائی اور چند دیگر صاحب، مسٹر عبدالقادر اور
مسٹر عبدالعزیز صاحب ایڈووکیٹ نے اس کانفرنس کا انتظام کیا۔ علامہ نے اپنی
صدارتی تقریر میں فرمایا :-

”پاکستان نہ کوئی نعرہ ہے نہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفی قدم، نفرت
کی پیداوار نہیں جیسا کہ کہا جا رہا ہے۔ یہ نظریہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ مختلف
صوبوں میں کانگریسی وزارت کے قیام کے بعد لاہور میں قرارداد منظور کی گئی :
میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ قرارداد لاہور کا مطالعہ کریں۔ آپ پر
حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ ہندوستان ہم لوگوں کا ہے۔ برطانوی حکمرانوں
کو چاہئے کہ وہ اسے مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ گوئی احوال ہم صرف ایک
تہائی حصے کے خواستگار ہیں“ (عصر جدید ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء)

اردو پارک دہلی میں جناب نواب قدیر الدین صاحب
کی صدارت میں جو مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا اس
میں تقریر فرماتے ہوئے علامہ عثمانی نے کہا :-

اردو پارک دہلی میں علامہ
کی تقریر، اپریل ۱۹۳۶ء

”مسلمان اس کے قائل نہیں کہ حکومت بعد از آزادی ہندوؤں کو مل جائے
اور مسلمان ان کے محتاج ہو جائیں۔ مسلمانوں نے اس مطالبہ پاکستان کو بروقت
پیش کر دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو بیک وقت
آزادی مل جائے۔ میرے بھائیو یاد رکھو کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سچ
لو اور سمجھ لو یہ دیکھو کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ خواہ کہنے والا کوئی ہو۔ ورنہ تمہارے
مفاد کی بات پیش کرے تو اس کو قبول کر لو“ (عصر جدید ۲۷ اپریل ۱۹۳۶ء)

”یہ ڈاڑھی منڈے گنہگار سہی، مسلمان تو ہیں۔ ہم ان سے وقت آنے
پر خدا اور رسول کا واسطہ دے کر مذہب کے نام پر ان کو خاموشی تو کرنا سکتے
ہیں۔ ہم کو یہ تو بتاؤ کہ گاندھی اور نہرو کو کس کا واسطہ دے کر تم خاموش کروا
سکتے ہو؟“ (عصر جدید ۲۷ اپریل ۱۹۳۶ء)

۱۹ فروری کو دارالامراء میں لارڈ لارنس نے اور
دارالعوام میں مسٹر اٹلی نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان
کی موجودہ سیاسی کشمکش کے حل کرنے کے لئے ایک
 وفد ہندوستان روانہ کیا جائے گا۔ چنانچہ برطانوی

کابینہ مشن کی اپریل میں آمد
علامہ شبیر احمد صاحب
عثمانی کا وفد کو تار

کابینہ نے مارچ ۱۹۳۶ء میں اس تجویز کے مطابق تین آدمیوں کا وفد روانہ کیا۔ اس وفد
کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے آئین کی کوئی تشکیل سوچی جائے اور اس کے دستور کی
کوئی صورت نکالی جائے۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو لارڈ اٹلی نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقلیت کے حقوق کا ہمیں پورا احساس ہے اور یہ کہ اقلیت خوف سے محفوظ اور آزاد رہ سکے لیکن دوسری طرف ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ اکثریت کی ترقی کے خلاف اقلیت دھڑو (اختیار امتناع) استعمال کرے۔ (پاکستان ناگزیر تھا از سید نریض کراچی ۱۹۶۷ء)

جب یہ وفد ہندوستان پہنچا تو حضرت علامہ عثمانی نے وفد کو ایک تاریخی جگہ میں پاکستان کے مطالبے پر شد و مد سے زور دیا گیا تھا۔ آپ نے وفد کو متنبہ کیا کہ اگر آپ لوگوں نے ہمارے نظریہ پاکستان کو نظر انداز کیا تو اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ آپ نے تاریخ میں تحریر فرمایا:-

”پاکستان ہماری قوم کا کم از کم مطالبہ ہے۔ ہر دو اقوام ہند کے مراکز اقتدار و حکومت خود اختیاری الگ الگ اور جدا گانہ ہوں۔ مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا اور مسلم قوم کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اس تاریخی قوم کے براہِ گنجۂ جذبات کو سخت آزمائش و ابتلا میں کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ایسے خوفناک نتائج پیدا نہ ہوں جو سب کے لئے ناخوشگوار اور نقصان دہ ہوں۔

ہندوستان کے ایک اہم حصے کو معطل کر کے کابینہ مشن اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ (عصر جدید، کلکتہ ۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء)

مذکورہ بالا کانفرنسوں اور جلسوں کے سوا آپ نے کانپور میں مسلم لیگ کی ایک سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کی جس کا انتظام مولانا حکیم سعید الرحمن صاحب مہتمم مدرسہ جامع العلوم کانپور نے کیا۔ بلکہ اس کانفرنس کی صدارت فرمائی۔

۲۹ اگست ۱۹۴۹ء کے بعد
۲۹ اگست ۱۹۶۹ء تک مذکورہ بالا مواد راقم الحروف کے قلم سے مسودے کے دو سواٹھ اسی صفحات پر

فل سکیپ کے سائز میں ترتیب میں آیا جو حیات عثمانی کے لئے زمیری کاوشوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا۔

ترتیب حیات عثمانی کا ایک اور دور بروزنگل ۲۶ ستمبر ۱۹۷۲ء

آج شعبان کی ۱۷ اور ۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء ہے اور ستمبر کی ۲۶ اور ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء منگل کا دن ہے کہ مدت کے بعد حیات عثمانی کی بقیہ تصویر کے لئے راقم الحروف نے قلم اٹھایا ہے جبکہ اس کتاب کی کتابت کا آغاز ہو چکا ہے اور

دس پندرہ کا پیاں کاتب صاحب زیر کتابت لایچکے ہیں۔ اس قدر بقیہ مسودے کے لئے تحریر میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ حیات عثمانی کی کتابت اور طباعت کا کوئی معقول انتظام نہ ہو سکا تھا۔ الحمد للہ کہ قدرت نے اب اس کی طباعت و کتابت کا سامان پیدا کر دیا لہذا الشب قلم بھی اب جولا نگاہ میں آسہنچا۔

دہلی کنونشن ۱۹۴۶ء میں علامہ عثمانی کی شرکت کی دہلی کنونشن میں

مسلم لیگ کا کوئی اہم اجلاس ایسا نہ ہوتا جس میں علامہ شرکت نہ فرماتے۔ انہی کا نفر نسول میں ۱۹۴۶ء کی دہلی کنونشن ہے۔ اس کنونشن میں دیکھنے والوں کی زبانی میں نے سنا کہ اجلاس کی شان دیکھنے کے قابل تھی۔ قائد اعظم بھی کنونشن میں تشریف لایچکے تھے لیکن اتفاق سے علامہ کچھ تاخیر سے پہنچے۔ آپ کی وجہ سے کنونشن کی کارروائی قدرے ملتوی کرنا پڑی اچانک علامہ عثمانی کنونشن میں تشریف لارہے ہیں۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ قائد اعظم ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے اور پر تپاک خیر مقدم کیا اور تمام ممتاز ارکان و رہنما احترام میں کھڑے ہو گئے

لہ مؤلف کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے یہ کتاب ہمیں ختم ہو گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

۳۰ زماہڑے غور سے سن رہا تھا، تم ہی سو گئے داستان کہتے کہتے اشتاق احمد قاسمی ۲۳ نومبر ۱۹۸۱ء کتابت: حسین احمد نجیب، ۲۰ محرم ۱۴۰۲ھ

ہم آئی!

بروفات

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی

✽
وصال شیخ الاسلام

مکمل ہوتا جاتا ہے زوال آدم خالی
مسات گزرا ارضی مسم ہوتی جاتی ہے
حیات اپنے قدم کیونکر چمکے فشر گیتی پر
اجل تو مدعی نظم عالم ہوتی جاتی ہے
زمانہ جس قدر تاریکیوں میں کھوتا جاتا ہے
اسی نسبت سے دین کی شمع مدھم ہوتی جاتی ہے
پیرا غ علم و عرفان سیاست بھتے جاتے ہیں
محفل اور ویراں اور یرم ہوتی جاتی ہے
تقاضے جیسے جیسے بڑھتے جاتے ہیں مسم کے
مری آنکھ اور گریاں اور یرم ہوتی جاتی ہے
سنواروں تو سنواروں کس طرح کیسے دہل کو
سنورتی جاتی ہے یہ زلف یرم ہوتی جاتی ہے

وصال شیخ الاسلام آہ یہ باد رکھتا ہے
 کہ ہستی کفر کی ہر لحظہ محکم ہوتی جاتی ہے
 وہ عالم وہ فقیر دین وہ خضر جادہ عسفاں
 وہ علم و فضل کا دریا غسل کا بحر بے پایاں
 وہ جس نے قول پیغمبر کا مطلب ہم کو سمجھایا
 کئے ملت پہ جس نے آشکارا معنی و سراں
 نکل کر آگیا ملت کی خاطر کج عزلت سے
 حقیقت بن گیا اس کی بدولت خوب پاکستان
 خدا کا خوف رکھتا تھا خدائی کا فدا لئی تھا
 ادھر شیدائی یزداں ادھر سودائی انساں
 اے چینا ہے ہم سے موت کے بے رحم ہاتھوں نے
 رہا جاتا ہے یہ ظلماتِ غم بے چشمہ حیاں
 مگر اے موت یسین نے ہمارا دین ہے امید
 مسلمان کو شکار یا س کر لینا نہیں آساں
 اُفق کے اُس طرف سے یہ صد آتی ہواں میں
 یقین اے مردِ مومن، عزمِ محکم اے مسلماناں



اخبار امروز ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء



شیخ الاسلام

علامہ شبیر احمد عثمانی

(از شجاع احمد زیتیا)

تقدیر پر شکوہ نہ فلک پر الزام
ہے موت ہی دراصل بشر کا انجام
کیا کم تھا عیش و فانی قاید زیتیا
اب ہم سے جدا ہو گئے شیخ الاسلام
(امروز اخبار لاہور)

رحلتِ شبیر

(حافظ امرت سیری)

ایک چپر کا فلک نے اور دیا
موت کی زد میں آ گئے شبیر
خون روتے ہوئے ستاروں کے
منہ سے نکلا کہ مسلم دلگیر
بجھ گیا تیسری انجمن کا حیراغ
اٹھ گیا ایک اور عالی دماغ

آہ ! علامہ شبیر احمد عثمانی

(از رازِ یوسفی)

کیوں نہ سکوں ہو درہم برہم موت العالم ، موت العالم
کوچہ بہ کوچہ ، خانہ بہ خانہ برپا ہے شبیر کا ماتم
ملت بیضا تیری قسمت آہ و بکا اور نالہ پیہم
ٹوٹ پڑا ہے کوہِ الم اک قلب ہے بھاری آنکھیں پر غم
چرخِ ستمگر تیرا بُرا ہو

چھین لیا اسلام کا ضیغ

آپ تھے پیکرِ فہم و ذکا کے اور پیمبرِ دینِ ہدیٰ کے
چشمِ فلک نے کم دیکھے ہیں ملتے والے ایسے خدا کے
شیخِ رسالت کے پروانے اور دل دادہ اہلِ وفا کے
علم و عمل کے سچے پیکر ایک نمونہ صدق و صفا کے

مگر دریا سے پاک تھا سینہ

سرچشمہ تھے جو دوسخا کے

تو ہی بتائے چرخِ ستمگر اس کی تلافی ہوگی کیوں کر
کس دنیا سے ڈھونڈنے کے لائیں؟ آپ سے بڑھ کر آپ سے بہتر
کہاں ہے تیری نظریں کوئی؟ آپ کا ثانی آپ کا ہمسر
کیوں کرو خاموش رہے گا بھوٹ گیا ہو جس کا مقتدر

اس کشتی کا اللہ حافظ

ٹوٹ چکا ہو جس کا لنگر

وفات علامہ عثمانی

(مکتوب مولانا محمد سیدی بنام مولانا خیر محمد صاحب)

محکم و محترم حضرت مولانا خیر محمد صاحب دامت برکاتہم۔
بعد سلام مسنونہ آنکھ گرا می نامہ صادر ہوا۔ اس حادثہ جانکاہ سے دل
و دماغ متاثر ہے۔ آپ کے تسلی آمیز کلمات سے سکون ہوا۔

(حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کی تقریباً ویسی ہی
حالت تھی جیسی کہ چند روز قبل آپ نے دارالعلوم کے جلسے کے موقع پر دیکھی
تھی یعنی عام صحت پہلے سے بہتر ہی تھی، جامعہ عباسیہ بہاولپور کی تعمیر
جدید کالنگ بنیاد رکھنے اور نصاب وغیرہ کے سلسلے میں مشورہ کیلئے ۸ ستمبر
کو بہاولپور کے لئے روانہ ہوئے۔ ۱۲ رگورات بالکل اچھے تھے۔ ۱۳ رگ
شب میں بخار ہوا اور سینہ میں کچھ تکلیف رہی۔ صبح کو طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی۔
۹ بجے پھر سینہ میں تکلیف ہوئی سانس میں رکاوٹ اور گھٹن محسوس ہوئی۔
علاج اور تدبیر بے سود رہی اور گیارہ بج کر چالیس منٹ پر واصل بحق ہو گئے
اتاللہ وانا الیہ راجعون۔ حق تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے اور ہم کو
جنت الفردوس میں ان کے ساتھ جمع کرے۔ آپ حضرات کی محبت اور ہمدردی
کے لئے ہم سب وابستگان خاندان بدل شکر گزار ہیں۔ والسلام

محمد سیدی - کراچی

۲۰ دسمبر ۱۹۴۹ء

خوش طہ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات و ذریعہ تعلیم بہار و پور
اسٹیٹ کی کوٹھی پر واقع ہوئی۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی صاحب مدنی
رحمۃ اللہ علیہ متوفی اکتوبر ۱۹۶۵ء بمقام مدینہ منورہ جو اس وقت بہار و پور میں مقیم
تھے مولانا عثمانی کو غسل دیا۔ پھر آپ کی میت کو لکڑی کے تابوت میں بند
کر کے کراچی لایا گیا جہاں بے شمار مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھی اور معنتی
محمد شفیع صاحب نے نماز پڑھائی اور آپ کا جسدِ خاکی اسلامیہ کالج چمشید
روڈ کراچی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اسلامیہ کالج تو بعد میں بننا جو دراصل
اسلامک ایجوکیشنل سوسائٹی کے ماتحت کھولا گیا۔ علامہ اس سوسائٹی کے
صدر تھے۔ میں کئی بار مزار پر انوار پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کرتا رہا ہوں اور مرثیہ
کا گرو غبار بھی بعض اوقات صاف کیا ہے۔ برابر میں جناب مولانا سید
سلیمان ندوی کا مزار ہے جو اس وقت زمین میں دفن کیا گیا تھا۔ انا اللہ وانا الیہ
راجعون۔

تاریخ نماے وفات مولانا شبیر احمد عثمانی

حفیظ ہوسٹیا رپوری

امام المتقین شبیر احمد عثمانی

۱

رخت ہستی از جہاں بر لبست آں عالی مقام
جانب ملک بقتار از عالم فانی بر رفت
او پر جنت آرمیدہ ما بہ دنیا سو گوار
اشک غم در چشم و بر لب "ہائے عثمانی" بر رفت

۲

شیخ الاسلام از جہاں رفت
رضواں اورا چو دید گفتا
کز خلد بریں رسید پیغام
شیخ الاسلام خلد آرام
۶۱۹ ۶۱۹

آہ وصال شبیر احمد عثمانی

آہ وصال علامہ روزگار شبیر احمد عثمانی

و اے شیخ الاسلام شبیر احمد مرحوم

۱۹

۶

۶۹

(روزنامہ امروزر کراچی جمعرات ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء)

تاریخ وفات

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی

(علامہ سیماں اکبر آبادی)

افسوس کہ علامہ شبیر احمد
در بہاولپور گرد از دہر خنہ رام
بست و یکم از صفر بدست شنبہ
از بزم جہاں رفت علیم علام
آں عالم دین و مفتی پاکستان
در حلقہ گزید بعدت اند آرام
خاکش بہ کراچی چوسپہ وند بہ خاک
از خلق بلند شد صدائے کہرام

سیماں بال جلتش تعجلاً

گفتم قدسی اساس شیخ الاسلام

۶۹ ھ ۱۳

(روزنامہ امروز کراچی ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء)

تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلام

(از ریاض محمود صاحب بخاری)

در یخ رو پوش گشت از جہنم لولوے آب دتاب ملت
مزید کردند حیف باپ غم دگر در کتاب ملت
چو سوز داد وقت فرصت برائے تاریخ وصال رحلت
ریاض محمود! گفت حکمت "نہاں شدہ آفتاب ملت"

۱۳۶۹ ھ

(روزنامہ زمیندار ۲۱ دسمبر ۱۹۴۹ء)

قطعه تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلامؒ

(از پیر عنایہ دستگیر صاحب نامی)

مرحوم شد چون شیخ عثمانی دل ماسد ز تیغ غم دو تسم
گفت نامی بسال رحلت او شیخ الاسلام قدوة استم
زمیندار ۲۶ دسمبر ۱۳۶۹ء ۱۳۶۹ھ

تاریخ وفات

(از قریشی احمد حسین احمد قلعداری)

بر وفات حضرت شبیر احمد پاک زاد! ناله افتاد در دل رخ و غمها شد کین
آه رفت از امام و افتخار عالمان خادم شرع متین رونق دنیا و دین
چون برائے سال عام الحزن کردم جستجو بر وفات فخرت بادل اندوه بگین

باحیاب ابجد - این یامن سرودش غیب گفت

”آسمان راحتی بود گر خون بسار دبر زمین“
۱۳۶۹ء ۱۹۳۹ء

درینا کہ شبیر منسرح نہاد ز باغ جہاں رفت خود چوں بہبت
زد دوش سن اوست، آشوب سخت و گراز ”امام بلند اختر“ است
رفت چوں از دھر مولانا کے ما با فروشان و شکوہ و تمنکنت
چوں ز تخت سلطنت برداشت پا سال او بشمرز ”تخت سلطنت“
رفت بفردوس امام زمان یعنی کہ از بزم جہاں خوش بخت
دید بفردوس چور ضوان اورا ”خسرو فرخندہ قدم“ سال گفت

(زمیندار ۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ء)

مادہ تاریخ وفات حسرت آیات؛

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

(از نتیجہ فکر جناب مولانا محمد ادریس صاحب مدرسہ مدرس
مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی)

علم و عمل، بذل و بحث، حکمت، کلام و افتا
دست قضا نے آہ سب کو بے سرو پا کر دیا

ل ۳۰۰
م ۴۰
ذ ۷۰۰
ح ۸
کم ۶۰
لا ۳۱
بق ۵۰۰

۱۳۶۹ھ

ل = ۳۰۰ م = ۴۰
ذ = ۷۰۰ ح = ۸

تاریخ الوصال

۶۹ ھ ۱۳

”صاحب جاہ رکن محترم دستور ساز اسمبلی“

۴۹ ع ۱۹

”تَوَرَّ اللَّهُ شَرَّ بَئَهُمْ“

۶۹ ھ ۱۳

آہ دنیا سے ہو گئے رخصت	شیخ الاسلام و شیخ پاکستان
یاس و حسراں غم و الم حسرت	وائے قیمت کچھ تمہی قیمت میں
سارے عالم پہ چھا گئی ظلمت	مہر دین مستین غروب ہوا
ہرزباں پر ہے ”یہ“ بعد حسرت	”موت عالم ہے موت عالم کی“
جاودانی ہے یہ عنہم فرقت	زندگی بے ثبات ہے۔ لیکن
حیف اے نامرادی قیمت	اٹھ گئے ایک باکمال بزرگ
ان پر ہو حناں سایہ رحمت	ہے دعائے عزیز محشر میں

سرسریت سے کہئے سال وقات

”شیخ الاسلام کر گئے سبقت“

تاریخ الوصال

علامہ دہر قبلہ طالبان مولانا شبیر احمد عثمانی

شیخ الاسلام والاقدام پاکستان

ادخله الله المحي في الجنة

از خاتمہ سید حبیب احمد افق کاظمی

فاضلہ جامعہ اسلامیہ شہر امروہہ

مولانا شبیر احمد عثمانی !	علامہ خوش نصیب اسلام گذشت
شیخ المتکلمین و رازی زمان	دانشمند لیبیب اسلام گذشت
بیشل امام فقہ و تفسیر و حدیث	اہل قلم و خطیب اسلام گذشت
امراض قلوب را دمش بود مسیح	آن روحانی طیب اسلام گذشت

تاریخ وصال او ہمین است افق

”شیخ الاسلام، ادیب اسلام گذشت“

تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلام

(از مضطر نظامی بی - ۱)

جس کی شمع علم سے پُر نور کل تک بزم تھی
 بزم میں اس صاحبِ تنویر کا ماتم ہے آج
 آہ اب صدق و یقین کی راہ دکھلائے گا کون
 سالکوں میں ایک مردِ پیر کا ماتم ہے آج
 کون اب کوثرِ لٹائے گا ہمارے واسطے
 مردِ مومن، عالمِ تفسیر کا ماتم ہے آج
 اب دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہو جانے کو تھیں
 ابرِ رحمتِ بار کی تاثیر کا ماتم ہے آج
 از سرِ حیف و بیاہلکھ لے نظامی سالِ داغ
 سالے پاکستان میں شبیر کا ماتم ہے آج
 ۱۹۳۹ء = ۱۰ + ۱۹۳۹



امیر ملت

(صوفی شید کا شہری)

اے کہ تو ہے پیکرِ روحِ صداقت بالیقین

اے کہ تو ہے مایہ دارِ شانِ بطوت بالیقین

اے کہ تو ہے مردِ مومن جانِ ملت بالیقین

اے کہ تو ہے منظرِ اسرار و وحدت بالیقین

قلبِ مومن میں مگر سوزِ محبت کیوں نہیں؟

ہم نے قیصر اور کسریٰ کو مٹایا ! یاد ہے

آدمی کو خوابِ غفلت سے جگایا ! یاد ہے

نعرہٴ تکبیر سے محشر اٹھایا ! یاد ہے

جو نہ کوئی کر سکا وہ کر دکھایا ! یاد ہے

آج ہم میں حیدرہٴ شوقِ شہادت کیوں نہیں؟

زندگی و موت کا ربط ہم ہے لازوال،

آج تیری قوم کا کوئی نہیں پرسانِ حال،

قوم کے سردار سے ہے قوم کا بھی اک سوال

تو نے سوچا بھی کبھی قومِ مسلمان کا مال

ہم مسلمانوں میں وہ رسمِ اتھوت کیوں نہیں؟

تو امیر المؤمنین ہے قوم کا سردار ہے
 تو سرورِ انجمن تو رونقِ گلزار ہے
 حکمران ہے تو قوم کا مختار ہے
 قوم کا معمار ہے تو قوم کا غنوار ہے
 عدلِ فاروقی کا منظر بھر دکھا دے ایک بار
 وارثِ سراں کو پھر مسلم بنا دے ایک بار



قطعہ تاریخ وفات حضرت شیخ الاسلام

(از پیر غلام دستگیر صاحب ناظمی)

دل ما بشد ز تیغِ غمِ دو نیم
 شیخ الاسلام قدوةِ احلیم

۱۳۶۹ھ

مرتل شد چوں شیخ عثمانی
 گفت نامی بسالِ رحلت او



آہ! شبیر احمدؒ

شد ہویدا قیامت صغریٰ یعنی بگذشت از جہاں شبیرؒ
عاطر ارکانِ عرش ہی گویند حیف از میر زمیں مہر منیرؒ

کل نفس ذائقۃ الموت

سرزمین پاک کا ہے آج ہر ذرہ اُداس آج روتی پھر رہی ہے آرزوئے پختہ کام
آج بے ہنگام درد و نالہ واہ و فغاں آج بے ختم تصور ہے بھی جئے خونِ اِلا
ہو رہا ہے خلوتوں میں صرصر غم کا گذر آج ہے کھوئی ہوئی سی زریا آغوشِ نظر
چھا چکا ہے مطلعِ منطق پہ آج ابرِ طال سوچتا ہے فلسفہ اپنی تمنا کا مال
آہ کے ہاتھوں ہے سینہ کوئی لیل و نہا علم و حکمت کی نگاہوں میں ہیں اشکِ گواہ
بے خودی کے دوش پر ہونا و شیون کا زور ضبط کی دنیا پہ قابض ہو چکا ہے آج شہزاد
غمرہ ارماں امیدیں آج محو اضطراب کھار دی ہیں فکر کی گہرائیاں بھی بیچ و تاب
طائرانِ خوش نوا مہسوتِ بیتِ عاشق ہیں گلستاں کے گلستاں مخموم ہیں مہوش ہیں
سنسناہٹ کر رہی ہے محفلِ عرفاں پہ راج دلوں لے پہنچے ہوئے ہیں سر پہ کارِ لانی کا تاج

سوچ میں ہیں کوہ و دشت و بحر و بر یہ کیا ہوا؟

کون آئینہ اس جہاں سے کوچ یکدم کر گیا؟

کون آخر دے گیا داغِ جدائی قوم کو؟ کس نے آخر پالیا ہے جاودانی قوم کو؟

کس کے غم میں ہوتا ظہر و چاند و ہنسا؟ کس کا ماتم کر رہی ہو آج مریض پاک؟
 آج بس اتنا ہی سمجھا دے ہمیں رب غفور! کون تھا وہ؟ آج کیوں بیتاب میں عقل و شعور
 دفعتاً آئی ندا! اے درو جان جستجو! ہم بتا دیتے ہیں تم کو لیکن فاضل پروا
 تم جسے شبیر عثمانی کہا کرتے رہے آج ہم نے لے لیا آغوش رحمت میں آ
 کل نفس ذالقة سے آشنا تم بھی تو ہو رحمتوں کا لینے والے اسرار تم بھی تو ہو

غم شبیر

(حکیم نادر حسین شاہ زنجانی)

جادۂ نور و منزل عرفاں چلا گیا
 آئین مصطفیٰ کا نگہیاں چلا گیا
 محمود کے چین سے نسیم سحر گئی
 لالہ طراز بزم گلستاں چلا گیا
 اس بزم میں تھا قائد اعظم کا ہم نشین
 یارب کہاں وہ مرد مسلمان چلا گیا
 تربت پہ اس کے رحمت رب قدیر ہے
 حلقہ بگوشش خواجہ گہیاں چلا گیا

اے! شیر

(شریف فاروق)

ناموسِ مصطفیٰ کا نگہبان چل بسا!
 سرمایہ دارِ حاصل و ترانِ چل بسا!
 سرِ پٹی ہے دیکھ وہ ملت کی تیرگی
 ہم بے کسوں کا مایہ عرفان چل بسا
 تاریکیوں کا دور ہے غمناک ہے فضا
 ملت کا درد مند نگہبان چل بسا
 شعلہ بھڑک اٹھا مرے قلب و جگر میں آج
 وہ پیکرِ جلیل و حُدی خوان چل بسا
 تاکا ہے آج موت نے کیوں مرا گھر حضو
 وہ شیخِ دین و صاحبِ ایمان چل بسا

وفاتِ امامِ ملتؒ

❖ ❖ ❖

د صوفی شیدا کاشمیریؒ

امیرِ قوم و شیر احمد عاملِ مستر آں
فردِ غِمت بیضا، چراغِ محفلِ عرفاں

رموزِ دیں کا ماہر، عزم و استقلال کا پیکر
جو پاکستان میں تھا عالمانِ دین کا سلطان
منور جس کے فیضِ علم سے تھی شمعِ ایمانی!
گنہ کارانِ ملت میں تھا بیشک صاحبِ مہیاں

وہ آغوشِ اجل میں سو رہے وائے ناکامی
غلامِ خواجہ شرب، قدیمِ قومِ پاکستان
ذہانت میں فطانتیں بصیرت میں لیاقت میں
نہ ہم سراسر اس کا پسیدہ کر سکے گی گردنِ درواں

ہے قانونِ الہی گرچہ کل من علیہا فان
فنا ہوتا نہیں لیکن نشانِ بندہٴ نبواں

علامة العصر مولانا شبیر احمد صاعثمانی رحمہ اللہ کی یادیں

از جناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری (نور اللہ مرقدہ)
(سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اہمیل (دبانی جامعہ العلوم الاسلامیہ، کراچی)
الذہان بنوری شہ

ہجری فاضل رفیق مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نہ صرف یہ کہ
حضرت علامہ مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں بلکہ سالہا سال تک
انہیں مرحوم کی معیت و رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے ان دنوں
آپ ہی مرحوم کی جگہ جامعہ اہمیل کے شیخ الحدیث صہیں

(مذہب)

یا عین جودی بعقد الدم کالدہ
جودی بد مع فلا تبق ولا تذہ
جودی بد مع غنیر ہا مرہطل
ینزری بمنن ہفتی من صیب المطہ
جودی بد مع شبجی ہا شد قلق
جودی بفتح شئون غیر منخ

أخرى العيون بان تدرى مدامعها
 عين بكت خطبها من غير مصطب
 انعى اليك اماماً عالمًا فطنًا
 شيخاً كبيراً جليل القدر والفكر
 انعى اليك وحيد الدهر عالمه
 بحرًا محيطًا مليئًا القعر بالدر
 شبير احمد شيخ القوم قدوتهم
 دعاه رب كريم واسم القدوس
 لبنا الاله اكريمًا اذ دعاه مُنْعَى
 ضيفًا من يلا غريبًا راح في سفر
 محدث بارع مفسر سند
 حبر كبير دقيق البحث والفكر
 علامة ذكرت فهامة لست
 روض انيق جميل الثور والزهى
 محقق العصر في علمه وفي حكمه
 مُحْكَمُ الدهر في صعب وفي حصر
 في قلبه علم قس أن وحكمته
 يبدى معارفه في كل محتضر
 كم من مشاكل علم غاص لجتها
 وحلها بيد دقيق الفكر غير مقتصر
 كم من دقائق بحث قام يكشفها
 كم من حقائق ابدت رقة النظر

اذا ارتقى في اعمال الرى لاح له
 ما في الغيوب هنا من كل مستقر
 تريك نور الذكاء سياء غمرته
 اذا ابتلم في مستصعب الخبر
 مفكر طالما اشجيت بدائع
 اولى النهى ببديع الرأى كالزهر
 مدبر طالما اذهت محاسنه
 في كل معترك من كل مستبحر
 حلم وقار انارة تزيينه
 خطابته ، منطق كاللؤلؤ النثر
 غور وفكر فراصة وحليته
 خطابه في الندى عقد من الدرر
 اصمحت لخطبته الالباب حائرة
 ترى سكارى رحيق النطق من سكر
 يهوج موج الكرم البحر ملتطما
 اذا قام حبرا خطيبا ناشرا المحبر
 اضحت عبارته من حسن عارضة
 تجلو الغياهب والاهام كالقمر
 بالفضل متد بالنبل ما تدم
 بالصدق معتقد في كل مشتجب
 بالعلم مدثر بالفهم متذكر
 بالحزم مشتمل في كل مفتصر

حبل الظلام بنور ساق منظره
 بفتح ملهمه في خدمة الاثر
 فاحت بلاد بعرف من فوائده
 جاءت كدس يتيد غالي الدرهم
 تجلو غيا هب ذي زيغ اذا قرأت
 بحسن فكر وطبع صافي الكدس
 حازل المفاخر والعلياء من تديا
 بتوب عن رفيع طيب عطي
 له المفاخر في الاعيان ناطقة
 له الماش في دهور في نض
 له البدائع في الافكار بادية
 له السرائع تترى عند ذي النظر
 سل ارض هند فستد من مفاخر
 جاءتك ناطقة من كل مفتخر
 سل دولة في بسط السند قائمة
 تنبيك دستور بالدين فاعتبر
 هو المشم في تائيد مقصده
 حتى تاكد منه العقد باليص
 خطب السم على الاسلام حين قضى
 نجبا وامر الوري لم يقف من وطى
 فالقلب في عمده والروح في كمد
 والنفس في كبد والعين في همس

هذا الذي ملأ الأفاق سمعته
 درسا وتأليف كتب خير مدخر
 ترثيه جامعة تبكيه عاصمة
 جليدة كمدًا في صيب العير
 ترثيه اقلام علم ثم حجرة
 مدارس كتب مكاتب النابر
 يرثيه منبرهم ويبيكيه جامعهم
 ترثيه حفلةهم في البدو والحضر
 يا قلب مه هذه دنيا ونعمتها
 تقضى سرى عا وقد جاءتك بالعير
 يبقى الإله ولا يبقى بربيته
 فاصبر بصبر جميل وأرض بالقدح
 فكلحى من الدنيا مفارقها
 وكل جاء غريب جاء للسفر
 يا رب انزل عليه صوب غارية
 وطفا تسقى شراه نائض الدرس
 وارفعه عندك في الفردوس منزلة
 يا وى إلى كف في غافية الحضر
 وطفا وديمتك المدرار فائضة
 ترجى لمحل من الغبراء مفتقى
 ثم الصلوة على خير الورى أبدا
 من جاء بالنور في الظلماء للبشر

شیخ الاسلام کی وفات حسرتِ آیات

حُزْنِ مُلَالِ کا اظہار

زمیندار (اخبار) کے اپنے نامہ نگار سے

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی رحلت کی خبر نے دنیا اسلام کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ شام کو میں نے جب شہر کا چکر لگایا تو ہر چہرہ کو غم کی تصویر میں پایا۔ میری حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی جب ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں لوگوں کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ وہ یہ کہ اب اسلامی تعلیمات کمیٹی کو قرآن کے رموز کون سمجھائے گا۔

(زمیندار، ۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء)

آہ! شیخ الاسلام

(حضرت مولانا ظفر علی خان کے قلم سے)

ایک زمانہ تھا جب خواجہ شیرازی نے منرایا
مقاہر

حسن زبصرہ بلال از حبش سہیل از شام
 ز خاک مگر ابو جہل اس چہ بوالعجبی ست ؟
 دنیا سمجھتی تھی کہ خواجہ شہیراز کے حیرت میں ڈوبے ہوئے قول
 کا اطلاق حسن ، بلال اور سہیل کی مدح اور ابو جہل کی مذمت ہی تک
 محدود رہے گا لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم علیہ الرحمہ
 کی درس گاہ سے بھی ایسے صاحب نفیلت اٹھیں گے جن کے متعلق علامہ
 اقبال مرحوم کو کہنا پڑے گا کہ

عجب ہنوز نہ داند رموز دیں و نہ
 زد یو بند حسین احمد اس چہ بوالعجبی ست
 سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
 چہ پنجبر ز مقام محمد عربی ست

... واقعات نے بتایا کہ دیوبند سے ایسے علمائے
 کرام بھی جلوہ گر ہوئے ہیں جو مولانا محمد قاسم کی تعلیم و حریت کے صحیح معنی
 میں علمبردار تھے ، ان علمائے حق میں سے حضرت شیخ الحدیث مولانا
 محمد انور شاہ مرحوم اور امام المفسرین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی
 خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں

تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان کے جلیل القدر علماء میں
 سے صرف مولانا شبیر احمد عثمانی تھے جو پاکستان کی تائید و حمایت
 کرتے رہے جب پاکستان قائم ہوا تو مولانا کراچی تشریف لے آئے اور
 پاکستان کا نظام اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے کوشش فرماتے
 رہے ، میں مرحوم کا صرف اس لئے معترف نہیں کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا کھانا

پینا کتاب وسنت کے مطابق تھا میں اس لئے بھی مرحوم کا مداح ہوں کہ وہ ان چند علمائے کرام میں سے تھے جو کتاب اللہ کے حقائق و معارف پر بالغانہ نظر رکھتے تھے جنہیں شاہ عبدالعزیز شاہ ولی اللہ اور مولانا محمود الحسن کے بعد قرآن دانی و قرآن فہمی کی پوری صلاحیت تھی، جن لوگوں نے مرحوم کی تقریریں سنی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا کے ایک ایک لفظ میں علم و عرفان کا سمندر موجزن ہوتا تھا اور ایک ایک بات میں دنیا بھر کے حقائق پوشیدہ ہوتے تھے، میرے وطن کی قیمتی ہے کہ وہ ایسے عالم باعمل سے محروم ہو گیا جس کی فکر و نظر نے پاکستان کے مادی خاکے میں شرعی نظام کا رنگ بھرنا شروع کیا تھا۔ اور جو ملک اہل ملک کو اسلام کی سیزدہ صد سالہ روایات سے منور کرنا چاہتا تھا۔ جو اسلام کے لئے جینا چاہتا تھا اور اسلام ہی کے لئے مرا۔ اللہ تعالیٰ اس بزرگ ملت کو جو ابد رحمت میں جگہ دے اور ملت کو اس کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(زمیندار، ۱۶، دسمبر ۱۹۴۹ء، ۲۴، صفر ۱۳۶۹ھ بروز جمعہ)



اخبار احسان کے ایڈیٹر ابو سعید زیدی اپنے مقالہ اداریہ میں لکھتے ہیں:-

صَبْرٌ اَزْمَارُ حُلَّتْ !

کل شام یکایک کراچی سے یہ صبر آزما خبر موصول ہوئی ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی رہبرائے عالم جاودانی ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ! یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے۔ کو بچا کرنے کے لئے آیا ہے۔

کسی کا پیدا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ایک دن اسے موت سے
ہمکنار ہونا ہے۔ آدمی ہر مصیبت سے بچنے کی آس باندھ سکتا ہے لیکن
موت کے جنگل سے بچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے

ہر آنکہ زاد ، بنا چار بایش نوشید

ز جام دہر مے گلشن علیہا فان

اس لئے مولانا شبیر احمد عثمانی کا سانحہ ارتحال اس کا گواہ عالم کی سنت
جاریہ کی رُو سے تو کوئی ایسا حادثہ نہیں جس پر حیرت و استعجاب کا اظہار
کیا جائے۔ لیکن مولانا کی ذات گرامی کو پاکستان کے ساتھ جو وابستگی تھی۔
اور جن کی شخصیت قائد اعظم کی رحلت کے بعد ایک واحد مرکزی نقطے کے مانند
تھی۔ ان کا یکایک ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا ایک ایسا صبر آزا سانحہ ہے
جس سے چشم ماتم گسار خلا جانے کب تک اشک بار رہے گی۔ علمائے کرام کی
صف میں مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی علمی فضیلت اور کردار کی بلندی دونوں
اعتبار سے اتنا بلند مقام رکھتے تھے کہ پاکستان تو درکنار دنیا بھر اسلام
میں بھی آپ کے پائے کی ہستی کوئی نہ تھی۔ قائد اعظم کی رحلت کے بعد
پاکستان کے لئے مولانا محترم جیسی ہستی ایک بہت بڑا ستون تھی جس پر عوام
و خواص اعتماد کر سکتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی میں اسلامی نکات کی توضیح و تشریح
کرنے اور آئین و قوانین کی دفعات کو اسلامی احکام کے سانچے میں
ڈھالنے کے معاملے میں یہیں مولانا نے محترم کی ستودہ صفات پر زبردست
اعتماد تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ جب تک یہ برگزیدہ شخصیت موجود رہے۔ ہمیں
یقین رکھنا چاہئے کہ دستور کی عملی شکل اسلامی احکام کے عین مطابق ہوگی۔
لیکن دئے ناکامی کہ آپ کا سایہ عین اس وقت ہمارے سر سے اٹھالیا گیا۔

جبکہ ہیں اس سائے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

مولانا نے محترم ذہانت و فطانت اور علمی بصیرت و تبحر کے اعتبار سے علمائے کرام میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس وقت متحدہ ہندوستان کے ظلمت کدے میں کفر و الحاد کی تاریکیاں برطانوی اقتدار کے سائے میں گردش پاری تھیں۔ مولانا نے عثمانی کی ذات گرامی ہی وہ واحد ذات تھی جس نے عقل و دانش کی روشنی میں اسلامی احکام کی مصلحتیں آشکار کیں۔ اور متحدہ ہندوستان کے طول و عرض سے متفقہ طور پر ”مشکلم اسلام“ کا لقب حاصل فرمایا۔ اس کے علاوہ علماء کی صف آپ اُن چند اکابر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ جو وقت کی زبان میں سلاست و فصاحت کے ساتھ عام فہم طریقے پر موثر انداز سے اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے تھے۔ یہی خوبی آپ کی تقریر میں بھی تھی۔ پر جوش قسم کا خطیب آپ کو یقیناً نہیں کہا جاسکتا۔ اور اس مقصد کے لئے آپ نے کبھی کوئی جدوجہد بھی نہیں کی۔ اس کے برعکس آپ کا اندازِ گفتار ہمیشہ منطقی ہوتا تھا۔ جو دل سے زیادہ دماغ کو حرکت میں لاتا تھا۔ جن لوگوں کو آپ کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ نہایت سلجھے ہوئے اور انتہائی شگفتہ انداز سے بولتے تھے۔ دورانِ تقریر میں مناسب مواقع پر مناسب اشعار بھی چسپاں کرتے جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود طرزِ کلام کی عالمانہ ثقاہت میں مطلق کوئی فرق نہ آتا تھا۔ آپ کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ سننے والے جو کچھ سنیں اس پر صرف جذباتی اعتبار ہی سے ایمان نہ لائیں۔ بلکہ عقل و دانش کی روشنی میں اس کو صحیح سمجھیں۔ آپ کی یہ خوبیاں دراصل آپ کے سلجھے ہوئے دماغ کا کرشمہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ آپ نے شروع میں سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کئے رکھی۔ اور

صرف علوم کی وادی میں گلگشت کرتے رہے۔ لیکن چند سال ہوئے جب
کانگریس کے نام پر ہندو امپریلزم کے بڑھتے ہوئے نکتے اور۔۔۔۔۔

سیلاب کو

روکنے کی خاطر مسلم لیگ کے ہنوا بنے۔ تو عوامی اعتماد و ہردلعزیزی کی جس راہ
کو طے کرنے میں دوسرے لیڈروں کو سالہا سال صحرا نوروی کرنی پڑی۔

اُسے آپ نے چند مفتوں میں طے فرمایا۔ قائد اعظم مرحوم و مغفور پہلی ملاقات

ہی میں آپ سے اتنے متاثر ہوئے کہ غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علمائے کرام

میں سے کسی نے قائد اعظم کے قلب کو اتنا تسخیر نہیں کیا۔ جتنا مولانا عثمانی

نے کیا۔ قائد اعظم کی رحلت کے بعد آپ کے جانشین افراد کا بھی یہی حال

تھا۔ اور آج اس واقعے سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ علماء میں مولانا کی

ذات گرامی ہی وہ واحد ذات تھی جسے مرکزی کابینہ کے ارکان پر زبردست

اثر و رسوخ حاصل تھا۔ آپ موافق منش بزرگ تھے۔ اور اقتدار و اختیار

کے ماحول سے بچ کر چلتے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو آج آپ کی حیثیت

کابینہ حکومت کے ایک ذمہ دار رکن کی ہوتی۔ دستور ساز اسمبلی کی کنیت

کو بھی آپ نے بادلِ ناخواسۂ قبول کر رکھا تھا۔ ورنہ حقیقتاً آپ ان

رسمیات سے نہایت بلند تھے چنانچہ آپ کبھی بار اس اسمبلی سے استعفیٰ دینے

کا خیال ظاہر کیا۔ مگر وزیر اعظم کے اتہائی اصرار کی بنا پر خاموش ہو گئے۔

لیکن مولانا عثمانی کی خوبیاں ہم کہاں تک گنائیں گے۔۔۔ سفینہ

چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے۔۔۔ وائے افسوس کہ اب ہمارے

لئے صرف ان کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ اور وہ متحرک پیکر لطیف ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا ہے۔ جو قیام پاکستان کے بعد ہمارے لئے ایک انمول جوہر تھا۔ اور جس نقصان کی تلافی خدا جانے ہو یا نہ ہو اور ہو تو کب تک ہو! ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر ہوتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چین میں دیدہ ور پیدا



پاکستان کے طول و عرض میں شیخ الاسلام کا ماتم

جہلم

(۱۸ دسمبر) ۱۷- دسمبر کو ٹمبر ایسوسی ایشن جہلم کی ایک میٹنگ زیر صدارت حاجی محمد عمر صاحب سوڈا اگرچہ منعقد ہوا جس میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی وفات حسرت آیات پرافسوس کا اظہار کیا گیا اور ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ (محمد احسان بٹ)

وزیر آباد

(ڈاک سے) ۱۲ دسمبر کو مہاجر لیگ وزیر آباد کے زیر اہتمام مسلمانان وزیر آباد کا ایک عظیم الشان جلسہ زیر صدارت مولوی محمد رمضان صاحب خطیب جامع مسجد بازار کلاں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل تشرار واد پاس کی گئیں۔

یہ جلسہ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات حسرت آیات کو تمام عالم اسلام کا ایک المناک حادثہ تصور

کرتا ہے۔ اور مسلمانان پاکستان سے درخواست کرتا ہے۔
 کہ حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ کو عملی جامہ پہنانے کی سرگرم کوشش
 کریں۔ جو قانون شریعت قائم کرنے کے سلسلہ میں مرحوم انجمن
 دیتے ہے۔

علاوہ ازیں حسب ذیل مقامات پر مختلف انجمنوں اوداداروں کی طرف
 سے ماتمی جلسے منعقد کر کے تعزیت کی قراردادیں پاس کی گئیں، ایصال ثواب
 کے لئے قرآن خوانی کی گئی۔ کاروبار بند رکھے گئے اور مساجد میں مغفرت
 کی دعائیں کی گئیں :

اسلامیہ ہائی سکول منٹگری (ساہیوال) کریا نہ چئیس ایسوسی ایشن
 سرگودھا۔ وکیشنل ٹریننگ سنٹر سیالکوٹ۔ انجمن اصلاح المسلمین پٹنہ
 بھٹیاں ضلع گوجرانوالہ۔ بلوکی ضلع لاہور۔ گوندل۔ دارالعلوم حقانیہ و
 مدرسہ اسلامیہ تعلیم القرآن اکوڑہ خٹک۔ مسلم نیشنل گارڈ لاہور چھائی
 مغل پور (لاہور)۔ سٹی مسلم لیگ پشاور۔ انجمن اتحاد و ترقی رشی نگر لاہور۔
 کوئٹہ (بلوچستان)۔ نیشنل گارڈ بھکر ضلع میانوالی۔ انجمن اسلامیہ لاہور چھائی
 پیس گڈز ایسوسی ایشن پشاور۔ حلقہ ادب اسلام کراچی۔ مومن کانفرنس خلاہ
 ضلع جہلم۔ چیمبر آف کامرس رحیم یار خان ریاست بہاولپور۔ ضلع جمعیت الانصاف
 ملتان۔ جمعیت العلماء سے اسلام فورٹ سنڈین (بلوچستان)۔ جامعہ محمدی
 شریف ضلع جہنگ۔ مدرسہ عربیہ اسلامیہ منڈی بورنیوالہ۔ انجمن مدرسہ
 اسلامیہ حلیمیہ چک منٹگری۔ اسلامیہ آئین ساز مجلس العلماء پرانی
 انارکلی لاہور۔ ڈیرہ اسماعیل خاں۔ گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا۔ مجلس
 اطباء سے پاکستان لاہور۔ ٹیچر ایسوسی ایشن اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی۔

ہول سیل کلاتھ مارکیٹ سوسائٹی لاہور۔ بزم توحید میرپور خاص (سندھ)
 مسلم پنجایت و کشمیری جیس آباد (سندھ) سٹی مسلم لیگ مظفر گڑھ۔ ضلع مسلم نیشنل
 گارڈ مردان۔ انجمن ضیاء الاسلام فیض باغ لاہور۔ شیعہ اثنا عشری جماعت
 پشاور۔ مدرسہ عربیہ نعمانیہ و جمعیت المسلمین کھرڑ پکا ضلع ملتان۔ شجاع آباد،
 خاکوانی ضلع اٹک۔ ضلع دسٹی مسلم لیگ شیخوپورہ۔ حافظہ آباد ضلع گوجرانوالہ۔
 موضع سفرونہ، موضع گیانکلی، موضع چارباغ، موضع نواکلی، موضع شیخ جاز
 وغیرہ تحصیل صوابی ضلع مردان۔ مدرسہ عربیہ حنفیہ پٹل روڈ لاہور۔ مرنگ لاہور۔
 مسیحی ہمدرد سوسائٹی لاہور۔ قومی رضا کاران لاہور۔ سٹی لیگ کونسل فینک
 ورکرز ایسوسی ایشن جہلم۔ انجمن اساتذہ ایم۔ بی ہائی سکول منڈی بہاؤ الدین
 ضلع گجرات۔ نظامی آرٹ سوسائٹی بھکر ضلع میانوالی۔ مہاجر لیگ راولپنڈی۔
 آرٹھی ایسوسی ایشن منڈی بہاؤ الدین ضلع گجرات۔ سٹی مسلم لیگ گجرات۔
 انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ ضلع سیالکوٹ۔ چوہاسیدن شاہ ضلع جہلم۔
 مسلم لیگ رینالہ خود ضلع منٹگمری۔ جماعت اسلامی ضلع مظفر گڑھ۔ مسلم لیگ
 رنگ پور بگور تحصیل خوشاب۔ مسلم لیگ پٹنڈی گھیب۔ جمعیت العلماء پاکستان
 سلاوالی ضلع سرگودھا۔ گوگڑاں ضلع ملتان۔ چک ۶۱۲ ضلع منٹگمری۔
 پوڑ میانہ ضلع اٹک۔ بہاولنگر ریاست بہاولپور۔ پراونشل مسلم لیگ
 پشاور۔ پاکستان جمل طبی ایسوسی ایشن راولپنڈی۔ ماڈل ٹاؤن پارہ چنار۔
 انجمن اسلامیہ سیالکوٹ بالا کوٹ۔ حلقہ مسلم لیگ پشاور۔ جویلیاں ضلع ہزارہ۔
 سنٹر کوآپریٹو بینک لائلپور۔ مارکیٹ کلبیٹی چوہڑکانہ منڈی چیچا وطنی برج والا۔
 جماعت اسلامی رحیم یار خان ریاست بہاولپور۔ گڈ مرچ ایسوسی ایشن پشاور
 لالہ موسیٰ پرائمری سکول شاہ پور۔ انجمن مہاجرین الیائی تحصیل قصور ضلع لاہور۔

سرمدی قیم خانہ مردان۔ فرینڈز کلب ڈیرہ غازیخان۔ انجمن فروغ اردو نوشہرہ
ہاکرز یونین راولپنڈی۔ انجمن خدام المجاہدین راولپنڈی۔ انجمن انصار و مہاجرین
جمعیت نوجوانان اسلام، ڈسٹرکٹ انجمن مہاجرین، مجلس منتظمہ جامع مسجد
راولپنڈی۔

دارالعلوم دیوبند پر شیخ الاسلام علامہ عثمانی کے حادثہ اترجال کا اثر
دارالعلوم کی فضا رنج و غم میں ڈوب گئی، تمام دفاتر بند کر دیئے گئے
شیخ الاسلام مولانا مدنی اور شیخ الجامعہ مولانا قاری محمد طیب جہا کی تقریریں
مسلمانان ہند و پاکستان عموماً اور متوسلین دارالعلوم دیوبند کے حلقوں
میں خصوصاً یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی گئی ہے کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء یوم شنبہ
کو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی نور اللہ مرقدہ نے داعی اجل کو لبیک کہا
اور ہمیں داغ مفارقت دیکر رہ گئے عالم جاودانی ہو گئے۔
إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

علامہ مرحوم بغداد الحدید (بہا و لہود) میں وزیر تعلیمات ریاست کی
دعوت پر تشریف لائے اور بغرض تبدیل آب و ہوا کچھ قیام کے ارادے
سے تشریف لائے۔ مگر قیام کو تین ہی دن گزرے تھے کہ وقت مقدر آ پہنچا۔

مولانا مدنی کی تقریر

دارالعلوم دیوبند میں ۱۳ دسمبر کی شب میں یہ خبر موصول ہوتے ہی غم و

اندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ علی الصباح نماز فجر کے بعد مسجد دارالعلوم حضرت مولانا کے سانحہ ارتحال کا تذکرہ کر کے ختم کلمہ شریف، ختم قرآن مجید کا اعلان کیا۔ جس میں تمام اساتذہ و طلبہ اور کارکنان دارالعلوم شریک ہوئے۔ بعد ختم مہتمم کی درخواست پر حضرت مولانا مدنی نے چند کلمات مجمع کے سامنے علامہ مرحوم کی نسبت ارشاد فرمائے جس میں مولانا کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے مندرایا کہ حضرت مرحوم کی شخصیت بے مثال تھی۔ علم و فضل میں آپ کا پایہ بلند تھا اور ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے۔ ہم میں سیاسی اختلافات ضرور پیدا ہوئے مگر وہ اپنی جگہ ہیں۔ مولانا مرحوم کے منتخب علم و فضل اور بلند پایہ شخصیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یقیناً ان کی یہ دائمی مفاتح ہم سب کے لئے باعثِ صدر رنج و ملال ہے۔ مولانا مرحوم نے دارالعلوم میں تعلیم پائی۔ حضرت شیخ الہند اور بہت سے اکابر دارالعلوم سے انہیں نسبتی تعلق تھا۔ اور علمی طور پر ان کی شخصیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تقریر و تحریر کا خداداد ملکہ مولانا مرحوم کا حصہ تھا۔ اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔

اس کے بعد طویل وقفہ تک دعاءِ مغفرت کی گئی اور دارالعلوم کو قرآن خوانی اور ختم ایصالِ ثواب کے سلسلہ میں ایک دن کی تعطیل دی گئی۔ دفاتر بند کر دیئے گئے اور اس اعلان پر مجلس ختم کی گئی کہ بعد نظر دوسری مجلس قرآن خوانی کی منعقد ہوگی۔ بعد نظر پھر قرآن خوانی ہوئی اور کلمہ طیبہ کا ختم پڑھا گیا۔

مولانا محمد طیب صاحب کی تقریر

احقر مہتمم نے ایک مفصل تقریر کی جس میں علامہ مرحوم کی علمی، دینی اور

سیاسی خدمات اور خصوصیات پر روشنی ڈالی اور بتلایا کہ جماعت علماء میں حضرت مرحوم نہ صرف ایک بہترین عالم فاضل ہی تھے بلکہ ایک صاحب الرائے مفکر بھی تھے۔ آپ کا فہم و فراست اور فقہ نفس بے نظیر تھا۔ آپ اس علمی ذوق کے امین تھے جو اکابر دارالعلوم سے بطور وراثت آپ کو ملا تھا حضرت قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند کے مخصوص علوم پر آپ کی گہری نظر تھی اور درسوں میں ان کے علوم کی بہترین تفہیم کے ساتھ تقریر فرماتے تھے۔ علوم میں نظر نہایت گہری اور عمیق تھی۔ علمی لائٹوں میں آپ کا درس و تدریس اور مختلف ملازمتیں، مدرسہ فقہوری دہلی، دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ہزار باطلہ کو یکے بعد دیگرے افادہ ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ تصنیفی لائینوں میں آپ کی متعدد تصانیف اور قرآن حکیم کی تفسیر بصورت فوائد اور مسلم شریف کی عربی شرح یادگار زمانہ رہیں گی۔ جو پوری دنیا سے اسلام میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے۔ سیاسی لائن میں آپ نے تقسیم ملک سے پہلے اپنی مدبرانہ سیاسی قابلیت سے ریاست حیدرآباد کو ایسے وقت میں بعض مہلک مذہبی فتنوں سے بچانے کی سعی جمیل فرمائی۔ جبکہ اس کے معاملات بہت زیادہ خطرہ میں تھے۔ آزادی ملک کی جدوجہد میں آپ نے کافی حصہ لیا اور آپ کی فصیح و بلیغ تقریروں سے لاکھوں باشندگان وطن آزادی وطن کی حقیقت سے آگاہ ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان کو اپنا مستقل وطن بنالیا اور کراچی میں مقیم رہ کر پاکستان کی بہت سی دینی و ملی خدمات انجام دیں۔ پاکستان کے ارباب حکومت پر آپ کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا اور وہاں کی گورنمنٹ کی ہائی کمانڈ میں آپ کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی۔

آپ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن اور مذہبی قانون کمیٹی کے صدر تھے۔ بلاشبہ وہاں کی حکومت نے آپ کے ساتھ حیات اور ممات میں وہ معاملہ کیا جو ایک قدر شناس حکومت کو اپنے ایک مخلص خیر خواہ اور ملک کے ایک ممتاز عالم دین دین کے ساتھ کرنا چاہئے۔

علامہ کی ان چند در چند فضیلتوں اور پیران مخصوص نسبتوں سے کہ اولاً آپ دارالعلوم کے مایہ ناز فرزند تھے پھر اس کے قابل قدر مدرس بنے اور آخر کار ادارہ کے صدر مہتمم ہوئے ان کے حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم بطور ادائے حق نہیں بلکہ بطور ادائے فرض ان کے لئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کریں اور نہ صرف آج ہی بلکہ آئندہ بھی برابر کرتے رہیں۔

طلباء اور علماء کے بھرے مجمع نے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کیلئے ہاتھ اٹھا دیے اور کافی وقت تک لوگ خضوع و خشوع کے ساتھ دعا عرض فرما رہے تھے۔

مہتمم دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کی جانب سے تعزیت کے تار مولانا کے اہلبیت اور حکومت پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیراعظم اور ایسی سی ایسڈ پریس پاکستان کو روانہ کئے گئے جن کی عبارت حسب ذیل ہے:

گورنر جنرل اور وزیراعظم پاکستان کے نام تار

• علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلامی کا ایک شدید حادثہ ہے۔ میں خود اور تمام جماعت دارالعلوم آپ سب کے غم میں شریک ہیں اور تعزیت پیش کرتے ہیں۔ دارالعلوم کو تعطیل دی گئی اور ختم قرآن کرایا گیا۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

راولپنڈی میں علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا سوگ

باشندگان راولپنڈی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی موت پر تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔

مقامی جناح گریلز کالج میں بھی ایک میٹنگ ہوئی جس میں مس عوفان زبیری نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ اور پاکستان کے شیخ الاسلام کے انتقال پر تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔ (زمیندار)

علامہ عثمانی مرحوم کے غم میں گوجرانوالہ میں مکمل ہڑتال

گوجرانوالہ ۱۵ دسمبر۔ ضیاء الحق صدر سٹی مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل اخباری تار زمیندار کو ارسال کیا ہے :-

شیخ الاسلام مولانا عثمانی کے المناک حادثہ ارتحال ... کی ہولناک ... خبروں نے شہر گوجرانوالہ کو سوگوار بنا دیا۔ شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ سٹی مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں ... انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ قراردادیں اعلان کیا گیا کہ ان حوادث سے ساری اسلامی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے (زمیندار ۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء)

آہ ہادی روحانی

مرکز تعلیم امر وہہ کی عمارت میں سلسلہ انتقال پرملاں جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت حافظ محمد اسرائیل صاحب منعقد ہوا جس میں جمیع اساتذہ اور طلباء و چند معزز حضرات نے شرکت کی،

ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی انہک وفات حسرت آیات پر قلبی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا اور اسے اسلامی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان تصور کیا گیا۔

زیر نگرانی حافظ پیر جلیل صاحب نے قرآن خوانی اور فاتحہ کے بعد عام تعطیل کا اعلان کیا گیا۔ (نامہ نگار)

مدرسہ حسین بخش دہلی میں جلسہ تعزیت

مدرسہ حسین بخش مورخہ ۲۴ صفر المظفر بروز پنجشنبہ صبح سے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی ہوئی جس میں طلبہ اور اساتذہ مدرسہ اور محلہ کے دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔

بعد ختم کلام مجید جلسہ ہوا جس میں حضرت مولانا محمد مظاہر امام صاحب مدرس مدرسہ نے حضرت علامہ کے سانحہ ارتحال پر طال کو علمی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان بتایا اور آپ کی علمی اور قومی خدمات کو مختصراً مگر جامع الفاظ میں نہایت ہی رقت انگیز لہجہ میں بیان فرمایا۔ بعدہ حضرت مولانا محمد اویس صاحب نے علامہ کے خصوصی حالات جس کا مولانا کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بہت ہی پر درد طور پر بیان فرمانے لگے۔ اور رقت اس درجہ طاری ہوئی کہ کچھ زیادہ بیان نہ فرما سکے۔ اور روتے ہوئے بیٹھ گئے۔

جلسہ بعد دعا کے ختم ہوا اور حضرت مدرسہ نے بقیہ اوقات کے لئے اسی غم میں مدرسہ کے لئے تعطیل کا اعلان فرمایا۔

مولانا عثمانی کے لئے ایصال ثواب

۱۴ دسمبر کو بازار جامع مسجد نواب دو جانہ میا محل میں ۹ بجے شب کو بعد

ترجمہ قرآن شریف علاقہ کے مسلمانوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کے لئے ایصالِ ثواب کیا اور مرحوم کے لئے رفع درجات کی دعا کی۔

ایصالِ ثواب سے قبل مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی نے مولانا مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالی۔

(جمعیتہ دہلی مورخہ، دسمبر ۱۹۴۹ء)



لاہور میں صَفِ ماتم

(زمیندار کے نامہ نگار خصوصی سے)

آج حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی رحلت کی وجہ سے لاہور میں غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بازار سنان، دکانیں بند، کاروباری اداروں پر اداسی، کالجوں اور اسکولوں کی رونق مفقود، عدالتیں اور دفاتر اور سنیا مگر کزن و ملاں بنے ہوئے تھے۔

ایک دکاندار اپنی دکان کے پڑے پر گردن جھکائے بیٹھا تھا میں نے پوچھا بھائی دکان کیوں بند ہے؟ بولا، مولانا صاحب جنہوں نے صوبہ سرحد میں الیکشن جیتا تھا کل گزر گئے۔

لاہور میں شیخ الاسلام کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ شام کو اسلامیہ کالج کے میدان میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں مسلم لیگی رہنماؤں نے تقریریں کیں اور تعزیتی قراردادیں منظور کیں۔

متحدہ بنگال کے آخری وزیر اعظم کا بیان

غیر منقسم بنگال کے آخری وزیر اعظم مسٹر حسین شہید سہروردی نے ایک بیان میں شیخ الاسلام کی وفات پر اظہار رنج و الم کرتے ہوئے کہا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی رحلت ایک ایسا نقصان ہے جس کا الفاظ میں اظہار ممکن نہیں۔ مولانا کی شخصیت زہد، تقویٰ، علمی فضیلت اور سیاسی بصیرت کا اجتماع تھی۔ وہ علوم دینیہ اور قانون شرعیہ کے متبحر عالم تھے۔ انہوں نے اسلامیان ہند کی جس انداز سے قیادت اور رہنمائی کی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خدائے تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

(روزنامہ زمیندار، ۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء)

لاہور میں تعزیتی جلسہ

لاہور ۱۵ دسمبر۔ معلوم ہوا ہے کہ سول مسلم لیگ کے زیر اہتمام بعد از نماز جمعہ مسجد نیلہ گنبد میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور جرنیلوں کے انتقال پر تعزیتی جلسہ منعقد ہوگا جس میں زعمائے ملت تقاریر کریں گے۔

مجلس طلباء علوم مشرقیہ دارالعلوم چلہ کی قرارداد تعزیت

امروہہ، ۱۴ دسمبر۔ دارالعلوم چلہ امروہہ میں مجلس طلباء علوم مشرقیہ الہ آباد بورڈ کے اہتمام سے ایک جلسہ عام پڑ پڑت جناب مولانا حکیم عبدالودود صاحب منعقد ہوا جس میں حضرت علامہ عثمانی کے لئے دعائے مغفرت کی گئی، اور

قرارداد ذیل بہ اتفاق آراء منظور کی گئی :

” مجلس طلباء کا یہ جلسہ شیخ الاسلام رئیس المفسرین
حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے انتقال پر ملال کو دنیا سے علم و
ادب کا نقصان عظیم اور علوم مشرقیہ کو ایک مڑتی سے محرومی
تصور کرتا ہے۔ نیز یہ جلسہ موصوف کے لئے دعائے مغفرت
اور پسماندگان کے ساتھ شرکت غم کا اظہار کرتا ہے “
(روزنامہ زمیندار لاہور)

یا رب انزل علیہ صوب غادیۃ
وطفا تسقی ثراۃ فائض الدیر
وارفعہ عندک فی الفردوس منزلة
یاوی الی کتف فی غایۃ الحض